

ماہنامہ
سچی کہانیاں
June
2017
لیٹ فارم نمبر
فن کا سلطان
فرید سلطان کھوسٹ
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں
☆......'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆......تصوف کی دنیا کا شاہکار' کاوش صدیقی کا سلسلے وار ناول 'خانقاہ'

# ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail pearlpublications@hotmail.com


بانی سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122
021-35893123

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

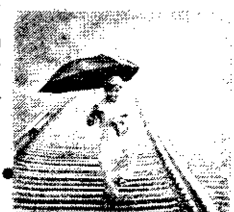
| | |
|---|---|
| MEMBER APNS CPNE | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی<br>رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز |

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی


قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 34 - شمارہ: 06 جون 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون:021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی



**زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر**

# التجا

پی آئی اے کے طیارے سے ایک بار ہیتھرو ایئرپورٹ پر ہیروئن برآمد یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، اس سے پہلے بھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن کے باعث پوری قوم کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ اب ایک بار پھر وہی بے عزتی...... ٹی وی اسکرین پر پی آئی اے کے طیارے کو ہیتھرو ایئرپورٹ پر کھڑا دیکھ کر دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ اس بار یہ خبر جھوٹی ثابت ہو جائے۔ اسپیشل فورس کے 30 اہلکاروں نے تین گھنٹے تلاشی لینے کے بعد بالآخر ہیروئن برآمد کر ہی لی۔ اہم بات یہ ہے کہ ہیروئن جس طرح چھپائی گئی تھی وہ کسی مسافر کا کام نہیں تھا، وہ کسی معمولی ملازم کا بھی کام نہیں تھا۔ اس جرم کی اگر درست طور پر انکوائری ہو تو یقیناً بڑی مچھلیاں گرفت میں آئیں گی۔

ظاہر ہے ایسا کم از کم پاکستان میں تو نہیں ہو سکتا...... گناہ گار کو سزا ملے ہمارا مزاج ہی نہیں...... جرم کی سرکوبی ہمارا شعار ہی نہیں...... جیب کترے کو پکڑتے ہیں، قومی خزانہ لوٹنے والوں کو سروں پر بٹھاتے ہیں...... بہر حال صبر کا سنگِ مرمر تو سینے پر دھر ہی لیا ہے بس ذمہ داروں سے ایک التجا ہے کہ خدارا جو دل چاہے کریں...... جس طرح پی آئی اے کو برباد کرنا ہے کریں...... جتنی جگ ہنسائی کروانی ہے، وہ بھی کروالیں مگر اتنا احسان کر دیں کہ میرے سبز ہلالی پرچم کو پی آئی اے کے جہازوں پر چسپاں کرنا چھوڑ دیں۔ یہ قوم سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے سبز ہلالی پرچم کی پامالی کا دکھ نہیں سہہ سکتی۔

منزہ سہام

# احوال

## قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

ساتھیو! کیسے ہیں آپ سب! جب یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ اپنے پہلے عشرے میں ہوگا۔ سب اس بار اس مبارک مہینے میں ایسے ہوجاؤ جیسے آدم کا پہلا پہلا قدم زمین چھو رہا ہو۔ بھول جاؤ جو پہلے کیا۔ بھول جاؤ کسی کا دل دکھایا۔ بھول جاؤ کوئی تمہارا مخالف ہے۔ بھول جاؤ تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ بھول جاؤ تم کمایا ہو۔ بھول جاؤ تم بادشہ ہو۔ بھول جاؤ تم گدا ہو۔ بس یہ یاد رکھو کہ اب کسی کا دل نہیں دکھانا ہے۔ اس بار رمضان کو سچے دل سے منانا ہے۔ اس بار سچے مسلمان بن کے دکھانا ہے۔ بس یہ یاد رکھو کہ آج کا جو دن نصیب ہوا وہی یوم حساب ہے۔ ساتھیو! کبھی دیکھا ہے آج تک کہ کسی راستے میں ریشم وکمخواب کی چادر بچھی ہے۔ کبھی راستوں میں گزرنے سے پہلے پھول پڑے دیکھے ہیں۔ کبھی اطمینان کی سانس کی ٹھنڈک محسوس کی ہے۔ اب کرو...... محسوس کرو خود کو...... انسان کے روپ میں بلکہ اپنی شان کے ساتھ...... اشرف المخلوق کے طور پر خود کو محسوس کرو...... پھر دیکھنا کس طرح ریشم وکمخواب کی تہہ رستوں پر بکھرتی چلی جائے گی۔ رمضان کا رحمتوں کا نزول خود بہ خود محسوس ہوگا۔ پیارو! دھند سے جھانک کر دیکھنے ہی میں تو مزا ہے۔ ہم سب مسافر ہیں۔ سفر ریل کی دو پٹریوں کا سا ہے۔ لیکن ہمارے سفر کا اختتام ہے۔ پٹریاں کبھی نہیں ملتیں مگر منزل تک آخر پہنچا ہی دیتی ہیں۔ رمضان مبارک۔ بس وعدہ کرو اک بار پھر کہ اس بار رمضان میں یوں صاف ستھرے، ہلکے پھلکے ہوجاؤ گے جیسے سب سے بڑے رکن اسلام کی ادائیگی کے بعد ہوجاتے ہیں۔ اب اس دعا کے ساتھ ہی احوال کا آغاز کرتے ہیں کہ اللہ ہم سب کو سچا اور کھرا بنادے۔

آپ کے خطوط سے پہلے ہڈالی' خوشاب کے اسدعلی بھٹی ہمارے بہت عزیز لکھاری ساتھی۔ گزشتہ ماہ ایک دکھ سے دوچار ہوئے۔ بھائی اسد کی پوتی زمین کا رزق ہوگئی۔ ہم بھائی اسدعلی بھٹی کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اور صبر کی دعا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گزشتہ ماہ لاہور سے ہمارے بھائی ایم سعید انور سعید نے ہماری بھابی اور بھتیجی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کی۔ ہم بھائی سعید کو اس بابرکت سعادت پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ آیئے اب احوال کی ابتداء کرتے ہیں۔

☆احوال میں یہ پہلی آمد ہے ڈی جی خان سے ہماری پیاری بہن ارم خان کی جو بڑے زمانے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''کافی ٹائم بعد ایک بار پھر احوال میں شامل ہو رہی ہوں۔ پتا نہیں کسی کو یاد بھی ہوں یا نہیں لیکن احوال کو بہت مس کرتی ہوں کیونکہ مجھے یہاں بہت عزت اور محبت حاصل ہوئی ہے۔ اللہ پاک احوال اور احوال والوں کو سدا خوش وآباد رکھے۔ کاشی بھیا اس بار میں اکیلی نہیں آئی اس بار میں اپنی بہت اچھی دوست میمونہ سجاد کو بھی ساتھ لائی ہوں۔ اسے لکھنے کا بہت شوق ہے جب اس نے مجھے بتایا تو میں نے اسے سچی کہانیاں کا مشورہ دیا۔ دیکھیں بھیا میں کتنی اچھی ہوں (ہاں! باقاعدہ حاضر ہوکر اور اچھی بن جاؤ) تو اب آتی ہوں کچھ اپنی طرف تو بھیا جی میری کچھ کہانیاں آپ کے پاس تھیں، ان کا کیا ہوا، کہیں انہیں ردی کی نوکری...... نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں اس نوکری کو اپنی کہانیاں تو کبھی ہضم نہیں ہونے

دوں گی۔ ہاں اس وقت اس بہن کو اجازت دیں انشاء اللہ اب تو آتی رہوں گی۔ خوش رہیں، سلامت رہیں، آباد رہیں۔''

✤ پیاری لڑکی! کتنے دن ہوئے ہمیں تمہاری راہ تکتے مگر تم کو اپنے اس بھائی کی یاد نہ آئی۔ کہانیاں نہیں، بس ایک کہانی ہمارے پاس ہے۔ انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

☆ سرگودھا سے ہمارے ہردلعزیز ممتاز احمد کی احوال میں آمد ہے، لکھتے ہیں۔ ''سب سے پہلے تمام پڑھنے والوں کی خدمت میں ماہ مقدس رمضان المبارک کی ڈھیروں مبارک باد۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ہم سب کو اس مبارک مہینے کا ادب و احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کی رحمت و برکات سمیٹنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔ ماہ مئی کا مختصر کہانی نمبر انتہائی خوب صورت ٹائیٹل سے مزین شمارہ 6 تاریخ کو موصول ہوا۔ کاشی بھائی آپ کو بہت بہت مبارک قبول ہو جو اتنا شاندار، زبردست اور تاریخی پرچہ پڑھنے کو دیا۔ پرچے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بہت خوب ویڈن۔ احوال کا حسب معمول کاشی کی دل موہ لینے والی باتوں سے آغاز ہوا۔ کاشی بھیا! آپ منجھے ہوئے اور ہنرمند ہیں، ماشاء اللہ آپ جو نمبر بھی شائع کرتے ہیں وہ پچھلے شمارے سے بہت بہتر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے میں شکرگزار ہوں نسیم سحر، آپی صائمہ بشیر، حسین خواجہ، نظر علی برمانی، منشی محمد عزیز مے، فیصل ندیم بھٹی، سید ملازم حسین شیرازی، حنا بشری، نفیسہ فضل اور مسز نوید ہاشمی کا جنہوں نے میری کہانیوں کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ حافظ عابد علی بھٹی! ویلکم جی۔ کیا آپ بھی سرگودھا کے رہنے والے ہیں؟ احوال کے آخر میں کاشی بھیا کی تازہ نظم ''Census2017'' بہت بہترین تھی۔ ایوارڈ نامہ شیما عبدالقیوم کا لکھا ہوا پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ سب سے پہلی کہانی ''لائف بوائے''، محافظ بن کر دکھائے بہت پسند آئی۔ اقبال بانو اور جاوید راہی کے تینوں شہ پارے بہت زبردست تھے۔ ''گھر کا نہ گھاٹ کا'' اور ''دیا جلے'' ارم ناز کے قلم سے شاہکار کہانیاں تھیں۔ ''اتھری گھوڑی'' حنا بشریٰ کی نمبرون اور ٹاپ کلاس اسٹوری تھی۔ ثمینہ طاہر بٹ کی لکھی تینوں کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ وقاص حسین کی لکھی تینوں کہانیاں بہت شاندار تھیں۔ ریحانہ آفتاب نے بہت اچھا لکھا بالخصوص ''اور میں ہار گیا'' ایک یادگار کہانی تھی۔ ماہر، آخری پونجی، ڈارلنگ، کمی کہاں رہ گئی، نشہ، فتنہ، گرہن زدہ، جوانی دیوانی، ڈنکر اور پہنچی وہیں پہ خاک بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ مجید احمد جائی ''رب کے چور'' کے عنوان سے ایک سبق آموز کہانی لے کر آئے۔ عشق عالی نصب، کانٹوں بھری سیج، ستم در ستم اور قلم ٹوٹ گیا، کرب محرومی، باپ کا گناہ، غیرت، قصوروار کون، دلدل، عورت کا دل، تربیت اور آزمائش بہت اچھی حکایتیں تھیں۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا پرچہ نمبرون اور شاندار تھا۔ اب اجازت چاہوں گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ اگر زندگی نے وفا کی تو۔''

✤ پیارے بھائی! اس بار آپ تبصرہ کرنے میں اپنی فارم میں واپس آئے، شکریہ، زبردست تبصرے نے دل موہ لیا۔ ابوذر کو ہمارا بہت پیار دیجیے گا۔ یہ کہتے ہوئے کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔

☆ ادیبہ سرفراز لاہور سے لکھتی ہیں۔ ''کاشی بھائی! میرا نام احوالیوں کے لیے بلکہ آپ کے لیے بھی نیا ہے۔ کیونکہ یہ میرا سچی کہانیاں میں پہلا خط ہے۔ اس رسالے کو پڑھنے کا اتفاق تین مہینے پہلے ہی ہوا میں جھوٹ نہیں بولوں گی، مجھے پڑھتے ہوئے بڑا عرصہ ہو گیا ہے میری تب سے ہمت نہیں ہو رہی تھی اب ہمت کر کے لکھ رہی ہوں۔ اسے احوال میں جگہ دے دیجیے گا۔ میرا حوصلہ بڑھے گا تاکہ میں آئندہ بھی لکھتی رہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر خط ٹائم پر پہنچ گیا تو احوال میں چھپ جائے گا۔ اس میں اتنی چاپلوسیاں کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہاں تو میں اتفاق کی بات کر رہی تھی جو کہ کچھ مہینے پہلے ہوا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ میرا ایک کزن بہاولپور سے آیا ہوا تھا اس نے مجھ سے پوچھا یہاں کہیں قریب سے رسالہ مل جائے گا؟ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے رسالہ پڑھا ہی نہیں تھا اور پھر مجھے خیال آیا کہ شاید انارکلی یا اردو بازار سے مل جائے۔ میں نے اس سے کہا مجھے پکا یقین تو نہیں بہرحال وہاں سے ملنے کی امید ہے۔ میرے بتانے کی دیر تھی کہ وہ جناب فوری گھر سے نکل گئے اور جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں رسالہ تھا۔ اب میں سوچنے لگی کہ

اس میں ایسا کیا خاص ہے جو یہ بندہ اتنی دور اسپیشل رسالہ خریدنے کے لیے گیا۔ اس سے لے کر پڑھا تو معلوم ہوا اس کا اسپیشل جاتا بنتا تھا۔ میں ایڈیٹر کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکی کہ جس نے اتنی محنت سے رسالے کو ترتیب دیا ہے اور پھر اس کے بعد ہر رسالہ ایک سے بڑھ کر ایک آیا اور پھر اس مہینے تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ کوئی بھی ایسا رسالہ نکالنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کے اس مہینے کے "مختصر نمبر" نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اتنی کہانیاں ایک ہی رسالے میں! میرے پاس آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ خط کافی لمبا ہو گیا ہے اور پھر مجھے سمجھ بھی نہیں آ رہی کہ اتنی ساری کہانیوں پر تبصرہ کیسے کروں بس میں تو یہ کہوں گی کہ کوئی بھی کہانی کسی بھی کہانی سے کم نہ تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک کہانی تھی۔ اگلی بار تبصرے کی کوشش بھی کروں گی اگر پڑھائی سے ٹائم ملا تو۔ اللہ نگہبان۔"

پیاری ادیبہ! اگر یا خوش آمدید۔ تمہاری محبت نے ہمارا مان بڑھایا اب مزید مان تب بڑھے گا جب تم باقاعدہ احوال میں شرکت کرو گی۔

☆ ژوب سے عرصے بعد عمران مظہر کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ "کافی عرصے بعد رسالے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اپنا تعلق ان چیزوں سے ذرا اوپر ہے، انشاءاللہ۔ یقین کریں مسائل ہی مسائل ہیں۔ اب یہاں ذکر کرنا بدمزگی پیدا کرنے کے مترادف گا۔ اکثر خط لکھتے لکھتے رہ جاتا ہوں۔ آپ کا نمبر بھی آج کل بند یا مصروف ہو گیا ہے۔ کچھ Text کیے تھے آپ کو، دھیان میں رکھیے گا پلیز۔ آپ کے سسر کی وفات کا پڑھا تھا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، (آمین)۔ آپ کو سچی کہانیاں ایوارڈز کی کامیاب تقریب کے انعقاد پر مبارک باد دینا چاہوں گا۔ اپریل کے شمارے کا سرورق بہترین رہا۔ منزہ صاحبہ نے اداریہ "کاش" خوب لکھا۔ سہام مرزا صاحب کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ تقریب کا احوال پڑھ کر اچھا لگا۔ کہانیوں میں اک گناہ کی قیمت، محبت اور فرض، سزا مجھے ملی، داسی اور واپسی ہی پڑھ پایا ہوں اور سبھی نے بہترین لکھا۔ یقیناً باقی سب نے بھی خوب لکھا ہو گا۔ Story Selection آپ کی بہترین ہے۔ اپنے ذہن میں کچھ آتا ہی نہیں۔ بہت خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ کبھی بھرا تو پھر آپ سے ڈانٹ تو ضرور کھائیں گے۔ مستقل سلسلے سارے بہترین ہیں۔

پیارے عمران! خوش رہو، خدا تمہیں تمہاری ساری مشکلات سے نکالے، (آمین)۔ احوال میں جلدی جلدی آیا کرو یہ تم سب کا اپنا ہے۔

☆ اریبا نورین، ترنڈہ سوائے خان سے احوال میں پہلی بار آئی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "السلام علیکم کاشی بھائی! کیا حال چال ہیں آپ کے؟ بخیرو عافیت ہیں نا؟ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون ہے جو آتے ہی ایسے حال پوچھ رہی ہے جیسے صدیوں سے مجھے جانتی ہو۔ کاشی بھائی مانیں یا نہ مانیں بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی اصل میں سچی کہانیاں سے جڑے ہوئے کئی سال بیت چکے ہیں لیکن کبھی بھی دل میں خواہش نہ جاگی تھی کہ منظر عام پر آیا جائے لیکن پچھلے ماہ کے مختصر نمبر اور میرے دماغ میں آئی ہوئی ایک کہانی نے مجبور کر دیا کہ اب تو لکھنا بنتا ہے۔ سو میں نے بھی کاغذ قلم اٹھایا اور کہانی سمیت احوال بھی لکھ ڈالا۔ کہانیاں پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق بھی ہوا تو جب کہانی لکھی لی تو میں نے سوچا کہ کون سے رسالے میں بھیجی جائے تو دماغ اور دل دونوں نے ایک سیکنڈ سے پہلے سچی کہانیاں کو چن لیا اور میں نے بھی جھٹ سے کہانی بھیج دی۔ امید ہے کہ کہانی اس قابل ہو گی کہ رسالے کے چند صفحوں کی جگہ اپنے نام کروا سکے۔ مختصر نمبر کی بات کروں تو میرا دل یہ کہتا ہے کہ یہ واقعی بہترین تھا اور دلچسپ کہانیوں سے مکمل طرح بھرا ہوا تھا۔ ایسا مختصر نمبر کہ میں پڑھنے بیٹھی تو پھر شام ہو گئی لیکن رسالہ ہاتھوں سے جدا نہ ہوا اور آنکھوں کی ضد تھی کہ ابھی اور مطالعہ کیا جائے لیکن اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے مزید پڑھنا کافی مشکل ہو رہا تھا لیکن پھر بھی جتنا ممکن تھا میں نے پڑھا اور باقی جو کہانیاں بچ گئی تھیں وہ اگلے دن صبح اٹھتے ہی پڑھ ڈالیں۔ دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے یہی کہوں گی کہ انتہائی بہترین رسالہ اس ماہ میں اگر پورے

پاکستان میں چھپا ہوگا تو وہ یقیناً سچی کہانیاں کا مختصر نمبر ہی تھا۔ واقعی بہت اچھا شمارہ تھا۔ کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ تو نہ کر سکوں گی کیونکہ ''خاموش ہیں لب، جھکی ہیں پلکیں، دلوں میں الفت نئی نئی ہے''۔ لیکن مختصر طور پر ضرور بتانا چاہوں گی کہ اقبال بانو کی ''ہیر'' اور ''تیرے سنگ رہنا'' قابلِ تعریف ہیں۔ ممتاز احمد کی ''ڈراپ سین''، ارم ناز کی ''کتا'' حنا بشریٰ کی ''اتھری گھوڑی'' ثمینہ طاہر بٹ کی ''مکڑا اور مکھی'' وقاص حسین کی ''انصاف'' ریحانہ آفتاب کی ''راکھ کی کمائی'' حمیرا خان کی ''ماہر'' اچھی کہانیاں تھیں۔ اب لکھنے کا سلسلہ چل پڑا ہے تو انشاء اللہ ہر ماہ حاضر ہونے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ بس آپ اپنے دل میں جگہ ضرور دیجیے گا۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

☆ پیاری اریبہ! خوش آمدید! تم پہلے کہاں تھیں؟ کہانی زبردست لکھی تم نے اسی ماہ اپنی کہانی کی اشاعت کا لطف لو۔ اب ہر ماہ آنا۔ تم میں واقعی ایک بہت اچھا لکھاری مجھے دکھائی دے رہا ہے۔

☆ مستوئی کالونی ڈی جی خان سے پہلی پہلی آمد ہے ہماری بہن میمونہ سجاد جوئیہ کی۔ لکھتی ہیں۔ ''کاشی بھائی جی السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ پہلی بار احوال میں شرکت کی ہے۔ وہ کیا ہے کہ درحقیقت ماہ دولت سچی کہانیاں کی ست اور معصوم قاریہ ہیں۔ یوں سمجھئے کہ یہ خط لکھ کر ہم نے اپنی سستی کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ ہر نئے و پرانے قاری کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، ہماری بھی فرمایئے گا اچھے بھیا۔ سچی کہانیاں ہمارے دل کو بھا گیا ہے (سچی مچی)۔ اس سے دوستی میری بہترین سہیلی ارم خان (ڈی جی خان) کے توسط سے ہوئی۔ موصوفہ بڑے اصرار سے بالآخر لے ہی آئیں احوال میں۔ لکھنے کے جراثیم بھی غالباً ان کے ساتھ رہتے رہتے ہم میں منتقل ہوگئے ہیں۔ رئیل ماہ دولت نے لکھنا ارم خان سے ہی سیکھا ہے۔ سچی کہانیاں اور ماہ دولت میں ایک بات مشترک ہے کہ ہماری سہیلی ارم خان ہے جس پر ہمیں فخر ہے۔ کاشی بھیا آپ بھی خوش ہو جایئے کہ اب صرف ایک ارم خان ڈی جی خان کی بجائے دو میمونہ سجاد جوئیہ + ارم خان لکھیں گی۔''

☆ پیاری گڑیا! خوش آمدید! ارم بہن کے ہم بھی مشکور ہیں جو تم جیسی نٹ کھٹ کو احوال میں لے آئیں۔ اب لکھو اور باقاعدہ لکھنا ورنہ ہماری تمہاری کٹی ہو جائے گی۔

☆ بھائی شہزاد اقبال کی فیصل آباد سے پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ اسلام علیکم! کاشی چوہان صاحب کیسے ہیں آپ؟ امید ہے آپ ٹھیک ہوں گے۔ میں اپنا تعارف کروا دوں کیونکہ میں اس رسالے میں نیا ہوں بلکہ میں تو سب کے لیے نیا ہوں کیونکہ میں نے آج سے پہلے کسی بھی ادارے میں کوئی خط نہیں لکھا۔ یہ میرا اس رسالے میں پہلا خط ہے۔ میرا تعلق فیصل آباد سے ہے اور میں اس لکھنے لکھانے کے کام سے آج سے پہلے کوسوں دور تھا۔ اس قسم کا شغل میری منکوحہ کرتی ہے اور یہ بھی اسی کے فورس کرنے پر میں نے آج قلم اٹھا ہی لیا آخر۔ وہ مجھے فری بیٹھا دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس رسالے سے میرا تعلق تو کافی پرانا ہے لیکن صرف خرید کے لانے کی حد تک۔ کیونکہ میری بیگم صاحبہ اسے بڑے شوق سے پڑھتی ہیں بس ان کو لا کر دیتا رہا ہوں۔ کاشی چوہان صاحب آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ سچ ہے کہ یکم تاریخ سے لے کر تب تک میرے ڈیلی لائبریری کے چکر لگتے ہیں جب تک رسالہ مل نہیں جاتا۔ اس مہینے کا رسالہ بس اتفاق سے پڑھنے کو ملا۔ ہوا یہ کہ میری بیگم صاحبہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھیں (شادی کے بعد انہوں نے اپنی تعلیم پھر سے جاری کر لی) اور میں گھر پر بور ہو رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے بس یونہی خیال آیا کہ رسالہ پڑھ کر تو دیکھوں کہ اس میں اتنا کیا خاص ہے۔ جو مہینے کے شروع میں مجھ سے اتنے چکر لگوائے جاتے ہیں۔ بس پھر میں نے رسالہ کھولا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک کہانی اور پھر ایک رسالے میں اتنی کہانیاں اور پھر اوپر سے ایک رائٹر کی تین تین کہانیاں سب سے منفرد سوچ ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ رسالے میں ایک رائٹر کی ایک سے زیادہ کہانیاں چھپی ہوں۔ کاشی صاحب آپ کی محنت کو سلام ہے۔ یو آر دی گریٹ۔ اگلے ماہ کہانیوں پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا تب تک کے لیے اتنا ہی۔ خدا حافظ۔''

☆ پیارے شہزاد! خوش آمدید! جب تم سب جیسے پیارے ہمارے ساتھ ہوں تو رسالے کو چار چاند لگنے ہی ہیں نا، خوش

## سانحہ ارتحال

**برصغیر کے نامورترین قلم کار ایم اے راحت رضائے الٰہی سے گزشتہ ماہ انتقال فرما گئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے اہل خانہ کے ساتھ ہے۔ مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔**

رہو۔ اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ کوہاٹ سے ہمارے بہت ہی پیارے بھائی سید ملازم حسین شیرازی لکھتے ہیں۔ ''ڈیڑھ سال کے دوران میں نے دس کہانیاں ارسال کیں جن میں سے آٹھ کہانیوں نے شرف قبولیت حاصل کیا اور شائع ہوئیں دو کہانیاں آپ کے پاس محفوظ ہوں گی۔ امید ہے وہ بھی شائع ہوں گی ایک کہانی ''ندامت'' ارسال خدمت ہے۔ آپ کی عنایات کا بہت بہت شکریہ 18 ماہ میں 17 احوال نامے ارسال کیے سب کے سب شائع کیے، شکریہ۔ ایک ماہ امتحانات میں مصروف ہونے کی وجہ سے نہ بھیج سکا تھا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سچی کہانیاں سے عرصہ دراز سے تعلق اور رشتہ قائم رہا ہے۔ غم روزگار کی ہچکولے کھاتی کشتیوں نے اپنے جوار بھاٹا میں کبھی ڈبویا کبھی ساحل سے ہمکنار کیا لیکن اس رشتے میں دراڑ نہ آئی۔ دعا ہے کہ یہ تعلق ہمیشہ قائم رہے اور ادبی دنیا کی درخشاں جبیں پر جھومر بن کے چمکتا رہے۔ 10 مئی کو سچی کہانیاں ملا اگر پچاس کہانیاں پڑھی جائیں تو دس دن لگیں گے۔ تبصرہ بھیجیں تو پرچہ پریس جا چکا ہوگا۔ ساری محنت اکارت، مہربانی فرما کر شعبہ سرکولیشن کو ہدایت فرمائیں کہ ملک کے ہر شہر میں پرچہ دو تین کو ملنا یقینی بنائیں۔ ماہ مئی کا تازہ شمارہ نہایت دلفریب، خوب صورت ہے۔ مدیر اعلیٰ نے صحیح فرمایا ''کتنا بدل گیا انسان''۔ ''ہیر'' از قلم اقبال بانو خوب صورتی اگر خوبی ہے تو بعض اوقات یہی خوبی کسی سزا کا موجب بھی بن جاتی ہے۔ ''میرا کیا قصور'' جاوید راہی انہونی داستان۔ ''پیار کی تلاش'' ممتاز احمد۔ ڈیر ہوشیار ڈیر خوار یعنی زیادہ ہوشیاری بڑی ذلت اور خواری کا موجب بن جاتی ہے۔ کمی کہاں رہ گئی'' عظمیٰ شکور، اچھی کاوش۔ ''خانقاہ'' تصوف اور اسرار میں ڈوبی داستان۔ ''ماہر'' حمیرا خان، اچھی داستان۔ ''پہنچی وہیں پر خاک'' نسیم سحر، سبق آموز بہترین کہانی۔ ''تیرے میرے بیچ میں'' حنا بشریٰ، ایک عبرت ناک کہانی آج کی بے راہ روی معاشرے کا المیہ۔ ''ٹھیکیدار'' ثمینہ طاہر بٹ، انسانی سوچوں کو ابھارتی اچھی کہانی۔ ''قوس قزح'' کہانی میں تسلسل قائم تھا۔ ''رب کے چور'' مجید احمد جائی، اچھی دلچسپ کہانی۔ ''در گور محبت'' وقاص حسین، واقعی عورت اپنا پہلا پیار نہیں بھولتی۔ زنِ بیوہ کن گرچہ حور است۔ دیگر کہانی نویسوں ریحانہ آفتاب، ارم ناز، ثمین غزالہ نیہاں، نفیسہ فضل، سیدہ تبسم زہرا، نازیہ بتول رضا، فرح انیس کی کہانیاں نہایت عمدہ ہیں۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش نہایت مناسب رہے۔ عائشہ نور عاشا، نسیم سحر، صائمہ بشیر، حسین خواجہ، آپ کی والدہ کو اللہ پاک غریق رحمت فرمائے، آمین۔ مور شاہد حسین، نظر علی برمانی، دیر آید درست آید لیکن اتنی دیری سے یاد آوری کھٹکنے لگتی ہے۔ ذرا خیال کریں۔ والسلام۔ ممتاز احمد بابلا اساں اُڈ جانا اے۔ بیٹی کی شادی مبارک، اللہ پاک اس کے نصیب اچھے کرے، (آمین)۔ منشی محمد عزیز مے، فیصل ندیم بھٹی، حنا بشریٰ، نفیسہ فضل، ثمین غزالہ نیہاں، مسز نوید ہاشمی خداوند کریم آپ کی پریشانیاں ختم کرے، (آمین)۔ باقی احوال نامے بلاشبہ قابل تحسین ہیں۔ CENSUS 2017 کاشی چوہان! موجودہ وقت کو درپیش نہایت اہمیت کا حامل فرض اس موضوع پر نظم لکھنا کمالِ حیرت ہے۔ پیچیدہ اور مشکل مسئلہ، پھر خوب صورت الفاظ پر مشتمل عرضِ بیان قابل صد تحسین ہے۔ اللہ پاک مزید عروج بخشے، آمین۔''

☆ پیارے بھائی! خدا آپ کو مزید لکھنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آپ کی سلامتی کے لیے ہر دم دعا گو رہتے ہیں۔ آپ

کے تبصرے پر کچھ کہنا، سورج کو چراغ دکھاتا ہے۔

☆وقاص حسین رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ایوارڈ وصول کرنے کے بعد یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کاشی بھائی! میں آپ کی محبت کا مقروض ہوں کہ آپ نے بنا کسی مطلب کے اتنی عزت اور محبت دی ورنہ آج کے زمانے میں مطلب کے بغیر سگے بھی دو قدم ساتھ نہیں چلتے۔ کاشی بھائی آپ کا گلہ بنتا ہے لیکن میں بھی کیا کروں۔ اتنا مصروف ہوں کہ ٹائم نکال ہی نہیں پاتا۔ بس جاب ہی کچھ ایسی ہے کہ ہر روز کسی نہ کسی دوسرے شہر کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہینہ دو مہینے کے لیے کسی شہر میں رکنا بھی پڑتا ہے۔ کام کا بوجھ اس قدر سر پر آن پڑتا ہے کہ ٹائم نکال ہی نہیں پاتا۔ آج کل بھی پچھلے ڈیڑھ مہینے سے لاہور شہر کی خاک چھان رہا ہوں۔ احوال تو مجھے شاید بھول ہی گئے ہوں گے اور ان کا بھولنا بھی بنتا ہے کیونکہ میں نے احوال میں شرکت کی ہی نہیں۔ اب بھی شاید سال ڈیڑھ بعد حاضر ہو رہا ہوں۔ بہرحال اگر خدانخواستہ میں کسی کو یاد ہوں تو اس کی بہت مہربانی کہ اس نے مجھے اب تک یاد رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ میں اس لائق تو نہیں۔ میں ان بہن بھائیوں کا بہت شکر گزار ہوں جو میری ٹوٹی پھوٹی تحریروں کو پسند کرتے ہیں اور اپنی رائے سے نوازتے ہیں۔ میں بہت زیادہ اچھا لکھنے والا تو نہیں جو میں اپنی تحریروں پر فخر کر سکوں۔ بہرحال میں بہت شکر گزار ہوں۔ کاشی بھائی! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ نے میری کہانیاں لگا دیں مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ یہ خط بھی شاید میں نہ لکھتا لیکن آپ نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس مہینے کا رسالہ میں نے خرید کر اپنے بیگ میں رکھا ہوا ہے۔ ابھی تک اس کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے اس رسالے کی جتنی بھی تعریف کی جائے اتنی ہی کم ہے۔ گریٹ آئیڈیا استعمال کیا۔ ایسی سوچ میرا نہیں خیال کہ کسی کو آ سکتی تھی۔ ویسے کمال تو آپ پہلے بھی کرتے تھے لیکن اس بار تو آپ نے کمال کا بھی کمال کر دیا۔ کاشی بھائی! ہماری مصروفیات کم ہوئیں تو ہم بھی ہر مہینے احوال میں شامل ہوا کریں گے۔ تب تک کے لیے معذرت۔‘‘

🙞 پیارے وقاص! خوش رہو! تم نے ہمیں یاد کر لیا ہمیں اتنا ہی کافی ہے۔ بہت اچھا لکھ رہے ہو۔

☆عبدالعزیز یافث رحیم یار خان سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ’’کاشی صاحب روایت کے مطابق میں اپنا تعارف کرواتا چلوں۔ میرا نام عبدالعزیز ہے پر موصوف تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی شاعری بھی کر لیتے ہیں اس لیے اپنا تخلص یافث رکھ کر دل کو بہلاتے رہتے ہیں۔ نام تو ویسے نہیں سنا ہوگا۔ خیر مذاق کو فی الوقت ایک طرف رکھتا ہوں اور مدعا بیان کرتا ہوں۔ ایک مدت ہوئی اپنی آنکھوں کو سچی کہانیاں کی مزیدار کہانیوں سے چمکاتا رہتا ہوں۔ ہر ماہ بے صبری سے ایک ہی انتظار ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جلدی سے نیا رسالہ چھپ کر آ جائے تاکہ پھر سے دل کو لبھانے والی کہانیوں کو پڑھا جا سکے۔ میں بہت سالوں سے یہ رسالہ پڑھتا آیا ہوں۔ یہ ہمیشہ سے ہی بڑا دلچسپ اور منفرد رہا ہے لیکن کاشی بھائی مجھے ایک بات تو بتائیں یہ نت نئے آئیڈیاز کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا ہی نفیس طریقے سے مرتب کیا ہوا رسالہ پڑھنے کو ملا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مختصر نمبر دنیا کا سب سے اچھا مختصر نمبر ہوگا۔ ’’ماہر‘‘ کہانی کافی دلچسپ ثابت ہوئی۔ عدیل نامی چور واقعی کافی چالاک تھا۔ ثمینہ طاہر بٹ کی کہانی ’’دیوانی‘‘ بھی بہت سبق سکھانے والی کہانی تھی۔ وقاص حسین کی کہانی ’’انصاف‘‘ میں واقعی انصاف ہوا۔ دلیر اور بہادر بیٹے نے اپنے خاندان کے ساتھ کی گئی ناانصافی کا بدلہ بڑے ہی منصفانہ طریقے سے لیا۔ دوسری کہانیاں بھی دلچسپ تھیں جن میں ’’دیوانی‘‘، ’’راکھ کی کمائی‘‘ اور ’’ماہر‘‘ واقعی دل کو لگنے والی کہانیاں تھیں۔ ارم ناز کی ’’کتا‘‘ واقعی ڈگر سے ہٹ کے کہانی تھی اور تعریف کے قابل۔ کاشی بھائی ایک گلہ ویسے آپ سے مجھے ہے اور وہ یہ کہ میں نے تقریباً چھ ماہ پہلے آپ کو ایک کہانی ’’عشق کی معراج‘‘ بھیجی تھی لیکن آج تک نہ تو وہ چھپ سکی اور نہ ہی اس کا کوئی پتا چلا ہے۔ امید ہے اب میری درخواست پر غور کیا جائے گا کیونکہ آپ نے ہمیشہ ہر ایک کا خیال رکھا ہے اور مجھے بھی آپ سے یہی امید ہے۔ اب

آپ سے بندھے رہنے کی امید زیادہ ہے اور ہر ماہ حاضر ہونے کی کوشش بھی ضرور کروں گا۔ آپ ہمیشہ میرے دل میں رہیں گے۔ اللہ حافظ۔''

☆ پیارے یافث! خوش آمدید! کہانی ہمیں موصول ہوتی تو ضرور ذکر کرتے۔ اب یقیناً تمہیں ہم سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔

☆ دادو سندھ سے یہ آمد ہے۔ بھائی نظر علی برمانی لکھتے ہیں۔ ''مختصر کہانی نمبر کافی دیر سے یعنی آٹھ تاریخ کو ملا۔ چلو شکر ہے کہ مل تو گیا ورنہ میں تو ناامید ہونے لگا تھا کہ شاید اس بار آپ شمارہ شائع کرنا بھول گئے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح سرورق بہت اچھا رہا۔ منزہ سہام کے اداریے میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہم سے پوچھ رہے تھے کہ گم شدہ اوسان، وہ طوفان اور وہ انسان کہاں غائب ہیں۔ ہم بھلا کیا جواب دیتے ہم تو خود ہی اپنے آپ میں کھو گئے ہیں۔ احوال میں مجھ ناچیز کو جگہ دینے پر آپ کا بہت شکریہ۔ احوال میں سب ساتھیوں کے خطوط اور تبصرے بہت اچھے لگے۔ احوال میں پہلا خط محترم خضر حیات کا تھا جو مختصر ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ لگا۔ انہوں نے ڈاک والوں کے خلاف معصوم انداز میں شکایت کی، پڑھ کر ہم مسکرانے پر مجبور ہو گئے ان کی معصوم سی باتوں سے ہم بھی متفق ہیں۔ احوال میں نئے آنے والے ساتھیوں کو میری طرف سے بھی کرے آیا۔ شیما عبدالقیوم نے ایوارڈ نامہ بہت خوب لکھا۔ ایوارڈ حاصل کرنے پر میری طرف سے ڈھیروں مبارکباد اور بہت سی دعائیں اور نیک خواہشات۔ اس بار مختصر کہانی نمبر میں کہانیاں زیادہ تعداد میں اور نہایت دلچسپ تھیں۔ مختصر ہونے کی وجہ سے ایک ہی نشست میں کئی کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ اقبال بانو کی ''ہیر'' میں شیما کی قسمت پر رونے کو جی چاہا اور ''لڑکیاں'' میں پتا چلا کہ لڑکیاں واقعی بے بس اور مجبور ہوتی ہیں۔ ممتاز احمد کی ''ڈراپ سین'' اچھی تھی۔ شادی جیسے اہم فریضے میں جلد بازی کرنے والوں کے ساتھ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ''پیار کی تلاش'' میں قاسو کی بیوی نے بالآخر اپنا پیار تلاش کر ہی لیا۔ دعا ہے کہ اسے یہ پیار راس آئے۔ ''کالو پھڈے باز'' کے پاس پھڈے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا وہ ایک بادل ثابت ہوا جو برس نہیں سکتا تھا لیکن کیا وہ یہ سب شادی سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ ارم ناز کی ''گھر کا نہ گھاٹ کا'' سردار محمد خان نے غصے میں اپنا ہی گھر اجاڑ دیا اور صابرہ بی بی کی وجہ سے ایک انسان راہ راست پر آ گیا۔ بہت اچھے۔ ''دیا جلے'' بہت اچھی اور سبق آموز رہی۔ ''کتا'' ہمارے سماج کی طنز بھری کہانی تھی۔ کتے کا انجام افسوس ناک تھا۔ حنا بشریٰ کی ''جادو ہے نشہ ہے'' ایک بہت دلچسپ کہانی تھی۔ ایسی کہانیوں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ فلک شیر تابش کی ''دیالو'' میں ڈاکو سردار کی اس انوکھی رحم دلی پر اپنا سر پیٹنے کو جی چاہا۔ اعجاز احمد فکر ال کی ''ڈنکر'' میں ترقی کے لیے شارٹ کٹ راستہ استعمال کرنے والوں کے لیے ایک سبق تھا۔ نازیہ بتول رضا کی ''کانٹوں بھری سیج'' میں نادان آصفہ نے نادانی میں واقعی اپنے لیے ایک کانٹوں بھری راہ منتخب کی اور اب زندگی بھر اس پر چلنا تھا۔ شیخ معظم الٰہی کی فراڈیے پڑھ کر معلوم ہوا کہ آج کے دور میں چور بھی کتنے انٹیلی جینٹ ہو گئے ہیں واہ بہت حیرت انگیز رہی یہ کہانی۔ نوشابہ نوش کی ''تربیت'' میں والدین کے لیے ایک سبق ہے۔ ابھی تک اتنی ہی کہانیاں پڑھ سکا ہوں۔ جو ابھی تک نہیں پڑھیں، یقیناً وہ بھی زبردست ہی ہوں گی اور وہ سب کہانیاں یہ تبصرہ ارسال کرنے کے بعد مزے لے کر پڑھوں گا۔ میرے پسندیدہ رائٹر ممتاز احمد کو ان کی صاحبزادی کی شادی پر ڈھیروں مبارکباد اور بہت سی دعائیں۔ محترم ایم اے راحت کی اہلیہ کے انتقال کا پڑھ کر افسوس ہوا دعا ہے کہ رب تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر عطا کرے، (آمین)۔ کاشی بھائی ایک بات بتائیے لگ بھگ ایک سال پہلے ہم نے احوال میں سدرہ انور علی جھنگ کا خط پڑھا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے اور اب کوئی معجزہ ہی ان کی زندگی بچا سکتا ہے۔ انہوں نے بیماری کی حالت میں بھی دو ماہ تک احوال میں شرکت کی تھی لیکن پھر اس کے بعد ان کے بارے میں کوئی خبر ڈھونڈتا رہا لیکن ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کیا آپ ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں میں نے ان کے لیے بہت دعائیں مانگی تھیں۔ اللہ کرے کہ وہ خیریت سے ہوں۔

(ان کو دیکھنے کے لیے لوگ سندھ سے پنجاب گئے اور... سدرہ بالکل ٹھیک ٹھاک، صحت مند ہیں)''

❁ پیارے بھیا! شکر ہے کہ آپ وہ بھی سمجھ جاتے ہیں جو ہم سپرد قلم نہیں کر سکتے۔ تبصرہ زبردست رہا آپ کا۔ سدرہ کے بارے میں یقیناً آپ کو تسلی ہوگئی ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھنا کہ دادو والے بھی ہمیں بہت عزیز ہیں۔

☆ لاہور سے ہماری ہردلعزیز بہن حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔ ''مئی کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سرورق بے حد دیدہ زیب تھا۔ احوال کا آغاز آپ کی خوب صورت باتوں سے ہوا چند جملوں میں کتنی ہی مائیں دکھا ڈالیں۔ اب ذرا بات ہوجائے اس خاص شمارے کی جس نے کئی مہینوں سے سسپنس میں ڈالا ہوا تھا کہ آخر یہ ''مختصر کہانی نمبر'' کیا ہے اور بھیا اس کے لیے آپ نے لفظ استعمال کیا معرکتہ الآرا شمارہ جس نے ذوق وشوق کو مزید بڑھا دیا تھا۔ بہت بے چینی سے انتظار تھا اس نمبر کا اور جب آنکھوں کے سامنے آیا تو انگشت بداں ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایسا نمبر جو نہ پہلے پڑھا نہ پہلے سنا تھا۔ بھیا کہاں سے اس قدر اچھوتے آئیڈیاز آتے ہیں کہ تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو چونکا کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک رائٹر کے قلم سے تین تین رنگ 50 سے زائد کہانیاں۔ بھیا آپ کے رائٹرز تو پہلے ہی آپ کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہیں مگر اس دفعہ تو کمال کر دیا ہے آپ نے ویلڈن بھیا ویلڈن اور ہر کہانی کا نام رکھنے کا فن تو آپ کو یوں حاصل ہے کہ جیسے جوہری کو انگوٹھی میں نگینہ فٹ کرنے کا فن آتا ہو۔ آپ کی نظم نے پھر میلہ لوٹ لیا۔ اللہ آپ کو بہت دے اور ایسی عزت عطا فرمائے جس کو زوال نہ آئے (آمین)۔ احوال میں شامل تمام خطوط شاندار تھے نسیم سحر، حسین خواجہ، بھیا ممتاز احمد، بھیا مور شاہد حسین، نظر علی برمانی، منشی محمد عزیز، بھیا ملازم حسین شیرازی، نفیسہ فضل صاحبہ، مسز نوید ہاشمی، ام مناہل، سیمیں غزالہ نیہاں کے تبصرے جاندار تھے۔ ممتاز احمد صاحب کی بیٹی کی شادی مبارک۔ اللہ تعالیٰ بہت سی خوشیاں عطا فرمائے۔ ایم اے راحت صاحب کی اہلیہ کی مغفرت کی دعائیں۔ حسین خواجہ کی والدہ کے انتقال پر بے حد دکھ ہوا۔ اللہ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ شازیہ گل کے لیے امتحانات میں کامیابی کی ڈھیروں دعائیں۔ سیمیں غزالہ نیہاں! اللہ آپ کی ہر پریشانی دور فرمائے۔ آپ کا خط پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ مسز نوید ہاشمی کی بہن کو اللہ صحت وزندگی عطا فرمائے۔ بہت دنوں بعد احوال میں آپ شامل ہوئیں سچی کہانیاں کے تمام رائٹرز اور قارئین بہت زندہ دل ہیں دکھ غم سے گزرتے ہیں پھر بھی مسکراتے ہیں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں اللہ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، (آمین)۔ شیما عبدالقیوم کی زبانی تقریب کی روداد پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ ''لائف بوائے'' اچھا سلسلہ ہے۔ اقبال بانو صاحبہ کی تحریریں لاجواب تھیں۔ جاوید راہی، ممتاز احمد کی تحریریں بے حد منفرد تھیں۔ مزہ آگیا۔ ارم ناز ہر بار کی طرح منفرد تحریریں لائی۔ خاص طور پر ''کتا'' نے بہت متاثر کیا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اپنی تحریروں کی اشاعت پر مشکور ہوں۔ ثمینہ طاہر بٹ، وقاص حسین، ریحانہ آفتاب نے بھی خوب لکھا خاص طور پر ''راکھ کی کمائی'' ایک یادگار تحریر تھی۔ حمیرا خان کی تینوں تحریریں کمال کی تھیں۔ حمیرا خان کا طرز تحریر مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔ باقی تحریریں ڈارلنگ، کمی کہاں رہ گئی، نشہ، فتنہ، گرہن زدہ، سنو بھیا، کانٹوں بھری سیج متاثر کن تھیں۔ ''منگتا'' بھی منفرد تحریر تھی۔ ''جوانی دیوانی'' تو بہت بہت دکھی تحریریں تھیں۔ ''عشق عالی نصب'' سیدہ تبسم زہرہ رضوی نے باکمال تحریر لکھی۔ انداز بیاں بہت اچھا تھا۔ قصوروار کون، دلدل، عورت کا دل، امتحان، تربیت، آزمائش بہت درد بھری تحریریں تھیں۔ خاص طور پر سہیل خان کی امتحان پڑھ کر دیر تک غور فکر کرتی رہی واقعی وہ لوگ بہت عظیم ہوتے تھے جو اپنے نفس کو ٹھوکر پر رکھتے تھے اور ہم لوگ نفس کی خاطر ہر چیز کو ٹھوکر پر رکھ دیتے ہیں اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے، (آمین)۔ اب اجازت 21 توپوں کی سلامی اور آپ کا جواب بہت مزہ آیا۔

❁ پیاری گڑیا! تم سب نے مل کر ایک ایسی قوس قزح بنا ڈالی ہے کہ معرکتہ آلآرا لفظ سے کم کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ خدا تم سب لکھنے والوں کو اپنی امان میں رکھے۔ میں کچھ نہیں گڑیا کمال تم کرتے ہو۔ تبصرہ بھیج کر دل خوش کر دیا۔ زبردست تبصرہ ویلڈن!

☆ چک 58 شمالی سرگودھا سے ہمارے پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی لکھتے ہیں۔ ''مئی کے شمارے کا انتظار کرتے کرتے 8 مئی کو جا کے ملاگری کے موسم کی مناسبت سے ٹائٹل میں لڑکی پیلے رنگ کے کپڑے زیب تن کیے بالوں کو انگلیوں

میں لیے لبوں پر مسکراہٹ سجائے استقبال کرتی نظر آ رہی تھی۔ مختصر کہانی نمبر میرے ہاتھوں میں ہے۔ منزہ سہام مرزا بہادر شاہ ظفر کے اشعار پر روشنی بکھیر رہی تھیں۔ احوال میں کاشی چوہان مردم شماری کی ڈیوٹی کے دوران رونما ہونے والی ماؤں کی یادوں کا ذکر کر رہے تھے۔ نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید۔ نعیم اللہ، عاطر شاہین، صوفی غلام مصطفےٰ آزاد نقیبی طویل عرصے کے بعد احوال میں آنے والوں کو بھی خوش آمدید جن میں عائشہ نور عاشا، نور شاہد، نظر علی برمانی میری کہانی ''تیری راہ تک رہی ہوں'' کو پسند کرنے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ محترم ممتاز احمد صاحب، سید ملازم حسین شیرازی صاحب، حنا بشریٰ صاحبہ، حافظ عابد علی بھٹی، نظر علی برمانی، نفیسہ فضل صاحبہ، شازیہ گل اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی سے ہمکنار کرے، (آمین)۔ مور شاہد، صائمہ مجید، ندیم میواتی، مسز نوید ہاشمی، بلال فیاض، علی رضا، ذیشان ریاض کو سلام، فصیحہ آصف آپ سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے چلو پھر سہی۔ حافظ عابد علی بھٹی اسلام وعلیکم بہت خوشی ہوئی کہ آپ بھی شاہینوں کے شہر سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبال بانو ''ہیر'' ..... قسمت کا لکھا ہو کر ہی رہتا ہے جیسے مشی کے ساتھ ہوا۔ لڑکیاں معاشرے کی روایات اور والدین کی عزت کی خاطر لڑکیاں ہر ستم خاموشی سے سہتی ہیں تیرے سنگ رہنا سدا شاہدہ کی طبیعت ابدی نظر آئی ہے۔ ممتاز احمد ڈراپ سین مختار رکشے والا اسے ڈراپ سین سے پیار کی تلاش۔ کالو پھڈے باز، سبق آموز بہترین کہانی۔ 50 سے زائد کہانیاں پہلی بار کسی بھی رسالے میں نہیں پڑھیں ایک دن میں بس اتنا ہی پڑھا اور تبصرہ کیا کروں تمام قارئین کو سلام۔

❀ پیارے فیصل خوش رہو تمہاری محبت دیکھ کر ہی محبتوں پر یقین قائم ہوتا ہے خوش رہو۔

☆ بہت پیارے لکھاری اور دوست بلال فیاض ملتان سے آخر احوال میں شریک ہو ہی گئے۔ '' لکھتے ہیں آج بہت عرصے بعد ''احوال'' میں خط لکھ رہا ہوں۔ مختصر کہانی نمبر نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ شمارہ خوب صورت سرورق کے ساتھ ملا۔ 50 سے زائد سچی کہانیاں لکھا دیکھ کر حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ رنگین اشتہارات کو بغور دیکھتے ہوئے کہانیوں کی طرف بڑھے۔ اس دفعہ تو فہرست بھی چار صفحات پر مشتمل تھی۔ زبردست منزہ آپی کا اداریہ حسب روایت پراثر ثابت ہوا۔ احوال کے شروع میں آپ جو لکھتے ہیں وہ باتیں مجھے بے حد پسند آتی ہیں۔ کاشی! ایم اے راحت اور ان کی اہلیہ کی وفات پر دلی دکھ ہوا۔ ممتاز بھائی کی بیٹی کی شادی کی بے حد مبارکباد اور دعائیں۔ شیما عبدالقیوم کا ایوارڈ نامہ دلچسپ تھا۔ کہانیوں میں ایک مصنف تین کہانیوں والا فارمیٹ بے حد پسند آیا۔ اقبال بانو کے تینوں شاہکار قابل تعریف ہیں۔ تیرے سنگ رہنا، ہیر، لڑکیاں، زبردست۔ جاوید راہی کی میرا کیا قصور، گھاؤ، ایک تھی عظمیٰ دلچسپ تھیں۔ ممتاز احمد کا ڈراپ سین، پیار کی تلاش اور کالو پھڈے باز بھی کمال کا تھا۔ اس شمارے کی خاص بات جو مجھے بہت پسند آئی وہ کہانیوں کے اوپر لکھی شہ سرخیاں تھیں جس نے کہانی پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ حنا بشریٰ کی زنبیل کے تینوں رتن قابل تعریف ہیں۔ ارم ناز کا ''گھر کا نہ گھاٹ کا'' زبردست رہی باقی دو کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ وقاص حسن، ثمینہ طاہر بٹ اور حمیرا خان اور ریحانہ آفتاب بھی اپنی کہانیوں کے ساتھ مختصر کہانی نمبر میں رنگ جما رہے تھے۔ نگار خانے سے پاگل خانے تک اچھا سلسلہ ہے۔ قوسِ قزح کا اختتام اچھا رہا۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ مجموعی طور پر شمارہ آپ کی دل و جان سے کی گئی محنت کا شاہکار تھا۔''

❀ پیارے بلال! تم احوال میں آ گئے۔ تبصرے میں تمہاری محبت نے آنکھیں نم کر دیں، کاش اس شمارے میں تم بھی کہیں نظر آتے۔ خیر اب تم اس ماہ اپنی کہانی سے محظوظ ہو جاؤ۔

☆ ڈسکہ، سیالکوٹ سے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی نسیم سکینہ صدف لکھتی ہیں۔ ''سچی کہانیاں کا معیار دن بدن بہت بلند ہو رہا ہے۔ بہت محنت سے ہر شمارہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہر کہانی ایک سبق لیے ہوتی ہے۔ منزہ جی اور کاشی چوہان کی محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اللہ پاک ان پرچوں کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے، آمین۔

❀ اچھی نسیم جی! آپ کا مختصر تبصرہ بھی سر آنکھوں پر۔ بس گلہ یہ ہے کہ آمد بڑے دنوں بعد ہوتی ہے آپ کی۔ کیوں؟

☆ احوال میں یہ آمد ہے غلام مرتضیٰ علوی کی۔ چک نمبر 301، گوجرہ سے لکھتے ہیں۔ ''السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ شدید گرمی میں جیسے ہی شمارہ ملا اتنی خوشی ہوئی کہ کچھ دیر کے لیے گرمی کا احساس جاتا رہا۔ جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ فہرست پڑھی تو پتا لگا کہ میری تحریر بھی شائع ہوگئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کا کہ آپ نے میری تحریر شائع کی امید ہے۔ قاری بھی پسند کریں گے۔ منزہ سہام کا بلاعنوان کی تعریف اگر کریں گے تو ایک خط کافی نہیں۔ بلاشک وشبہ لاجواب تحریر تھی۔ آگے آتے ہیں خطوں کی طرف اب تک جو جو خط پڑھے ہیں ان میں بہن نسیم سحر، خواجہ صاحب، مور شاہد بھائی، نظر برمانی صاحب، ممتاز بھائی، منشی عزیز، سید ملازم، حنا بشریٰ صاحبہ کے خطوط بے حد پسند آئے۔ خاص طور پر محترمہ نفیسہ صاحبہ کے خط کا تو کیا کہنا۔ خدا اس رسالے اور اس میں شرکت کرنے والے تمام بہن بھائیوں پر اپنی رحمت کرے۔ کہانیاں جو ابھی تک پڑھی ہیں ان میں ترے سنگ رہنا، ذرا پ سین، دیا جلے، جادو ہے نشہ ہے، لائف بوائے، میرا کیا قصور، سنو بھیا پسند آئیں ہیں۔ باقی تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

☆ پیارے غلام مرتضیٰ! آپ کی تحریر پر کیا تبصرہ کروں۔ آپ اپنی بھیجی گئی تحریر ہائیڈ پارک میں پڑھ لیں۔ ہم نے آپ کو انتظار کی سولی پر لٹکنے کی بھی مہلت نہ دی۔ امید ہے تحریر کا فرق سمجھ آجائے گا۔ احوال میں آمد کا شکریہ۔

☆ یہ احوال میں اسلام آباد سے تشریف لائی ہیں ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور صاحبہ لکھتی ہیں۔ ''کیسے ہیں سب احوالی! اداس نا، ظاہر ہے میں جو بہت عرصے بعد آئی ہوں۔ ہمیں اور جینے کی چاہت نہ ہوتی اگر سچی کہانیاں نہ ہوتا۔ مگر پھر بھی زندگی کے مسائل میں الجھ کر رہ گئی کہ تبصرہ نہ بھیج پائی بس جی خوش ہو جائے میں حاضر ہوں مسالے دار تبصرے کے ساتھ۔ ایک بہت مزے کی بات بتاؤں رسالہ پڑھا میں نے اگلے دن سوچا تبصرہ لکھوں دل میں افسوس کہ عظمیٰ تیری کوئی اسٹوری شائع نہیں ہوتی۔ ایڈیٹر صاحب کو من ہی من میں دس ہزار سنا دیں میں نے۔ جب چائے بنا کر تبصرہ لکھنے بیٹھی تو صفحے پلٹتے اپنی لکھی اسٹوری پر نظر پڑی اف میں خوش، میں سکتے میں...... ہائے قسم سے ویسے ایڈیٹر صاحب معصوم سے ہیں بہت اچھے۔ بہت خیال کرتے ہیں سب کا میں ہی ناشکری ہوں لگی سی۔ جی تو جناب! آتے ہیں کہانیوں کی طرف 50 کہانیاں اف اف۔ پھر ہمت کر کے تبصرہ لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے محترمہ اقبال بانو کو پڑھا۔ ماشاء اللہ کیا خوب لکھتی ہیں، بڑا سندر لکھتی ہیں۔ اقبال بانو کی لکھی تحریر ہے قسم سے روہی دی میں پڑھ کر۔ کیا قسمت تھی بیچاری کی۔ مگر ان کے حسن کی اتنی تعریفیں تھیں کہ جی چاہا کہ ایک نظر میں بھی دیکھ لوں اس ہیر کو۔ دوسری اسٹوری لڑکیاں خدا کی قسم بالکل ایسا ہی ہوتا ہے ہر گھر میں لڑکیوں کے ساتھ۔ آپ کا لکھا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی تھا۔ زبردست اسٹوری۔ ''تیرے سنگ رہنا سدا'' انمول محبت کی داستان۔ بہت خوب لکھا زبردست لکھا رشتے یہ ہوتے ہیں مگر ماں بھی ایسی ہو سکتی ہے دکھ ہوا پڑھ کر۔ حنا بشریٰ کی لکھی داستان ''جادو ہے نشہ ہے'' قسم سے میں تو اب تک حیرتوں کے سمندر میں موجزن ہوں۔ قسم خدا دی حنا بشریٰ یقین نہیں آتا۔ ہم بھی لکھتے آئے ہیں مگر اب تک کسی ایڈیٹر کا قہقہہ نہیں سنا۔ مہر النساء کی لکھی آزمائش چھوٹی سہی مگر بہت بڑی بات یہ کہ صبر کا انعام اللہ ضرور دیتا ہے اور دن بدل جاتے ہیں اچھے دن مقدر بنتے ہیں۔ نوشابہ نوش کی چھوٹی سی ننھی منی کہانی ''تربیت'' ٹھیک لگی مگر بچوں پر اس قدر سختی اف توبہ ٹھیک نہیں۔ آئیں ذرا ہائیڈ پارک چلتے ہیں تازہ ہوا کے لیے۔ ہائیڈ پارک میں مسز نگہت غفار کی نظم گواہ اچھی لگی۔ فاخرہ بتول کی نظم جیت بھی اچھی تھی۔ شعروں میں عبدالغفار عابد کا شعر اچھا لگا اور ایڈیٹر صاحب آپ بہت ہی اچھے ہیں اپنا خوب خیال رکھا کریں تاکہ آپ میری اسٹوری شائع کر سکیں (یہ ہوئی نا بات!!) بہت سارا پیار سچی کہانیوں کو۔ میری طرف سے آپ سب کو رمضان مبارک۔ کراچی کے لیے بے انتہا دعائیں۔

☆ اچھی لڑکی! سدا خوش رہو، تمہارے احول میں آنے سے سارے احوالی خوش ہوتے ہیں۔ آتی رہا کرو۔ قسم سے سب بہت مس کرتے ہیں تم کو۔ تبصرہ اچھا کیا مگر تبصرہ گیا کہاں باقی؟

☆ تنزیلہ عرف تانی منڈی بہاؤالدین سے لکھتی ہیں۔ ''سب سے پہلے تمام پڑھنے والوں کو سلام اور رمضان المبارک

کی بہت بہت مبارک قبول ہو۔ ماہ مئی کا شمارہ 8 مئی کو ملا۔ مختصر کہانی نمبر بہت بے مثال اور اچھوتا نمبر تھا۔ سب کہانیوں کی سلیکشن بہت اچھی اور اے ون تھی۔ ایک یادگار شمارہ تھا۔ آئندہ بھی اسی طرح کے شماروں کا اجراء ہوتے رہنا چاہیے۔ رائٹرز کی تین تین کہانیاں! بہت اچھا سیگمنٹ رہا اس طرح باقی رائٹروں نے بھی بہت اچھا لکھا۔ سب رائٹر مبارک باد کے مستحق ہیں مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا۔ اب اجازت چاہتی ہوں السلام علیکم۔''

پیاری تنزیلہ! بھئی کہاں غائب ہو تم! اب تمہاری غیر حاضری نہیں چلے گی۔ اگلے ماہ ضرور آنا۔ تبصرے کا شکریہ۔

☆ غزالہ کرن فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔''سب چھوٹے بڑے تمام پڑھنے والوں کی خدمت میں غزالہ کرن کا سلام۔ کہیے بھئی آپ سب کیسے ہیں؟ مگر آپ سب ہیں بڑے بے مروت بھئی پورے دو ماہ غیر حاضر رہی مجال ہے کسی ایک نے بھی یاد کیا ہو۔ ماہ مئی کا مختصر کہانی نمبر آٹھ تاریخ کو ملا۔ واہ بھئی واہ کیا غضب کا شمارہ تھا۔ اپنی نوعیت کا پہلا نمبر اور کہانیوں کا انتخاب بھی بڑا زبردست پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ کاشی بھائی سچ پوچھو تو سال میں دو یا تین مختصر کہانی نمبر ضرور نکالا کریں۔ اقبال بانو کی ''ہیر'' اور ''تیرے سنگ رہنا سدا'' بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ جاوید راہی کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ممتاز احمد کی ''ڈراپ سین'' اور ''پیار کی تلاش'' بہت غضب کی کہانیاں تھیں۔ ارم ناز کی ''گھر کا نہ گھاٹ کا'' بہت اچھی اسٹوری تھی۔ حنا بشریٰ کی ''اتھری گھوڑی'' ٹاپ کلاس کہانی تھی۔ ثمینہ طاہر بٹ، وقاص حسین، ریحانہ آفتاب، حمیرا خان نے بھی بہت اچھی کہانیاں لکھیں۔ اب تک اتنا ہی پڑھ سکی ہوں۔ اب خط کا اختتام کرتی ہوں آخر میں سب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔''

پیاری غزالہ! تمہیں ہم نے بہت یاد کیا۔ یقیناً ہچکیاں تو آتی ہی ہوں گی۔ تبصرہ بہت اچھا لگا تمہارا..... مختصر سا۔

☆ بشریٰ کنول فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔''سب سے پہلے تو مبارک باد وصول کرو کہ اتنا اچھا پرچہ پڑھنے کو دیا۔ ماہ مئی کا مختصر کہانی نمبر تو دل کو چھو گیا۔ پچاس سے زائد کہانیاں اور ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک۔ بھئی میرا تو دل بہت خوش ہوا۔ کاشی یہ سب تمہاری دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اللہ پاک تمہیں خوش رکھے۔(آمین)۔ سب سے پہلے سچی کہانیاں کے مایہ ناز رائٹرز کی کہانیاں پڑھیں۔ واہ مزہ آگیا۔ سب نے بہت مزے کا لکھا۔ حنا بشریٰ کی کہانی ''اتھری گھوڑی'' بہت کمال کی اسٹوری تھی۔ ڈارلنگ، نشہ، فتنہ، پہنچی وہیں پہ خاک، ادھوری محبت، عشق عالی نصب، کانٹوں بھری سیج تو بہت خاص کہانیاں تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ مجموعی طور پر سب رائٹرز نے بہت اچھا لکھا۔ آپی صائمہ بشیر کیسی ہیں آپ؟ میرا سلام قبول فرمائیں، اب اجازت چاہتی ہوں۔''

اچھی بہن! آپ کو پرچہ پسند آیا ہماری محنت وصول ہوگئی۔

☆ ہمارے پیارے بھائی مور شاہد حسین قمر شہدادکوٹ سے لکھتے ہیں۔''مختصر کہانی نمبر کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ آئے روز شدت بڑھتی ہی چلی گئی۔ سولی پر لٹک کر انتظار کرتے رہے اور پرچہ تھا کہ مل ہی نہیں رہا تھا۔ خیر خدا خدا کر کے آخر مل ہی گیا۔ جنوری میں ایوارڈ تقریب، فروری میں عشق نمبر، مارچ میں پراسرار نمبر، اپریل میں ایوارڈ نمبر، مئی مختصر کہانی نمبر۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کو دونوں ہاتھوں سے سلام۔ اللہ پاک کرے زور قلم اور زیادہ۔ مزید کامیابی کی دعائیں۔ کاشی بھیا منفرد اور مثالی پرچہ دینے پر دلی مبارک باد۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ بلاعنوان بہترین اداریہ۔ محفل احوال اپنے عروج پر تھی۔ احوال کے آغاز میں آپ کی باتیں دل میں اترتی چلی گئیں۔ نعیم اللہ، صوفی غلام مصطفیٰ آزاد، افضال احمد، بھلی کرے آیا(خوش آمدید)۔ زاہد حسین، آپ کو محفل احوال میں شرکت کی دلی دعوت۔ شاز یہ گل بہن! پیپرز میں کامیابی کی دعائیں۔ فریدہ فری بہن! اللہ آپ کو صحت تندرستی دے، حسین خواجہ کیسے ہیں آپ؟ آنٹی نفیسہ فضل اللہ آپ کو دراز عمر و تندرستی عطا فرمائے۔ مسز نوید ہاشمی آپا شکریہ، سلامت رہیں محمد عزیز مے خوش و سلامت رہیں۔ ادی تحسین جونیجو آپ کہانی کب پڑھنے کو دے رہی ہیں۔ شیما عبدالقیوم مبارک باد، اسماء اعوان ''لائف بوائے'' بہترین تھی۔ اقبال بانو، جاوید راہی، ممتاز احمد، ارم ناز، حنا بشریٰ، ثمینہ طاہر بٹ، وقاص حسین، ریحانہ آفتاب، حمیرا خان نے سب کہانیاں نہایت عمدگی سے پیش

گئیں۔ کاوش صدیقی ”خانقاہ“ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ رانا حبیب الرحمٰن، ”قوس وقزح“ آخری حصہ بھی بہترین۔ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ پسند آئیں کس کس کا نام لیں ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ سب نے اچھا لکھا۔ اب اجازت تمام چاہنے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔“

☆ پیارے مور! تمہارا تبصرہ اچھا لگا۔ بس اب احوال سے غائب نہ ہونا۔

☆ طاہر علی ابڑو گوٹھ سے پہلی بار لکھتے ہیں۔ ”کاشی چوہان اسلام علیکم! احوال میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے۔ سچی کہانیاں کا تعارف اپنے پیارے بھائی مور شاہد حسین کے ذریعے ہوا جو کہ باقاعدگی سے پرچہ پڑھتے ہیں اور ماشاء اللہ کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ ماہ مارچ میں ”میں زندہ ہوں“ مور شاہد حسین اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ مئی ۲۰۱۶ء مختصر کہانی نمبر کی صورت میں ملا جو بہترین رسالہ تھا۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ پرچے کی خوب صورتی آپ کی سچی لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔“

☆ پیارے طاہر! خوش آمدید! اب مور کے ساتھ ساتھ تم بھی ہمارے ہوئے۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

☆ شائستہ طارق جونیجو بورزی شریف سے لکھتی ہیں۔ ”پرچہ بہت اچھا دے رہے ہیں آپ جو کہ آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس دفعہ تو شارٹ شارٹ سی کہانیاں پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا۔ (جلدی جو ختم ہو جاتی ہیں) ہائے اللہ اتنی کہانیاں ایک تیر سے تین شکار کیا بات ہے۔ زبردست۔ اس بار جلدی میں ہوں۔ کہانیاں جو ننھی منی سی ہیں تو میرا خط بھی ننھا قبول کیجیے۔ پھر ملاقات ہوگی۔“

☆ پیاری شائستہ! گڑیا بہت خوشیاں خدا نصیب کرے۔ تبصرہ بھلے ہی ننھا سا ہے لیکن تمہارا ہم سے پیار بہت طویل ہے۔ ہمیشہ خوش رہو آباد رہو۔

☆ لاہور سے احد عزیز کی پہلی بار آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”مختصر کہانی نمبر میرے سامنے ہے اور میں خود کو عرش معلی پر سمجھ رہا ہوں۔ کیونکہ اس میں سارے ہی میرے فیورٹ رائٹرز ہیں اور سب کی کاوشیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ہم ادب کے چاہنے والوں کے لیے ہر ماہ آپ جو اتنا حسین شمارہ لاتے ہیں، وہ آپ کا ہی کمال ہے۔ مختصر کہانی نمبر کی تقریباً سب ہی کہانیاں بے مثال تھیں، مگر چند تو واقعی اعلیٰ پائے کی تھیں، جیسے ”ہیر“۔ ”اتھری گھوڑی“ ایک تھی عظمیٰ ”دیوانی“۔ ”غیرت“ ”عورت کا دل“۔ ”مرزا اور مکھی“۔ ”منگتا۔ گردن زدہ۔ جادو بے نشہ ہے۔ ٹھیکیدار۔ کیا کمال کی کہانیاں تھیں۔ سب رائٹرز کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ مگر سر، ایک مسئلہ ہے۔ سچی کہانیاں اب بہت دیر سے ملنے لگا ہے اور بعض اوقات تو ملتا ہی نہیں۔ مہربانی فرما کر اس طرف بھی توجہ دیں اور ہمیں ہمارا پیارا شمارہ وقت پر پہنچا دیا کریں۔ شکریہ۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ انشاءاللہ پھر خط کے ذریعے ملاقات ہوگی۔“

☆ پیارے احد! خوش آمدید! بیٹا تم سب کی شکایت جلد دور ہو جائے گی۔ اپنا خیال رکھنا۔ تبصرے کا شکریہ بیٹا۔

☆ زرینہ جونیجو بورزی شریف سے لکھتی ہیں۔ ”پرخلوص اچھے بھیا کاشی السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب لوگ! عرصہ بعد حاضری لگوانے آئی ہوں۔ وجہ ناساز طبیعت کی وجہ سے کچھ لکھا یا پڑھا نہیں جا سکتا۔ بس یہ تبصرہ بھی اپنے کاشی بھائی کی محبت ہے، جو پکارتے ہیں تو ہم چلے آتے ہیں۔ پرچہ اتنا لیٹ ملتا ہے کہ آدھا ماہ گزر جاتا ہے۔ تو خط کی تاریخ بھی تاریخ بن جاتی ہے۔ اب کی بار مختصر کہانی نمبر تھا تو سوچا میں بھی مختصر جھلک دکھلانے آؤں۔ بس دعاؤں میں یاد رکھا کریں کہ صحت بحال ہو جائے۔ مور شاہد حسین بھائی ہر ماہ یاد کرتے ہیں آپ کا خلوص ہے، سلامتی ہو۔ کہانیاں تمام ہی لاجواب ہیں۔ بہت سی داد۔ کاشی بھائی سب آپ کی محنت کا کمال ہے۔“

☆ پیاری ادی! آپ کی صحت و سلامتی کی دعائیں ہمیشہ ہی دل میں تلاطم برپا رکھتی ہیں۔ جب میری ادی احوال میں آتی ہے تو دل کو اطمینان ہو جاتا ہے بس یہ بھائی کی خوشی ہی نہیں بلکہ آپ کی آمد سے احوال بھی خوش ہوتے ہیں۔

☆تحسین جونیجو جونیجو بورڑی شریف سے لکھتی ہیں۔ ''محترم و اچھے بھیا کاشی السلام علیکم! کئی ماہ بعد حاضر احوال ہوں۔ مجال ہے جو کسی نے بھولے سے بھی یاد فرمایا ہو۔ محفل کی رونق ماہدولت کے بنا ادھوری سی ہے ناں رات یہ خواب آیا تھا کچی جب ہی سب کو ڈرانے دوڑے چلے آئے ہم۔ پرانے احباب تو حجاب میں ہی کھو کر رہ گئے ہیں جب کہ نئے شرمیلے خود ہی حجاب محسوس کر رہے ہیں کہ کسے مخاطب کیا جائے۔ بھئی یہاں تو منہ پھٹ پارٹی کے چرچے کا رواج تھا (ہاہاہا)۔ سب اونگھ رہے ہیں کاشی بھیا ذرا محبت کی تلوار تو ماریں ناں تا کہ سوئی ہوئی قوم جاگ جائے۔ ویسے بھی اس قوم کو جگانے میں کاشی بھیا کا بڑا ہاتھ ہے۔ وار قبول کیجیے۔ کام کے دیوانو۔ ہر دم دعا گو ہوں صحت بھری سلامتی کی دعا بھیا۔ احوال میں مدت بعد ہمارے کھوئے ہوئے بھائی نذر علی برمانی کی آمد نے مسرور کیا۔ خوش رہیے آتے رہیے۔ مور شاہد حسین بھائی واحد ہیں جنہوں نے ہم بہنوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ جب بھی آتے ہیں دعا میں یاد ضرور کرتے ہیں۔ خوش رہیے بھائی۔ مختصر کہانی نمبر ہاتھ میں ہے لیکن یہ موقع اپنے ہاتھ سے مس ہو گیا ورنہ اپنا خط ہی مختصر کہانی کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک دو اپنی تحریریں بھی لگ جاتی تھیں مگر! خیر پھر سہی۔ اس میں ایک تحریر نے بہت متاثر کیا 'عورت کا دل' خوب صورت انداز میں انتہائی مختصر مگر بہت بڑا پیغام۔ باقی کہانیوں میں ڈارلنگ، قوس قزح، کانوں بھری سیج، رب کے چور، پیار کی تلاش، دیا جلے، درگور محبت، جادو ہے نشہ ہے، لڑکیاں، گھاؤ اور عادت شاندار بنی اور سبق آموز کہانیاں ٹھہریں۔ ویلڈن لکھاریوں۔ اب پچاس کہانیاں ہیں ماشاءاللہ تو پھر میرا تبصرہ بھی منی کہانی بن جائے گا۔ کاشی بھیا منہ پھلا کے بیٹھ گئے بس بیٹا ہو گیا جا شاباش۔''

☆پیاری گڑیا! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تم اتنے دن بعد آؤ اور ہم منہ پھلا لیں۔ بہنوں کو بھائیوں پہ بہت مان ہوتا ہے۔ تم ہمیشہ اپنے مان اور حق کے ساتھ احوال میں شرکت کیا کرو۔

☆لاہور سے ہماری بہت پیاری بہن ثمینہ طاہر بٹ کی احوال میں آمد ہے۔ اپنے بھرپور تبصرے میں لکھتی ہیں۔ '' پچھلے کچھ عرصے سے سچی کہانیاں لیٹ مل رہا ہے۔ اور دوشیزہ تو مل ہی نہیں رہا، مگر اس بار تو حد ہی ہوگئی۔ تیرہ مئی کو شمارہ ملا۔ ایک تو جلتی تپتی گرمی اور اس پر سچی کہانیاں کا انتظار۔ مت پوچھیں، کیا حالت ہو رہی تھی۔ صد شکر کہ آخر کار شمارہ مل ہی گیا۔ گو لیٹ ہی سہی۔ خیر بڑی بیتابی سے کھولا کہ مختصر نمبر کا خاص شمارہ تھا۔ واہ واہ۔ دل خوش ہوگیا۔ انتظار کی ساری کوفت جاتی رہی۔ اپنے تمام فیورٹ رائیٹرز کے زور آور قلم سے نکلنے والی تحریریں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ ویسے تو جب سے کاشی بھائی نے سچی کہانیاں کی ادارت سنبھالی ہے۔ اس کا معیار ماشاءاللہ روز بہ روز بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ مگر جب سے یہ ہر ماہ کسی نہ کسی خاص نمبر کا تڑکا لگنا شروع ہوا ہے۔ سمجھو، سونے پے سہاگہ ہی ہوگیا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے کاشی بھائی۔ اب آتی ہوں شمارہ کی طرف۔ واہ، کیا اچھوتا خیال تھا کاشی بھائی کا کہ ایک ایک مصنف کی تین تین تحریریں اور وہ ابھی ایک سے بڑھ کر ایک۔ بے مثال۔ شاندار۔ لاجوب۔ اور کیا کہوں کہ زبان گنگ ہوگئی ہے۔ سبحان اللہ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اداریہ میں منزہ سہام صاحبہ نے ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور درد سے بھرے الفاظ کا استعمال کیا۔ بہادر شاہ ظفر کا نوحہ تو آج ہم سب کا نوحہ بن چکا ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنے امان میں رکھے اور ہمارے پیارے پاکستان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین۔ احوال میں کاشی بھائی نے حسب روایت خوبصورت محفل سجا رکھی تھی۔ کاشی بھائی کی باتیں بھی آنکھوں کے راستے سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔ بہت خوب کاشی بھائی۔ محفل میں شریک سب احوالی اپنے پورے طمطراق کے ساتھ موجود تھے اور محفل کو خوب رونق بخش رہے تھے۔ ماشاءاللہ۔ خضر حیات۔ عائشہ نور عاشا، نسیم سحر، یاسر وکی۔ حسین خواجہ، ممتاز احمد، ملازم حسین شیرازی، نظر علی برمانی، مور شاہد حسین، حنا بشریٰ، فریدہ فری، علی اصغر شیرازی، مسز نوید ہاشمی، نفیسہ فضل عاطر شاہین، وقاص کھوکھر، عابد علی بھٹی، منشی عزیز مئے، سیمیں غزالہ نیہاں، شازیہ گل، نعیم اللہ جویا، صائمہ بشیر، اور جن کے نام رہ گئے، ان سب کی شرکت بلکہ بھرپور شرکت نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ اللہ ان سب کو سلامت رکھے اور انہیں بھی جو کسی وجہ سے محفل میں شریک نہیں ہو سکے۔ سب کے خطوط بہت جاندار اور تبصرے شاندار رہے۔ میری تحریروں کو پسند کرنے اور مجھے

دعاؤں میں یاد رکھنے کے لیئے سب بہن بھائیوں کی بے حد شکر گذار ہوں۔ اللہ آپ سب کو جزائے خیر عطا کرے۔ آمین۔ ممتاز احمد بھائی صاحب کو بیٹی کی شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ بچی کے نصیب بلند کرے اور اسے دنیا و آخرت کی کامیابیاں نصیب فرمائے آمین۔ ایم اے راحت صاحب اور حسین حواجہ صاحب کی والدہ کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور مرحومین کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ شیما عبدالقیوم کا ایوارڈ نامہ اور اسماء اعوان کی لائف بوائے کہانی بہت خوب رہیں۔ مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ آپا، اقبال بانو صاحبہ کی تین تحریریں پڑھیں، اور تینوں ایک سے بڑھ کے ایک رہیں۔ ''جاوید راہی'' کی ''میرا کیا قصور'' اف بات نصیبوں کی ہی تو ہوتی ہے، مگر احتیاط بھی تو کسی چڑیا کا نام ہے۔ ''گھاؤ'' ''ایک تھی عظمی'' تینوں ہی بے مثال کہانیاں۔ ''ممتاز احمد '' کا ''ڈراپ سین۔'' نہلے پہ دہلا۔ ''پیار کی تلاش''۔ ''کالو پھڈے باز'' بہت خوب۔ ''ارم ناز'' خوبصورت الفاظ کی جادوگر قلم کار کے قلم سے نکلنے والی سحر انگیز تحریریں ''گھر کا نہ گھاٹ کا''' ''دیا جلے'' ۔''کتا'' واہ ارم واہ۔ ''حنا بشریٰ'' کے حساس قلم کا حسین تحفہ ''تیرے میرے بیچ'' ۔ ''جادو ہے نشہ''۔ ''اتھری گھوڑی۔'' کمال ہے حنا۔ ''وقاص حسن کی'' درگور محبت'' ۔ ''انصاف'' ۔ ''دیر لگی آنے میں'' بہت کمال کی تحریریں رہیں۔ ''ریحانہ آفتاب'' کی ''راکھ کی کمائی ۔''' ''بند کواڑوں کے پیچھے ۔''' ''اور میں ہار گیا''۔ بہت اچھی اور سبق آموز تحریریں تھیں۔ خاص طور سے ''اور میں ہار گیا۔''' ''حمیرا خان'' اپنے خاص رنگ میں جلوہ گر ہوئیں، ''ماہر'' عادت''۔ آخری پونجی۔'' ویری ویلڈن حمیرا خان۔'' ''کاوش صدیقی'' کی ''خانقاہ''۔ ''سید ملازم حسین شیرازی'' کی ''ڈارلنگ''۔ ''عظمی شکور کی'' ''کمی کہاں رہ گئی'' ۔ ''سعدیہ سیٹھی کی ''اصل پریشانی''' ''فرح انیس'' کی ''نشہ'' ۔''سمیں غزالہ نہاں'' کی ''فتنہ'' ۔ ''فصیحہ آصف خان کی گرہن زدہ''' ''شانی خامان کی ''سلو بھیا۔'' راحت وفا راجپوت'' کی منگتا'' نفیسہ فضل کی ''جوانی دیوانی'' ۔ ''فلک شیر تابش'' کی ''دیالو''' ''اعجاز احمد فکرال'' کی ڈنکر''' ''نسیم سحر کی'' پہنچی وہیں پے خاک'' ۔ ''رانا حبیب الرحمان'' کی ''قوس قزح''' ''سیدہ تبسم زہرا رضوی'' کی ''عشق عالی نصب''۔ نازیہ بتول رضا'' کی ''کانٹوں بھری سیج'' ۔ ''شازمہ خان کی'' ادھوری محبت'' ۔ ''مہوش مہر'' کی ستم در ستم'' ۔ ''سیما عروج صدیقی'' کی ''اور قلم ٹوٹ گیا'' ''نزہت جبیں ضیاء'' کی ''کرب محرومی''' ''مجید احمد جائی'' کی ''خدا کے چور''' ''سیدہ کاظمی'' کی ''باپ کا گناہ''' ''اعتزاز سلیم'' کی ''غیرت''' ''غلام مرتضی علوی'' کی ''قصوروار کون'' ۔ دلدل، عورت کا دل، امتحان فراڈیے۔ تربیت۔ آزمائش۔ سب کی سب ایک سے بڑھ کے ایک تھیں۔ بہت مزہ آیا۔ مختصر نمبر صرف کہنے کو مختصر نمبر تھا، ورنہ ایک ہی شمارے میں اتنے سارے مصنفین کی اس قدر اعلی اور معیاری تحریریں دریا کو کوزے میں بند کرنے والی بات تھی۔ اچھا جی اب اجازت چاہتی ہوں۔ اگلے شمارے کے تبصرے کے ساتھ پھر حاضر خدمت ہوں گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔''

☆ پیاری بہن! آپ کا تبصرہ بہت زبردست رہا۔ یقین جانیں پوری محنت وصول ہوگئی۔

☆ حیدرآباد سے یہ پہلی آمد ہے فاطمہ لودھی کی۔ لکھتی ہیں۔'' آپ کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اس امید پر کہ آپ پذیرائی کریں گے۔ اصل میں مجھے مجبوراً اس محفل میں آنا پڑا۔ اس کی وجہ مختصر کہانی نمبر ہے۔ کیا بات ہے سر جی۔ آپ تو ستاروں پر کمند ڈال رہے ہیں۔ لوگ تو بس دعویٰ ہی کرتے ہیں۔ مگر آپ ماشااللہ کر دکھاتے ہیں۔ میں کافی عرصے سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں، مگر محفل میں شرکت پہلی بار کر رہی ہوں۔ کیا کرتی، مجھ سے رہا ہی نہیں گیا۔ اتنا اچھا شمارہ اور اتنی اعلی پائے کی تحریریں اور سب کی سب ایک ہی شمارے میں۔ میں تعریف نہ کروں تو یہ زیادتی ہوگی۔ آپ کے ساتھ بھی اور لکھاریوں کے ساتھ بھی۔ لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کس لکھاری کا نام لوں اور کسے چھوڑ دوں؟ کس تحریر کو اول نمبر پر رکھوں اور کسے درجہ دوم پر۔ کیونکہ میری نظر سب ہی نے خوب لکھا اور جم کر لکھا۔ اس شاندار کاوش پر آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن ایک گلہ ہے کاشی سر کی شمارہ بہت لیٹ ملتا ہے۔ پہلے تو مہینے کے شروع کی تاریخوں میں ہی مل جاتا تھا،

مگر اب تو انتظار میں آنکھیں ہی تھک جاتی ہیں۔اس بار بھی مجھے شمارہ چودہ تاریخ کو ملا۔ پلیز، اس بارے میں ذرا غور فرمائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔اب اجازت دیں۔زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی انشااللہ۔“

✽ اچھی بہن! خوش آمدید! تبصرہ بہت اچھا کیا تم نے اب ہر ماہ احوال میں آپ کی شرکت ہونا چاہیے۔

☆ گجرات سے اسداللہ پہلی بار شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں۔” کیا کہوں، اور کیسے کہوں۔آپ تو ہر بار کمال کر دیتے ہیں۔ایک کے بعد ایک خاص نمبر۔عشق نمبر، پراسرار نمبر، ایوارڈ نمبر اور اب مختصر کہانی نمبر۔آپ کی زنبیل میں تو لگتا ہے ابھی بہت سے خاص نمبرز پڑے ہیں سر۔اور ہمیں ان سب کا شدت سے انتظار ہے پلیز۔ہمیں ایسے ہی اچھے اچھے شمارے دیتے رہیں۔ہم آپ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہیں گے۔اب ذرا بات ہو جائے شمارے کی۔مئی کی جھلسا دینے والی گرمی میں مختصر نمبر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔اتمام بے مثال شمارہ نکالنے پر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہماری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔شمارے میں اداریے سے لے کر، تیر نیم کش تک، ایک ایک لفظ جیسے موتی پرویا ہوا تھا۔لکھنے والوں کی محنت اگر اپنے منہ سے بول رہی تھی تو، اسے سجانے سنوارنے والے ہاتھوں کا ہنر بھی ان تحریروں کو چار چاند لگا رہا تھا۔جزاک اللہ خیر۔کاشی بھائی۔سلامت رہیں۔اور ایسے ہی شاندار تحفے ہمارے لیئے لاتے رہیں۔اب اجازت چاہتا ہوں۔اگلے ماہ اگر شمارہ وقت پر مل گیا تو تبصرہ بھی مکمل اور جامع کرونگا، کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ تبصرے کے چکر میں کہیں وقت ہی نہ نکل جائے اور میرا خط احوال میں شامل ہی نہ ہو سکے۔اس لیے فی امان اللہ۔“

✽ پیارے اسد! خوش آمدید اور اگلے تبصرے کے لیے تمہیں قطعاً کوفت نہیں اٹھانا پڑے گی۔

ساتھیو! اس خط کے ساتھ ہی اس ماہ تک ہماری آپ کی ملاقات اختتام تک پہنچی ایک بار پھر رمضان اور پیشگی عید مبارک۔اور اس کے ساتھ ہی ایک اور خبر آپ کو دیتے چلیں۔بہت جلد ہمارے اور آپ کے درمیان ہمارے سابق ایڈیٹر ناصر رضا ہمارے ساتھ ہوں گے۔امید ہے اس خبر کے ساتھ ہی آپ کی عید کی خوشیاں مزید دوبالا ہو جائیں گی۔اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔

## فریاد

ڈھیلہ ڈھیلہ ریت ہوا
جب جیون میرا بھادوں میں
ہانک دیا آکاش نے مجھ کو خشک ندی کے پاٹوں میں
اشکوں سے پھر رستوں کو میں نے کیا تھا رام
بارش نے بھی آخری ہچکی لے کے لیا مجھے تھام
گیلے بدن سے جھونکے لے کے
اِک پکھیرو دور چلا تھا
گلے پڑی تھی اس کے ست رنگی مالا کی دیپ
جنگ کواڑ کے پیچھے میرے......
اور امن کا راگ
پرزہ پرزہ آنتک وادی بن کے کرے فریاد
چلتے پھرتے لوگ تماشا دیکھ کے ملتے ہات
ہلکا ہلکا دھواں بھرے اس روشن دن کے ساتھ
نیل سمندر کے نیچے سے آتی ہے آواز
اِک سندوری شام کا دن بھی کر دو میرے نام
دھوپ کی کنڈلی سے جل بھن کے روئے ہے اک یاد
پربت پربت گھاس لگا دو
وقت کو دے دو مات
ڈھیلہ ڈھیلہ ریت یہ جیون
خشک ندی میں کھو جانے دو
دنیا اپنی ہو جانے دو
سن لو یہ فریاد!

آپ کا اپنا

کاشی چوہان



نمایاں شخصیات، سچے واقعات

# سرمد سلطان کھوسٹ

ذیشان فراز

## فنکار گھرانے کا وہ سپوت جس نے اپنے فن سے اک جہان کو حیران کر دیا

بین الاقوامی طور پر مقبولیت پانے والا فنکار گھرانے کا چشم و چراغ جسے ہم اپنا روشن فنی مستقبل کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ عرفان کھوسٹ کے صاحبزادے جنہیں لوگ 'منٹو' کے نام سے جانتے ہیں۔ اپنی بے پایاں فنی صلاحیتوں کے اظہار کے طور پر ہم اگر سرمد کی فلم 'منٹو' ہی کا حوالہ دیں تو بھی سرمد کا سارا فن اس ایک معتبر حوالے میں سمٹ آئے گا ہے۔ سرمد سے ہوئی ان کے ابتدائی زمانے کی ایک ملاقات نذر قارئین۔

پی ٹی وی کے جن فنکاروں نے کم عرصے میں زیادہ شناخت بنائی ان میں سرمد سلطان بھی ہیں۔ سرمد کا ہر ڈراما اس کے لیے چیلنج ہوتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس چیلنج کو لگن اور شوق کے ساتھ پورا کرے۔ سرمد بنیادی طور پر مصنف اور ہدایت کار ہیں۔ ان کا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے اور وہ اداکاری سے زیادہ سیریلز اور انفرادی ڈرامے بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک سال تک پیپسی کی (کمپئن میں کام کیا) ماڈلنگ کی۔ سرمد، عرفان کھوسٹ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے دادا سلطان کھوسٹ بھی اس فیلڈ سے منسلک رہے۔ ان کی والدہ زاہدہ عرفان بھی کافی عرصہ ریڈیو پر کام کرتی رہیں یوں وہ اپنے خاندان کی تیسری نسل میں سے ہیں جو اس فیلڈ میں آئے انہیں شوبز کی فیلڈ سے قطعی دلچسپی نہیں تھی وہ تو ڈاکٹر بننا چاہتے تھے، ڈاکٹر نہ بن سکے تو لکھنا شروع کر دیا، انہیں کتابوں سے گہرا لگاؤ ہے وہ ہر موضوع پر گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔

ایچی سن سے او لیول کرنے کے بعد سرمد نے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی اور پھر سائیکالوجی اور انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا۔ تعلیمی لحاظ سے انہوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور انہیں تین گولڈ میڈل اور اپنے کالج کا بہترین اعزاز رول آف آنرز بھی ملا۔ سرمد نہایت کم گو اور سنجیدہ انسان ہیں۔

سرمد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ثمینہ احمد کی ڈائریکشن میں کام کیا اور بعد ازاں ثمینہ احمد نے سرمد کی ڈائریکشن میں ایک کھیل کیا۔

سرمد میں بڑا اداکار بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ انہیں اردو ڈراموں کی امید سمجھا جاتا ہے اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ انہوں نے لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی لیکن وہ اداکاری سے زیادہ سیریلز بنانے اور کہانیاں لکھنے پر توجہ دے رہے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے کام سے پرستاروں کو چونکا دیں۔ سرمد سے ایک ملاقات آپ کے روبرو ہے۔ یاد رہے یہ ملاقات سرمد کے شوبز میں قدم رکھنے کے ابتدائی دنوں میں ہوئی تھی۔ آج ماشاء اللہ سرمد شادی شدہ اور مانے

ہوئے بین الاقوامی طرز کے اداکار ہیں۔ فلم ''منٹو'' میں اپنے کام سے پوری دنیا کو ہلا چکے ہیں۔

☆ ''اپنے خاندانی اور تعلیمی پس منظر کے بارے میں بتائیے۔ بچپن کیسا گزرا؟''

''میں 9 مئی 1979ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ تین بھائی تین بہنیں۔ ایک بہن شادی شدہ ہیں لیکن تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ میرے والد عرفان کھوسٹ نے لاتعداد ڈراموں اور فلموں میں کام کیا۔ دو فلمیں بھی بنائیں۔ ''ڈائریکٹ حوالدار'' اور ''چن ماہی''۔ انہوں نے کئی ڈراموں

ملتان میں داخلہ ملا۔ میری والدہ تو دس سال سے علیل تھیں۔ ان کی بیماری کی وجہ سے میں لاہور نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر بننے کا ارادہ ترک کر دیا اور پھر بی اے اور ایم اے کیا۔ میرا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا اس لیے مجھے گولڈ میڈل اور جی سی کا سب سے بڑا اعزاز رول آف آنرز ملا جو مجھے بہت عزیز ہے۔ دادا کے حوالے سے میری کچھ یادیں خاص نہیں۔ وہ رائٹر تھے، ایکٹر اور پینٹر بھی تھے۔ انہوں نے فلم اور ٹی وی کے سینکڑوں ڈرامے لکھے ہیں اور ایک فلم ''ناجی'' بھی لکھی۔ ان کا ایک



سرمد سلطان کھوسٹ، اپنے والد عرفان کھوسٹ کے ساتھ

کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ دادا نے بھی اداکاری کی کافی اسکرپٹ لکھے ان کا انتقال 64ء میں ہو گیا تھا۔ والدہ، زاہدہ عرفان کا تعلق ریڈیو سے تھا میں بچپن میں اکثر ان کے ساتھ ریڈیو جایا کرتا تھا۔ ایک کمرے میں بند ہو کر کام کرنا بہت غیر دلچسپ لگتا تھا۔ اس طرح ابا کو بھی میں نے دن رات کام کرتے اور گھر کو کم وقت دیتے دیکھا تو کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا میں اس فیلڈ میں قطعاً نہیں آنا چاہتا تھا۔ ایچی سن سے او لیول کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کیا میرے نمبر میرٹ سے تین یا چار کم تھے اس لیے مجھے لاہور کے بجائے نشتر میڈیکل کالج

اسکرپٹ یادگار کے طور پر میں نے فریم کروایا ہوا ہے۔ ابا کی زندگی کام کے لحاظ سے بہت مصروف گزری اور میں چاہتا تھا کہ خاندان کا تصور ایسا ہو کہ بچے کو والدین وقت دے سکیں۔ اس لیے میں بھی اداکار بننے کا خیال دل میں نہیں لایا تھا۔ نہ والدین نے مجھے کسی خاص شعبے میں جانے کے لیے مجبور کیا۔

کچھ خوبیاں بچپن سے ہی میری شخصیت میں ہیں جو مجھے اپنے والدین سے ملی ہیں۔ مجھ میں صبر اور برداشت بہت ہے۔ کھرا آدمی ہوں۔ سچی بات لوگوں کے منہ پر کہنے سے گھبراتا نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ بڑوں کی عزت کی اور مقابل کو انسان سمجھتا ہوں۔ میری

حتمی کوشش ہوتی ہے کہ اگر میرے بس میں ہو تو لوگوں کے کام آسکوں۔ غلطی کا اعتراف کر لینے میں عار نہیں سمجھتا میں اللہ کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔''

☆''فنی کیریئر کب شروع کیا؟''

''ایف اے میں نے اٹھارہ سال کی عمر میں کر لیا تھا۔ والد کا ایڈورٹائزنگ کا بزنس ہے۔ دوران تعلیم آفس جانے لگا وہاں ہر شعبے میں کام کیا اور اسکرپٹ بھی لکھے اس زمانے میں ہر ملک کا ادب پڑھا اور وہاں بنائی جانے والی فلمیں دیکھیں جہاں بھی گیا وہاں کے لٹریچر کی ٹرانسلیشن انگلش اردو وغیرہ میں تلاش کر کے لاتا تھا اور اس سے بھی میری نالج میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہ شوق ابھی تک جاری ہے۔ میں نے ریڈیو سے ہی اسٹارٹ کیا۔ یاسمین طاہر کا ایک پروگرام کیا تھا پھر فلمی گانوں کا پروگرام ٹاپ ٹین 101 سے کچھ عرصہ تک کیا۔ یہ بی اے کی بات ہے۔ ایم اے کے بعد ایک دن منیزہ آنٹی کے بیٹے عدیل ہاشمی سے ملاقات ہوئی تو اس نے آفر کی اور کہا کہ میں ڈراموں میں کام کیوں نہیں کرتا۔

جواد بشیر نے آڈیشن لیا اور میرا پہلا ٹی وی ڈراما ''رانگ نمبر'' تھا۔ یہ سیریل یونس بٹ نے لکھا تھا پھر جواد سے دوستی ہوگئی اور میں اسے اسسٹ کرنے لگا۔ 99ء کی بات ہے میں نے جواد سے اسکرپٹ لکھنے کی بات کی اس نے ہامی بھر لی اور کہا کہ ٹھیک ہے تم لکھو۔ میں نے پہلا اسکرپٹ ''شاشلک'' لکھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ پہلے اسکرپٹ کی وجہ سے ہی شاباش ملی جس سے بہت حوصلہ بڑھا۔ پھر ہم نے مل کر ٹیم بنائی اور کئی ڈرامے کیے۔ ''دو اور دو چار'' کیا۔ ''اوورکوٹ'' عید پر ایک کھیل تیار کیا۔ سعادت حسن منٹو اور شیکسپیئر کے کئی ڈراموں پر کام کیا۔ پی ٹی وی کے فیسٹیول میں منٹو کے ایک ڈرامے پر مجھے بیسٹ ڈائریکٹر کا ایوارڈ بھی ملا۔ پھر کچھ عرصہ گیپ دیا یعنی صرف اپنے آفس میں ہی کام کیا۔''

☆''آپ کا پہلے اسکرپٹ ''شاشلک'' کی کتنی قسطیں تھیں سنا ہے یہ طویل سیریز پر مبنی تھا؟''

''یہ کامیڈی سیریز تھی ہر دفعہ مختلف کہانی ہوتی تھی اس کی 101 قسطیں چلیں اور ناظرین نے عمدہ رسپانس دیا۔''

☆''اس کے بعد جب کام شروع کیا تو کیا کام کیا؟''

''پیپسی کی اشتہاری مہم میں معاونت کا موقع ملا پورا ایک سال کمپین، نائٹ ٹرانسمیشن کی کمپیئرنگ کی۔ ''سیٹ کا، بیوٹی پارلر، ایک کہانی بڑی پرانی'' اور بے شمار سیریلز اور انفرادی ڈرامے کیے کچھ میں کام کیا کچھ ڈائریکٹ کیے کسی کی کہانی لکھی۔ بس اتفاقیہ طور پر ہی میں نے اس فیلڈ میں کام کرنا شروع کیا۔ میری والدہ دس گیارہ سال سے بیمار تھیں ان ہی کی وجہ سے میں نے ملتان نشتر کالج میں داخلے کے باوجود ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور جب شوبز کی فیلڈ میں آیا تو کام کے ساتھ محبت ہوگئی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ڈائریکشن کا عمل اس قدر تخلیقی ہوتا ہے۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ اس میں روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر تبدیلی پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔ اپنی معلومات اور مشاہدات لوگوں تک منتقل کرنا ایک دلچسپ کام ہے مجھے یہ سب کرنا اب بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

☆''آپ نے اب تک جس قدر کام کیا اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟''

''مطمئن تو خیر میں نہیں ہوں میں نے اب تک جو کچھ بھی کیا وہ سمندر کے قطرے کے مترادف تھا لیکن دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کے لیے۔ یہ ایک قطرہ بھی بہت اہم ہوتا ہے ہم اگر (مسکرا کر) قطرہ بھی جمع کریں تو سمندر بن سکتا ہے۔ دنیا میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنے کام میں مہارت پیدا کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے اور یہ کام شوق اور لگن کے بغیر ممکن بھی نہیں تھا۔ اب مجھے ڈرامہ کافی حد تک سمجھ آگیا ہے۔ ''دو اور دو چار'' اچھا ڈرامہ تھا۔ ''مائے نی میں کینوں آکھاں'' پی ٹی وی فیسٹیول میں شامل ہوا تھا، یہ پورے ملک کے 26 منتخب ڈراموں میں سے ایک تھا۔ پچاس منٹ کے دورانیہ کے کھیل میں دو کردار تھے۔ ثمینہ احمد اور میں، دو کمروں میں ہم نے ڈرامہ مکمل کر لیا تھا۔ جسے فیسٹیول میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہمیں اس ڈرامے کے پیسے بھی ملے، نام بھی ملا اور اچھا رسپانس بھی۔ اس کا فیسٹیول میں شامل ہونا ہی میرے لیے اعزاز کی بات ہے یہ کم خوشی کی بات نہیں کہ 26 ڈراموں میں سے ایک میرا ڈراما

سلیکٹ کیا گیا۔“

☆ ”آپ نے یہ ڈراما خود ڈائریکٹ کیا تو ثمینہ جیسی سینئر فنکارہ نے آپ کی ڈائریکشن میں کام کرنا کیسا محسوس کیا میرا مطلب ہے آپ کے ساتھ تعاون کیا یا پھر......؟“

”ثمینہ آنٹی، قوی خان اور ایک آدھ دوسرے ٹی وی فنکار ہمارے فیملی ممبرز کی طرح ہیں۔ جب میں نے کام شروع کیا تھا اور مجھے اداکاری کی الف ب نہیں آتی تھی تب بھی ثمینہ آنٹی نے میرا ساتھ دیا اور اسی طرح میری بات مانتی تھیں اور جب میں نے انہیں لے کر ڈراما تیار کیا تب بھی انہوں نے میرا مان رکھا اور مجھے میرے چھوٹے ہونے کا احساس نہیں دلایا۔ دراصل یہ ہمارے سینئرز کا بڑا پن ہے جو اپنے جونیئرز کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کی سرپرستی کی وجہ سے میں آج اس مقام پر ہوں میں جو کچھ بھی ہوں ان ہی سے سیکھا ہے۔ اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔“

”میں ایک وقت میں اتنا ہی کام کرنا چاہتا ہوں جو میرے ناظرین شوق سے دیکھیں اور جسے میں آسانی کے ساتھ مکمل کرسکوں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ویسے بھی مقابلے کا رجحان ہے۔ ہمیں چیلنج کا سامنا ہے اسی لیے



میری کوشش ہے کہ جو مواقع ملیں ان کو پوری طرح استعمال کروں تاکہ ناظرین کو ہر مرتبہ نئی چیز دکھا سکوں۔“

☆ ”کسی کھیل کی تیاری میں ہدایت کار کو کن چیزوں پر توجہ دینی چاہیے؟“

”سب سے اہم بات رسک لینا ہے کیونکہ اگر ہم



نئے تجربے کرنے کا رسک لیں گے تو کامیابی ہوگی کیونکہ عوام نیا پن پیدا کرنے سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں رسک لینے کی روایت نہیں ہے۔ رسک تب لیا جاتا ہے جب آپ مضبوط اعصاب کے مالک ہوں مگر ہمارے ہاں لوگوں کی اکثریت رسک لینے سے ڈرتی ہے۔ نئے تجربے کوئی نہیں کرتا کیونکہ ان کے خیال میں اگر نئے تجربے کرنے کا رسک لیا جائے تو پیسہ ڈوب جائے گا۔ پوری دنیا میں میکنگ، پروڈکشن، لوکیشن، موسیقی میں سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ ضروری سمجھی جاتی ہے وہ کاسٹ ہے کیونکہ میرے خیال میں نیا پن کاسٹ سے ہی پیدا کیا جاسکتا ہے اور کاسٹ میں رسک لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو یہ رسک لینے میں جھجک محسوس نہیں کرے گا وہی ترقی کرے گا۔ انگلش اور بھارتی فلم میکر یہ رسک بڑھ چڑھ کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کاسٹ کے لیے نئے چہروں پر اعتماد کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا بیک گراؤنڈ کی وجہ سے تو چانس مل جاتا ہے خالصتاً ٹیلنٹ کی بنا پر بھی نئے چہروں کو آزمانے کا رسک نہیں لیا جاتا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں نئی نسل کی صلاحیتوں سے انکار حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ نئی نسل میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں لیکن انہیں اظہار کے مواقع میسر نہیں۔ اچھا کام کرنے والوں کو لفٹ ہی نہیں کروائی

جاتی۔ سینئرز ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ان کے قیمتی تجربات سے مرتے دم تک استفادہ کیا جاتا ہے مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے اگر ہم سینئرز اور نئے چہروں کو لے کر ایسے ڈرامے تیار کریں، ایسی کہانیوں پر کام کریں جن کے بارے میں لوگوں کو جستجو اور تجسس ہو تو وہ بھلا کیونکر کامیاب نہیں ہوں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہاں کے لوگ ایسے مسائل میں گھرے ہیں جن پر سوچنا بھی فضول ہے۔ خواتین چار کمروں میں رہتی ہیں تو وہ ان چار کمروں کے آگے سوچتی ہی نہیں، چھوٹے چھوٹے مسائل کے تانے بانے بنتی رہتی ہیں۔ مرد کی دفتر اور گھر سے آگے سوچ جاتی ہی نہیں۔ دنیا چاند پر جا پہنچی ہے اور ہم پھوپی، ماموں کے جھگڑوں سے باہر ہی نہیں نکلتے تو پھر کام میں بہتری کیسے آئے گی۔ دراصل ہمیں آگے بڑھنے کا شوق ہی نہیں، ہماری سوچ ہے بچے کو صرف ڈاکٹر، انجینئر بنانا ہے اور کچھ نہیں حالانکہ ان میں سے بہت سے کم عمری میں معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں، وہ سماجی ناہمواریوں، طبقہ بندیوں، محرومیوں اور ناانصافیوں پر بہتر سوچ رکھتے ہیں۔ اہم بات کام سے محبت اور کام سے لگن رکھنے کی ہے۔ شعبہ خواہ کوئی بھی ہو انسان عزم اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے، انجینئر ڈاکٹر بنے بغیر بھی۔

اب میں اس فیلڈ میں آیا ہوں تو میرے اندر فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ میں نے کچھ پاکستانی اور انڈین پرانی فلموں کے علاوہ ایران، جاپان، چائنا، اٹلی کی فلمیں دیکھی ہیں۔ مختلف ممالک کی موویز اور کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ مجھے وہاں کے کلچر کا پتا چلتا ہے۔ اس سے میرے اندر آگاہی پیدا ہو رہی ہے اور میں ان تجربات سے فائدہ بھی اٹھاتا ہوں۔ پوری دنیا میں اتنا اچھا کام ہو رہا ہے، وہاں سینما کو عروج حاصل ہے۔ ہمارے ہاں ٹی وی اہم ہے اگر ہم اپنی سوچ میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو کام میں بہتری پیدا ہو گی چھوٹے چھوٹے مسائل کم ہوں گے۔ ٹی وی سے آگے بھی ایک دنیا ہے۔ آسکر ایوارڈ کے خواب دیکھنا بری بات نہیں ہے لیکن اپنی سوچ کو آسکر ایوارڈ تک محدود کر دینا صحیح نہیں ہے۔"

☆"اس فیلڈ میں اپنے والد کی وجہ سے بھی آپ کو اہمیت ملی ہو گی؟"

"اس میں شک نہیں کہ ایسا ہوا، ابا کے ملنے والوں نے مجھے خوش آمدید کہا لیکن پروڈیوسر، رائٹر یا اداکار صرف کام کے بل بوتے پر ہی چلتا ہے، سفارش یا تعلقات آپ کو کسی چینل تک لے جا سکتے ہیں۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں مدد ہرگز نہیں کر سکتے۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے ابا کی سپورٹ حاصل ہے لیکن میری اپنی محنت اور صلاحیتیں، میری کامیابی میں شامل ہیں۔ کیونکہ سفارش کی بناء پر آپ کو ایک یا دو مرتبہ کام مل جائے گا مگر تیسری مرتبہ پروڈیوسر آپ کو خود آؤٹ کر دے گا۔"

☆"اگر آپ کی کارکردگی کا آپ کے والد کے کام سے موازنہ کیا جائے تو؟"

"ابا تو خیر ابا ہیں، ان کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے میں اور وہ کبھی ایک لیول پر نہیں آ سکتے۔ ان کا کام مجھ سے زیادہ ہے اور بہتر بھی۔"

☆"وہ آپ کے کام پر تنقید کرتے ہوں گے؟"

"کبھی نہیں، وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ جو بھی کرنا ہے اپنے طور پر کرو۔ انہوں نے میرے کام کے حوالے سے کبھی زیادہ بات نہیں کی۔ نہ اپنے تجربات سے مجھے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی ان کا بڑا پن ہے کہ وہ بچوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔"

☆"آپ کو ان کا کون سا کردار بہت اچھا لگا؟"

"اندھیرا اجالا" کا کردار مجھے ہی نہیں اکثریت کو اچھا لگا تھا۔ خاصا پاورفل کردار تھا اور اس میں انہوں نے حقیقت کا رنگ بھرا، پھر اس ڈرامے کے بعد لوگوں نے اس قدر واہ واہ کی، اس طرح ان کے کافی ڈرامے داد طلب تھے اور ان کا رسپانس بھی اچھا ملا۔"

☆"آپ فراغت میں کیا کرتے ہیں کوئی خاص مشغلہ؟"

"مجھے تھوڑی فرصت ملتی ہے تو میں کتابیں پڑھتا ہوں، فلمیں دیکھتا ہوں، یعنی اپنے کام کے حوالے سے ہی جستجو مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میرے پاس کتابوں کا ذخیرہ ہے ہر موضوع پر میرے کمرے میں میرا سامان کم، کتابیں زیادہ ہیں ہر طرف کتابیں ہی



سرمد سلطان کھوسٹ اپنی ساتھی اداکارہ ماہرہ خان کے ساتھ

کتابیں ہیں اگرچہ میرا کمرا کوئی بہت بڑا نہیں ہے لیکن میرے اردگرد آپ کو ہر طرف کتابیں ملیں گی۔''

☆ ''کس قسم کا لٹریچر شوق سے پڑھتے ہیں؟''

''میں نے مختلف ادوار میں مزاج کے مطابق کتابیں منتخب کیں۔ اسکول سے لے کر بی اے تک انگریزی کلاسک، فلسفہ، سائیکالوجی، پھر اس فیلڈ میں آیا تو سوچا کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ بانو قدسیہ، منٹو، خواجہ غلام عباس اور اپنی لوکل علاقائی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ پھر ایرانی ادب، چائنا، جاپان، اٹلی کا ادب جہاں جاتا ہوں وہاں کے لٹریچر کی ٹرانسلیشن لے کر آتا ہوں۔ فلم کی تکنیک کے حوالے سے ان کی موویز دیکھتا ہوں۔ مجھے ٹیگور پسند ہے، بنگالی ادب من کو بھاتا ہے۔''

☆ ''کسی کام کو کرنے سے پہلے مشاہدہ ضروری سمجھتے ہیں؟''

''جی ہاں سو فیصد۔ اب میں پرسنل ڈرائیور رکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کیونکہ ڈرائیونگ کے دوران میں ہر چیز کا بغور مشاہدہ کر رہا ہوتا ہوں۔ ادھر سے شارٹ لوں تو کیسا رہے گا، ہر چیز دیکھتا ہوں کہ لائٹ کیسی پڑ رہی ہے، اپنے کام کے حوالے سے اٹھتے بیٹھتے سوچنے کا عادی ہوں۔ کردار کا تاثر دینے کے لیے کیمرہ مین کو بتا سکوں کہ کس زاویے پر کیمرہ رکھیں گے تو کردار کا صحیح تاثر ملے گا کیونکہ اچھا بویا جائے تو اچھا پھل ملے گا۔ ہر شخص کے اپنے تخلیقی جوہر ہوتے ہیں اور اس کام میں کوئی بڑی عمر تو نہیں ہے لیکن شوق اور جستجو ضروری ہے کیونکہ یہ کام محنت طلب ہے اور جدوجہد کے بغیر ہم اچھا کام نہیں دے سکتے۔ پھر سیریل تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اس کے لیے مطالعہ اور مشاہدہ دونوں چیزیں مجھے ہر دم متحرک رکھتی ہیں۔ میں ہر قسم کے لوگوں سے ملتا ہوں تو یہ سب تجربے، کام کے دوران میرے مددگار ہوتے ہیں۔ پھر میں مختلف ممالک سے کتابیں اور فلمیں لے کر آتا ہوں ان سے بھی استفادہ کرتا ہوں۔ اتنا کام کرنے کے باوجود مجھ میں سیکھنے کی لگن بڑھ رہی ہے۔ میرے اندر ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے ابھی مجھے فن اداکاری میں بہت آگے جانا ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

☆ ''آپ پروڈکشن کی فیلڈ میں کام کر رہے ہیں تو لوگوں کو کیسا پایا؟''

''مجھے یہاں کے ماحول اور کام کے طریقہ کار سے بہت دھچکا لگا ہے۔ یہاں ہر کوئی کام پر دیر سے آتا ہے کوئی نظم و ضبط نہیں لیکن جب میں کوئی سیریل سائن کرتا ہوں تو اس کا مکمل ذمہ دار بن جاتا ہوں۔ میرا کام لینے کا اپنا طریقہ ہے۔ نئے لوگ اس معاملے میں کافی تعاون کرتے ہیں۔ جدوجہد اور محنت سے کام کو اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ وہ تاریخیں دینے کے معاملے میں بھی نخرے نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس میدان میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں شاید اسی لیے اپنے سیریل ''تماشا گھر'' کے لیے نئے لڑکے کو مصنف کے طور پر چانس دیا ہے۔''

☆ ''اب جب کہ آپ ڈائریکشن میں آ گئے ہیں تو اپنے ساتھیوں کو سکھانا کیسا لگ رہا ہے؟''

''زندگی میں کسی کی مدد کرنا، اس کی شخصیت میں علمیت پیدا کر کے اس کے فن کو نکھارنا سب سے ولولہ

انگیز کام ہے۔ کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ حیرت کی بات کیا ہو کہ اس کی نالج سے استفادہ کرنے والے اس پر سبقت لے جائیں۔ یہ تعلق تو بہت ہی خوشی دیتا ہے کہ ایک فرد اپنی معلومات، اپنا تجربہ، علم اور مشاہدہ دوسروں تک منتقل کرتا ہے۔ میں نے جو کچھ اپنے بزرگوں اور سینئرز سے سیکھا ہے اسے سکھانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ مجھے زندگی میں جب بھی موقع ملا بحیثیت استاد کے کام کروں گا کیونکہ ڈائریکشن بھی اس سے ملتا جلتا کام ہے۔ مجھے تدریس کے شعبے میں کام کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔''

☆''کیسا رسپانس مل رہا ہے؟''

''اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ اگر میری بات کوئی سمجھتا ہے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ آج زندگی کے اس مقام پر ہوں جہاں مجھے تمام خوشیاں حاصل ہیں جس کی ہر کوئی تمنا کر سکتا ہے۔''

☆''پروڈکشن میں آنے کے بعد آپ نے اداکاری ترک کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''میں یکسوئی سے کام کرنا چاہتا ہوں، اس لیے اپنی پروڈکشن کے کسی بھی پلے میں کام نہیں کرنا چاہتا۔ میں اداکاری برائے اداکاری کا قائل نہیں ہوں۔ ایسا پروجیکٹ ہونا چاہیے جو حقیقت میں مجھے اداکاری پر اکسائے تو ضرور کام کروں گا۔''

☆''معاوضوں کے بارے میں بتائیں؟''

''ماڈلنگ میں پیسہ زیادہ ہے، ہمیں عادت ہے ڈھیر سارا کام کر کے پیسہ کمانے کی، جب تھوڑا کام کر کے زیادہ پیسہ ملتا ہے تو شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ میں محنت کر کے کمانے پر ایمان رکھتا ہوں۔ پیپسی کولا کی ایک سال تک کمپئن کی۔ پر کشش معاوضہ ملا ماڈلنگ میں پیسہ زیادہ ملتا ہے۔''

''کس کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟''

''کئی لوگ ہیں جن کے ساتھ کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ نادیہ افگن شروع سے ٹیم میں ہیں اچھا کام کرتی ہیں دوسروں کے لیے مسائل بھی پیدا نہیں کرتیں تو ان کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوتی ہے۔

☆''اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟''

''کوئی خاص نہیں، مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ صحت، کھانے، پینے کے باوجود سیٹ رہتی ہے۔ مثلاً میں کھانے کا شوقین ہوں بریانی شوق سے کھاتا ہوں، چائنیز تین ٹائم کھانے کو ملیں گے تو کھا لوں گا۔''

☆''پی ٹی وی سے ابتدائی طور پر جو سیریلز پیش کیے گئے وہ معیاری تھے موجودہ دور میں ہم پہلے جیسا معیار قائم رکھنے میں ناکام کیوں ہیں؟''

''اس میں شک نہیں کہ پی ٹی وی نے ابتدائی طور پر معیاری سیریلز دیے لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ انہوں نے صرف معیاری سیریلز ہی دیے، کئی ایسے تھے جو غیر معیاری بھی تھے اگر پی ٹی وی نے تیس سال میں تیس اچھے سیریلز دیے تو ہر سال میں ایک اچھا سیریل پیش کیا۔ اس وقت لوگ پی ٹی وی دیکھنے پر مجبور تھے۔ اب کئی چینلز ہیں، کام میں ورائٹی ہے، نیا پن ہے، کچھ تبدیلیاں ہیں ان میں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر معیاری کام ہو رہا ہے۔ آج بھی معیاری کام ہو رہا ہے۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نئے چینلز جب آئے تو وہ اپنے ارد گرد چلنے والے بڑے پروگراموں کے اثرات کی زد میں آ گئے پھر نجی سیکٹر میں وسائل کی کمی نے مزید حالات خراب کر دیے۔ یہاں فلم ہو یا ڈراما جب ماہرین کے ہاتھوں سے نکل کر غیر پیشہ ور اور دودھ فروخت کرنے والے کے ہاتھوں میں جائے گا تو انجام غیر معیاری کی صورت میں ہی نکلے گا۔ پھر ایک طبقے نے ہمسایہ ملک کے گلیمر سے متاثر ہو کر ان کی پیروی شروع کر دی ہے، حالانکہ میرے خیال میں ان ڈراموں میں کہنے سننے کو کچھ بھی نہیں۔ وہ لوگ ان کے پیچھے لگ کر اپنی شناخت بھی کھو رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کام بڑھا ہے تو اس میں نیا پن بھی آیا ہے۔ اب ایکٹنگ کا اسٹائل بدل گیا ہے۔ اگر پاکستان کو بنے 70 سال ہوئے ہیں تو یہ ایک قوم کی تاریخ میں کچھ بھی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کن حالات اور وسائل میں کام کر رہے ہیں۔ تنقید برائے تنقید سے ہٹ کر ہمیں اپنے کام میں بہتری پیدا کرنا ہوگی۔''

☆☆☆

ان ہستیوں کی کہانیاں جن کے دم سے اسٹیشن اور پلیٹ فارم کی رونقیں آباد ہیں
لال وردی میں زندگی کا بوجھ ڈھوتے قلیوں کی اچھوتی داستانیں



# چنے کرارے

اریبہ نورین

ریلوے اسٹیشن کے ایک خوانچہ فروش کی سچی ایمان افروز داستان

''چنے کرارے پہاڑی بھورا ے!!!'' ٹرین جیسے [illegible] بھورا ے کی آواز سے ڈبہ گونجنے لگا تھا۔
ہی مچھ اسٹیشن پر آ کر رکی [illegible] چنے کرارے اور پہاڑی [illegible] میں جو سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں



بند کیے بیٹھا تھا اب دائیں بائیں دیکھنے لگا تھا۔ باہر جہاں تک نظر جا رہی تھی بس بھورے رنگ کے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ کہیں سخت چٹانوں کے پہاڑ تھے تو کہیں بھربھری مٹی اور چھوٹے پتھروں سے مل کر بنے ہوئے تھے۔ کہیں اکا دکا سبز درخت نظر آ رہے تھے ورنہ کہیں بھی سبزہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن تقریباً ویران ہی پڑا تھا۔ نہ مجھے کھانے کا کوئی سٹال نظر آیا تھا اور نہ ہی دو چار لوگوں کے سوا کوئی اور نظر آیا تھا۔ رینجر کے جوان الرٹ ڈیوٹی نبھا رہے تھے۔ سبی اسٹیشن کے بعد یہ دوسری چیکنگ تھی۔ جو کتوں کے ذریعے ہو رہی تھی۔ رینجرز کے دو جوان تھے جو کتوں کے ساتھ ایک ایک سیٹ اور برتھ کی چیکنگ کر رہے تھے۔ اور مجھے جو لوگ ڈرا رہے تھے اس سفر پر آنے سے پہلے اب یہ سب حالات دیکھ کر مجھے ان کی سب باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں۔

دراصل میں یہ سفر اپنی کمپنی کے ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں کر رہا تھا۔ اور جب میں نے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو بتایا تھا کہ میں کوئٹہ جا رہا ہوں کام کے لیے تو سب نے میری پرزور مخالفت کی تھی کہ وہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور تم نے کسی صورت نہیں جانا۔ گھر والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تم یہ جاب ہی چھوڑ دو۔ (یہ اس سے دس دن پہلے کی بات ہے جب پولیس ٹریننگ کیمپ پر حملہ ہوا تھا اور پھر اس سے کچھ دنوں بعد ایف سی کی جوانوں کو جناح روڈ پر شہید کیا گیا تھا۔)

کیونکہ میں نے جس دن گھر والوں سے جانے کی بات کی تھی اس سے دو دن پہلے تین چار قتل ہوئے تھے۔ اور گھر والوں نے اس کی خبر ٹی وی نیوز پر سن لی تھی۔ اور پھر ساتھ ہی وہ جس جس سے ذکر کرتے تھے وہ پانچ چھے باتیں اور ساتھ لگا کر بتاتا تھا کہ وہاں پر تو پنجابی کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔ جو پینٹ شرٹ پہنتا ہے اس کو گولی مار دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جتنا ہو سکتا تھا لوگوں نے اتنا میرے گھر والوں کو ڈرا دیا تھا۔ اور گھر والے کسی بھی صورت اس بات پر راضی نہیں ہو رہے تھے کہ میں کوئٹہ جاؤں۔ بہر حال گھر والوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود میں نے ان کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔ اور یہ سفر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ہاں میں نے یہ کیا تھا گھر والوں کی تسلی کے لیے کہ کپڑوں کے دو تین سوٹ سلوا لیے تھے۔ جتنے بھی لوگ مجھے اس سفر پر جانے سے منع کر رہے تھے۔ مجھے اتنی ضد ہو گئی تھی اور میں جا کر دیکھنا چاہتا تھا کہ لوگ جو قصے کہانیاں سناتے ہیں وہ سب سچ ہیں کہ خود سے بنائی گئی کہانیاں ہیں۔ اور پھر جب میں علامہ اقبال ایکسپریس کی ٹکٹ بک کروانے لگا تو پھر مخالفت شروع ہوئی کہ اس کے ٹکٹ نہیں کروانا اس پر حملے بہت ہوتے ہیں۔ تم دوسری ٹرین کا ٹکٹ کرواؤ۔ اور پھر میں نے خاموشی سے دوسری ٹرین کا ٹکٹ کروایا تھا۔ اب ہر کام میں بھی اپنی مرضی نہیں کرنی چاہیے۔ کوئٹہ کی طرف بس دو ہی ٹرین جاتی تھیں۔ ایک علامہ اقبال ایکسپریس اور دوسری اکبر بگٹیا یکسپریس اور کراچی سے صرف ایک ٹرین آتی تھی بولان ایکسپریس۔ یعنی کہ کوئٹہ میں کل تین ٹرین آتی تھیں۔

مچھ اسٹیشن سے ایک اور انجن پچھلی طرف سے جوڑا گیا تھا لوگوں کہ کہنے کے مطابق۔ کیونکہ میں گھر والوں سے وعدہ کر کے نکلا تھا کہ کسی بھی اسٹیشن پر نہیں اتروں گا۔ کیونکہ لوگوں کے مطابق وہاں پر حملہ کر دیتے ہیں پنجابیوں پر۔ اب جو لوگ بتا رہے تھے اندر بیٹھ کر میں اس پر ہی یقین کر رہا تھا کہ یہاں سے آگے اونچائی شروع ہو جاتی ہے اس لیے ٹرین کے ساتھ دو انجن جوڑے جاتے ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹرین وہاں سے چل پڑی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اسپیڈ پکڑنے لگی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر ٹرین ایک دفعہ پھر رواں ہو گئی تھی۔ باہر پہاڑوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اور درخت نام کی چیز کبھی کبھی نظر آتی تھی۔ اور اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو وہ تھیں جنگلی بیریاں اور وہ بھی کبھی کبھی نظر آتی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر سر پیچھے سیٹ کی پشت اور ٹرین کے ڈبے کے ساتھ ٹکا لیا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تھی اور میں جو سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ جھٹکے کے ساتھ آگے کی طرف گیا تھا۔ گرنے سے بڑی مشکل سے بچا

تھا اور اب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا دوسرے لوگوں کی طرح کہ آخر ہوا کیا ہے؟

کافی دیر گزر گئی تھی لیکن ٹرین تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اور پھر لوگ ٹرین سے اترنے لگے اور پھر کافی دیر بعد اڑتی اڑتی خبر میرے کانوں تک پہنچی تھی کہ ٹرین کا اگلا انجن خراب ہو گیا ہے اور اس نے بریکیں جام کر دی ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سننے میں آیا کہ پچھلا اسٹیشن سے جب نکلے تھے تو انجن تب ہی مسئلہ کر رہا تھا۔ ان کو چاہیے تھا کہ وہاں پر ہی تبدیل کر لیتے لیکن ریلوے والوں نے بھی عوام کو ذلیل کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کچھ لوگ کافی غصے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

کافی دیر گزر گئی اس کے بعد پھر خبر آئی کہ بندے انجن ٹھیک کر رہے ہیں اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹرین نے وسل دی تھی اور سب لوگ سوار ہونے لگے تھے۔ اور پھر ٹرین آہستہ سے رینگی تھی۔ اور پھر ہم سوچنے لگے کہ اب بھی اسپیڈ پکڑے گی اب بھی سپیڈ پکڑے گی لیکن ٹرین کی اسپیڈ نہیں بڑھنی تھی سو نہ بڑھی۔ جوں کی رفتار سے بس تھوڑی زیادہ تھی اور اس کا اندازہ اسلیے ہو رہا تھا کہ رینجرز کا جوان باہر پیدل چل رہا تھا اور اس کی سپیڈ بھی ٹرین سے زیادہ تھی۔

ٹرین کا سارا کنٹرول کیونکہ اگلے انجن میں تھا اس لیے اس کے خراب ہوتے ہی پچھلا انجن بھی بے بس ہو چکا تھا۔ ایک وہ چڑھائی چڑھ رہا تھا اور دوسرا جام انجن کو بھی دھکیل رہا تھا اس لیے ٹرین کی سپیڈ نہیں بڑھ رہی تھی۔

دو گھنٹے کا سفر جوں کی رفتار سے طے کیا تھا اور اب ٹرین ایک اسٹیشن پر جا کر رک گئی تھی۔ ٹرین جیسے ہی اسٹیشن پر جا کر رکی تھی پہاڑی کھجور اور چنے کرارے کی آواز ایک بار پھر ڈبے میں گونجنے لگی تھی۔ خوبصورت پیکنگ میں بند کھجوریں دس روپے دس روپے کی۔ خوانچے والے سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

کھجور کے پتوں کو بُن کر کر لمبائی کی شکل میں چار پانچ انچ کی پیکنگ تیار کی گئی تھی اور جس قیمت کی وہ بولی لگا رہے تھے۔ اس قیمت میں تو ان کی پیکنگ کی قیمت تک وصول نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے بھی پاس سے گزرتے ہوئے ایک آدمی سے دو پیکٹ خرید لیے تھے۔ کھجور کے لیے کم اور نفیس پیکنگ دیکھنے کے لیے زیادہ۔ میں نے کھجور کے وہ دونوں پیکٹ اپنے بائیں جانب کھڑکی کی طرف سیٹ پر رکھ دیے تھے۔ اور خود باہر اور لوگوں کی طرف دیکھنے لگ گیا جو ٹرین سے باہر نکل کر گھوم رہے تھے۔ چنے کرارے ایک بار پھر میرے پاس سے ہی آواز گونجی تھی۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا تھا جس کے چہرے پر دنیا جہان کی پریشانیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ ہر کیبن اور تقریباً ہر سیٹ پر جا کر آواز لگا تا کہ لوگ اس سے چنے خرید لیں لیکن کوئی بھی نہیں خرید رہا تھا۔ ہر آواز کے بعد جب کوئی بھی نہیں خریدتا تھا تو اس کے چہرے پر مایوسی اور بڑھ جاتی۔۔۔۔۔۔ میری سیٹ کے قریب آ کر اس نے آواز لگائی تھی۔ میرا ارادہ بالکل نہیں تھا چنے خریدنے کا لیکن میرے دل کو پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اس کو روک کر اس سے سو روپے کے چنے خرید لیے تھے۔ اور پھر اس کے بعد جو قوسِ قزح اس کے چہرے پر پھیلی تھی اس کو صرف میں نے ہی محسوس کیا تھا۔ اس نے چنے مجھے دیے تھے اور ایک بار پھر آوازیں لگاتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا اور اس ڈبے سے دوسرے ڈبے میں چلا گیا تھا۔ اور پھر میں نے جیسے ہی کاغذ کے بنے چمچ کو بھر کر منہ میں ڈالا تھا تو میں تعریف کیے بنا نہ رہ سکا تھا۔ کمال کا ٹیسٹ تھا ایسے چنے میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں کھائے تھے اور پھر میں اتنے سارے چنے منٹوں میں کھا گیا تھا۔۔۔۔ اب دل کر رہا تھا کہ وہ دوبارہ آئے اور اس سے اور چنے خریدوں اور اب میں باقاعدہ اس شخص کا انتظار کرنے لگا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا تھا نہ ہی ٹرین کا انجن ٹھیک ہوا تھا اور نہ ہی وہ آدمی دوبارہ اس ڈبے میں آیا تھا۔ ہوا میں ہلکی پھلکی ٹھنڈ تھی جو کوئٹہ میں آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

بی اسٹیشن پر جب ٹرین رکی تھی تو باہر سے آگ جیسی گرم ہوا اندر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی پہاڑی سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ہوا ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔ اب ہوا میں کافی ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ نہ ہی انجن آیا تھا اور نہ ہی وہ

آدمی چنے والا واپس آیا تھا۔لوگ کہہ رہے تھے کہ دوسرا انجن آرہا ہے وہ آئے گا تو گاڑی پھر چلے گی۔۔۔۔۔ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ چنے والا آدمی دوبارہ سے آتا ہوا دکھائی دیا۔اب وہ آواز نہیں لگا رہا تھا اور اس کے چہرے پر اب پریشانی اور مایوسی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔بلکہ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔وہ میرے قریب آیا تو میں نے اس کو روکا تھا اس کے برتن میں بہت کم چنے بچے تھے۔وہ جیسے ہی میرے قریب آکر رکا تھا اسی لمحے میری سیٹ کے سامنے والے برتھ پر بیٹھی فیملی میں سے ایک عورت نے روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے اور کھانے کی دوسری بچی ہوئی چیزوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔اور اس کو پھینکتے ہوئے اس آدمی نے بھی دیکھ لیا تھا۔

''ان کو چار پانچ دن کھانے کے لیے کچھ نہ ملے تو ان کو قدر ہو کہ کھانا ضائع کیسے کرتے ہیں۔'' وہ آدمی ان کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا تھا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا تھا۔میں نے اس سے پوچھا تھا۔''یہ سب چنے کتنے کے ہیں۔'' اس کو شاید یاد تھا کہ میں نے اس سے پہلے بھی چنے خریدے ہیں بولا۔

''صاحب اتنے چنے نہیں کھانے۔'' میں اس کی بات سن کر مسکرایا تھا۔

''نہیں مجھے کچھ نہیں ہوتا تم بے فکر رہو۔''

''بھائی پچاس روپے کے ہیں۔'' اس نے سب چنوں کے پیسے بتائے تھے۔

''ٹھیک ہے دے دو مجھے۔'' میں نے کہا تو وہ میری سامنے والی خالی سنگل سیٹ پر بیٹھ گیا اور چنے ڈال کر دینے لگا۔

''بھائی اگر برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں۔'' میں چنے ڈالتے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

اس کا چنے ڈالتا ہاتھ رک گیا تھا اور وہ میری طرف حیرانگی سے دیکھنے لگا تھا۔

اور پھر کچھ لمحے رک کر اس نے کہا تھا۔''جی ضرور پوچھیے!''

میں نے ایک لمبا سانس لیا تھا اور لفظوں کو ترتیب دینے لگا تھا۔اور پھر میں بولا تھا کہ میں نے جب آپ کو پہلی بار گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دیکھا تھا تو آپ بہت پریشان تھے اور اب آپ کے چہرے پر اطمینان ہے کوئی پریشانی نہیں۔'' میری بات سن کر اس کے چہرے سے حیرانی اور پریشانی کی ایک لہر آکر گزر گئی تھی۔اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

مجھے چنے دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپتے تھے۔

مجھے چنے پکڑا کر اس نے کندھے پر ڈالے کپڑے سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی تھی۔اپنی پشت سیٹ کے ساتھ ٹکائی تھی۔اور ایک گہرا سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔اور کچھ سوچنے لگا تھا۔اور پھر بولا تھا۔

''جن کے پاس کھانا ہے ان کو قدر نہیں ہے اور جن کو قدر ہے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔اگر میں اپنے ماضی کے بارے میں بات کروں تو شاید کوئی ایسا دن ہو جب میں نے اور میرے بیوی بچوں نے تین ٹائم کا کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔جو ہم کو میسر ہوتا ہے اسے ہم میاں بیوی جیسے تیسے کھا لیتے ہیں لیکن بچوں سے نہیں کھایا جاتا ہے۔

نمک مرچ کو پانی میں گھول کر اس میں روٹی ڈبو کر ہری مرچ کے ساتھ سادے پانی میں ڈبو کر تو کبھی پیاز مل گیا تو اس کے ساتھ بچوں کے تو حلق سے نہیں اترتے ایسے کھانے۔ان کو آجا کر ابلے چنے ملتے ہیں جو وہ پتہ نہیں کتنے اچھے سے کھا رہے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ان کو وہ بھی نہیں ملتے۔پورا دن صرف ایک وقت کے کھانے پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔تو کبھی ان کو پورا دن بھوکا رہنا پڑتا ہے اور کبھی وہ بھی میسر نہیں آتا، اور ایسے میں گوشت کھانے کی فرمائش کرنا۔

اور اس کو پورا کرنا کوئی آسان کام تو نہیں۔

پندرہ دن پہلے کی بات ہے میری بیٹی ہمسایوں کے گھر گئی انہوں نے گوشت پکایا ہوا تھا۔میری بیٹی کو دیکھ کر انہوں نے سالن چھپا لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے گھر سے جانے کا کہہ دیا۔میری بیٹی نے جب مجھے رات کو بتایا تو میرے دل پر چھریاں چلی تھیں۔اور میں رو پڑا تھا کہ میں کیسا باپ ہوں کہ میں اپنی بیٹی کی ایک چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔میں بے بس تھا میرے پاس تو گھی خریدنے کے پیسے نہیں تھے تو میں

اسے گوشت کہاں سے کھلا دیتا۔ اس دن کے بعد اس نے ضد پکڑ لی کہ مجھے گوشت کھانا ہے۔ اگر وہ سمجھدار ہوتی تو ایسی خواہش کبھی نہ کرتی حالات کو دیکھ کر۔ لیکن وہ ناسمجھ تھی۔ میں اس کو روز اگلے دن پر ٹال دیتا کہ بیٹا کل لے آؤں گا۔ کل رات جب میں گیا تو اس نے پھر ضد کرنی شروع کر دی اور ساتھ ہی رونے لگی۔ رو وہ رہی تھی اور آنسو میری آنکھوں سے بے بسی کے نکل رہے تھے۔ پچھلی رات میں نے رو کر دعاؤں میں گزاری تھی اور پھر صبح اٹھ کر نماز پڑھی اور روتے ہوئے خدا سے دعا مانگی تھی اور پھر صبح جب دکان کھلی جہاں سے میں ادھار سامان خرید کر چنے لگاتا ہوں اور پھر شام کو اس کے سامان کے پیسے اس کو واپس کر دیتا ہوں۔ اور اگلے دن کے لیے پھر ادھار خرید لیتا ہوں۔ یہ سلسلہ پتا نہیں پچھلے کتنے سالوں سے چل رہا ہے۔

میں صبح اس کے پاس گیا اور اس سے ڈبل سامان اُٹھا لیا۔ میں نے خود سے وعدہ کر لیا تھا کہ آج ہر حال میں اپنی بیٹی کے لیے گوشت لے کر آؤں گا۔

سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کو تیار کرنے میں اس کو دیر لگ گئی اور جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو دو گاڑیاں گزر چکی تھیں۔ اب باقی چار گاڑیاں بچی تھیں۔ دو کوئٹہ کی طرف سے آنی تھیں اور ایک پنجاب اور ایک کراچی کی طرف سے کوئٹہ کی طرف جانی تھی۔ اور پھر وہ تین گاڑیاں آئیں اور چلی گئیں۔ اور چنوں کا ایک حصہ بھی نہیں بکا تھا۔ میں جو آج زیادہ کمانے کے لیے آیا تھا باقی دنوں جتنا بھی نہیں کما پایا تھا۔ پیچھے ایک ٹرین بچی تھی اور میرے پاس ڈھیر سارے چنے۔ جن کے بکنے کی امید نہیں تھی۔ کیونکہ ٹرین تھوڑی دیر کے لیے ہی اسٹیشن پر رکتی ہے۔ اور اتنی دیر میں کبھی بھی میں اتنے سارے چنے فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ میں صبح سے پتہ نہیں کتنی بار رو یا تھا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کر چکا تھا لیکن کوئی بھی دعا رنگ نہیں لائی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں آج گوشت لے کر نہیں گیا تو میں گھر ہی نہیں جاؤں گا۔ خودکشی کر لوں گا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ آنسوؤں کی ایک لڑی اس کے دونوں گالوں پر بہہ گئی تھی۔ تھوڑے وقفے سے وہ پھر بولا تھا۔

''لیکن میرے رب نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میرے رب کو میری حرام موت منظور نہیں تھی۔''

اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی پوری کہانی بیان کر ڈالی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکالا تھا اور اس میں موجود گیارہ ہزار نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ بھائی یہ رکھ لو۔ میں نے پیسے اس کے سامنے کرتے ہوئے اس کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے حیرانگی سے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ اور پھر بولا تھا بھائی میں نے آپ کو اپنی کہانی کسی لالچ اور ہمدردی کے لیے نہیں سنائی بلکہ میں تو اپنے رب کی بڑائی بیان کرنے کے لیے یہ سب کچھ بتایا ہے کہ رب ہمارے کتنے قریب ہے۔ چند آنسوؤں سے ہماری ہر مشکل آسان کر دیتا ہے۔

میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا میں بھائی سمجھ کر آپ کی مدد کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو برا لگا تو یہ ادھار سمجھ کر رکھ لو۔ اس سے اپنا کوئی کام شروع کر لو اور جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو مجھے واپس کر دینا۔ میں تم کو اپنا پتہ دے دیتا ہوں۔ میں نے جلدی سے بات سنبھالی تھی۔

نہیں بھائی مجھے اب ان کی ضرورت نہیں مجھے آج معلوم ہو گیا ہے کہ رب تعالیٰ میرے کتنے قریب ہے اور مجھے جب بھی مشکل پڑے گی میں اس کو پکاروں گا اور وہ میری سن لے گا۔ انسان مدد کر کے احسان جتلا دیتا ہے لیکن رب کی پاک ذات ایسا نہیں کرتی۔

میرا پیسوں والا ہاتھ نیچے ڈھے گیا تھا اور وہ میرے ساتھ سلام لے کر وہاں سے اُٹھ گیا اور میرے سوچنے کے لیے بہت سارے سوال چھوڑ گیا تھا۔ کیا رب اتنے قریب ہوتا ہے؟ کیا وہ اتنی جلدی بندوں کی سن لیتا ہے؟ کیا ٹرین کے انجن کا خراب ہونا اس کی دعاؤں کا اثر تھا؟ کیا رب تعالیٰ اپنے ایک بندے کے لیے ایسے اسباب پیدا کر سکتا ہے؟

وہ چلا گیا تھا اور میں کھڑکی کے کنارے پر بازو رکھ کر اس کے اوپر منہ رکھ کر گہری سوچوں میں ڈوب گیا تھا۔

☆☆☆

دوسری منفرد پلیٹ فارم کہانی

# بوجھ

بنتِ حوا

## اُس قلی کی کہانی، جو زندگی کا بوجھ نہ ڈھو سکا

سردیوں کی اداس اور خاموش رات نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شکیل ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے آخری ٹرین کے آنے کا انتظار تھا جو کہ حسب معمول لیٹ تھی۔ اسے ٹرین کے آنے کا انتظار ضرور تھا لیکن نہ تو اس نے کہیں جانا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی آنے والا تھا۔ دراصل شکیل ایک قلی تھا اس کا باپ بھی ایک قلی تھا اور باپ کے دنیا سے جانے کے بعد جب اس کے کاندھوں پر گھر کی ذمہ داری آئی اس وقت اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی، چار بہنوں کے بعد پیدا ہونے والا شکیل ماں باپ کا ہی نہیں بہنوں کا بھی بے حد لاڈلا تھا۔ اس کے گھر میں پڑھائی لکھائی کا تو خیر کوئی رواج ہی نہیں تھا لیکن لاڈلا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس نے کبھی کوئی ہنر سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اگرچہ اس کا باپ اس کی ہر خواہش پوری نہیں کر پاتا تھا لیکن پھر بھی زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی ماں باپ اور بہنیں اپنی بہت سی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر شکیل کی خواہشیں پوری کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ شکیل کے باپ نے مرنے سے پہلے جیسے تیسے اپنی تین بیٹیوں کی شادیاں کردی تھیں۔ ایک بیٹی اور شکیل باقی رہ گئے تھے۔ جب ایک ٹریفک حادثے میں شکیل کا باپ چل بسا۔ عام طور پر شکیل جیسے بچے جنہوں نے کبھی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھائی ہوتی اس طرح اچانک ذمہ داری پڑنے پر بوکھلا جاتے ہیں اور کام سے جی چراتے ہیں، بوکھلا تو شکیل بھی گیا تھا جب اس کی ماں رضیہ نے اسے بتایا تھا کہ گھر میں کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے اور اب وہ اِدھر اُدھر سے ادھار پکڑ کر گھر چلا رہی ہے۔ شکیل اور رضیہ دونوں جانتے تھے کہ یہ ادھار والا سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا کیونکہ ان کے جاننے والے بھی انہی کی طرح کے تازہ کرنے تازہ کھانے والے لوگ تھے۔ ان کی یہی بڑی مہربانی تھی کہ انہوں نے کچھ دن کے لیے ادھار دے کر اس مشکل وقت میں ان کی مدد کردی تھی اس سے زیادہ کی امید رکھنا بے وقوفی ہی نہیں بلکہ حماقت ہوتی۔

بہت ڈھونڈنے پر بھی جب کوئی کام نہ ملا تو آخر ایک دن شکیل ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ جب زندگی بوجھ بن جائے تو کوئی بھی بوجھ ناقابل برداشت نہیں لگا کرتا اور وہ تو ویسے بھی نوجوان تھا۔ اس دن کے بعد سے شکیل اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان بہت گہرا تعلق بنتا چلا گیا۔

وہ شاید اونگھ گیا تھا ایک طرف گرنے لگا تو نیند سے باہر آیا۔ مسافر خانے کی صورت حال تقریباً ویسی ہی تھی، بچوں کو گود میں لے کر تھپک تھپک کر سلاتی ہوئی دو عورتیں نیند کے خمار سے بوجھل آنکھیں لیے کچی عمر کی تین لڑکیاں اور چار مرد جن میں ایک کی عمر لگ بھگ ساٹھ ستر سال تھی۔



باقی دو تیس پینتیس کے درمیان کے تھے جب کہ چوتھا ان میں سب سے کم عمر اور خوش شکل تھا، دکھنے میں وہ پچیس چھبیس سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ ایک چھوٹا اسٹیشن تھا اور پھر رات کا وقت تھا۔ رات کے وقت وہ بھی سردیوں میں یہاں مسافروں کی تعداد عام طور پر کم ہی ہوا کرتی تھی۔ قلی بھی اکا دکا ہی دکھائی دیتے تھے۔ شکیل بھی یہ سوچ کر آ جایا کرتا تھا کہ رات کے اس وقت اسٹیشن پر اترنے والے مسافروں سے اجرت دن کے مقابلے ذرا زیادہ مل جایا کرتی تھی اور اس ہونے والی ایکسٹرا آمدنی سے زندگی آسان تو نہ ہوتی لیکن کچھ خوشیاں ضرور خریدی جا سکتی تھیں۔

☆.....☆

اپنی گلی میں داخل ہوتے ہوئے شکیل تھکا ہوا ہونے کے باوجود خوش تھا۔ آج اسے جو لوگ ملے تھے انہوں نے اپنی خوشی سے اسے اس کی طے شدہ اجرت سے بھی زیادہ پیسے دیئے تھے اور ان پیسوں کے بارے میں اس نے گھر تک پہنچتے پہنچتے خیالوں ہی خیالوں میں کتنی چیزیں خرید ڈالی تھیں۔ اپنے گھر کے قریب پہنچنے سے پہلے اس نے سائیکل کی گھنٹی کو دو بار بجایا اور اپنے گھر کے برابر والے گھر کی کھڑکی پر نظر ڈالی تو چاند کی روشنی میں دکھائی دینے والے ہیولے کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ گلی سنسان تھی اس کا دل چاہا کھڑکی کے پاس جا کر کوئی بات کرے وہ کھڑکی کے قریب چلا آیا۔

”کیسی ہو؟“ اس نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر سرگوشی میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ کھڑکی کی دوسری طرف کھڑی رانو نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”اتنی دیر سے کیوں آتے ہو میں انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ نیند بھی بہت آتی ہے“ ”رانو“ نے معصومیت سے شکایت کی تو شکیل پھر مسکرا دیا۔

”کیا کروں کام بھی تو کرنا ہے نا، پیسے جمع ہوں گے تو ہماری شادی ہوگی۔“ شکیل نے کہا تو رانو کے چہرے پر شرم کی گلابیاں پھیل گئیں جنہیں وہ اس وقت دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن محسوس کر سکتا تھا۔

"اچھا اب جاؤ اماں جاگ جائے گی۔" رانو نے پھر سے سرگوشی کی۔ شکیل نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ہاتھ دوبارہ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا کاغذ کا لفافہ تھا جس میں گرم گرم مونگ پھلیاں تھیں۔ شکیل نے وہ لفافہ کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان سے رانو کو پکڑا دیا اور اسے خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلا۔

شکیل نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو کچھ ہی منٹوں میں نوری نے دروازہ کھول دیا وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے رانو کے کھڑکی بند کرنے کی ہلکی سی آواز سنی اس کے جسم وجاں پر عجیب سا سرور چھا گیا۔

یہ دو کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل ایک کچا پکا گھر تھا۔ شکیل دائیں طرف بنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اس کمرے میں ایک چارپائی پر اس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ باپ کی زندگی میں یہ شکیل اور اس کے باپ کا مشترکہ کمرہ تھا۔ باپ کے بعد یہ کمرہ صرف شکیل کے استعمال میں تھا اس وقت تک رضیہ سو چکی تھی۔ نوری بھی نیند سے اٹھ کر آئی تھی۔ شکیل جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا کچھ ہی دیر بعد نوری اس کے لیے کھانا لیے آ گئی تو کھانا دیکھ کر اس کی بھوک اور بھی چمک اٹھی۔

"تم جا کر سو جاؤ میں برتن رکھ دوں گا۔" اس نے روز کی طرح کہا تو نوری منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکتی ہوئی وہاں سے چلی گئی جیسے یہی سننے کی منتظر ہو۔ "گرم گرم بستر میں جا گھسنے کی خواہش واقعی بہت شدید ہو رہی تھی۔ نوری کے جانے کے بعد شکیل نے کھانا کھایا اور برتن لے جا کر برآمدے میں بنے چولہے کے پاس رکھ دیے اور واپس اپنے کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور ایک بار پھر رانو اس کے تصور میں چلی آئی۔ رانو اس کی زندگی کی واحد خوشی اور اس کی محبت جس کے ہونے سے وہ زندگی کی ہر مصیبت کا سامنا ہنس کے کر لیا کرتا تھا۔ اس رات بھی رانو کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ بیٹھے بیٹھے سپنوں میں کھو گیا۔

☆....☆

رات جتنی پرسکون تھی۔ صبح اتنے ہی ہنگاموں سے بھری ہوئی تھی۔ چھوٹی آپا اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ شکیل کی آنکھ بچوں کے شور سے ہی کھلی تھی اور چھوٹی آپا کے اس طرح صبح سویرے آنے پر شکیل کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

"کیا بھائی جان نے پھر کوئی مطالبہ کر دیا ہے؟" وہ ماں والے کمرے کے دروازے پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔ "کچھ شرم کر شکیل! نہ دعا نہ سلام آتے ہی الٹا سیدھا بولنا شروع ہو گیا۔" رضیہ نے شکیل کو ڈانٹا۔

"بھائی ٹھیک تو کہہ رہا ہے اماں آپا جب بھی آتی ہے دولہا بھائی کی کوئی نہ کوئی فرمائش ساتھ لے کر آتی ہے۔" بھانجے کو چائے پلاتی نوری نے بھائی کا ساتھ دیا۔

"تو چپ کر جب پرائے گھر جائے گی نا تب پتا چلے گا بیاہی بیٹیوں کی مجبوریاں۔" اس بار رضیہ نے نوری کو جھڑکا اور ساتھ ہی چھوٹی آپا کی دلجوئی کرنا بھی ضروری سمجھا۔

"کہنے دے اماں جو بھی یہ کہتے ہیں ان کو کہنے دے مجبوری ہے میری۔ سننا پڑیں گی ان کی ساری باتیں ہائے آج میرا باپ زندہ ہوتا تو کس کی ہمت تھی کہ مجھے یوں باتیں سناتا۔ ہائے ابا تو اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔" چھوٹی آپا نے چلا چلا کے بولنا اور رونا شروع کر دیا۔ رضیہ اسے چپ کراتے ہوئے شکیل اور نوری کو غصے سے گھور رہی تھی لیکن ان دونوں پر ان گھوریوں کا کوئی اثر نہیں تھا جب اس کا رونا دھونا اور ماں کی گھوریاں حد سے بڑھ گئیں تو شکیل کواپ کرانا ہی پڑا۔

"ارے آپا! تو مذاق کر رہے تھے اور تو بتا دنیا کی کوئی بھی چیز میری آپا سے بڑھ کر ہے کیا۔" بھائی کی دلجوئی سے آخر چھوٹی آپا دھیرے دھیرے خاموش ہو ہی گئی۔ "اچھا بتاؤ نا اس بار دولہا بھائی نے کیا کہہ کر بھیجا ہے؟" وہ جلد از جلد جان لینا چاہتا کہ اب کون سی آزمائش آنے والی ہے۔

"اس بار میں سب کے لیے خوش خبری لے کر آئی ہوں۔" چھوٹی آپا نے ذرا جوش سے لیکن رازدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اچھا ایسا کیسے ہو گیا؟ میرا مطلب ہے ایسا کیا ہو گیا کیا خوش خبری لائی ہو۔" شکیل کی زبان پھسلی تھی لیکن پھر آپا کا منہ بنتے دیکھ کر اس نے فوراً اپنی اصلاح کر لی تھی۔

"اماں آج جو بات میں کہنے آئی ہوں وہ تمہیں ہر صورت ماننی ہی ہو گی۔" آپا نے بات کرنے سے پہلے ہی مان لینے کی شرط رکھ دی۔

"اری تو پہلے بتا تو سہی پھر ہی بتاؤں گی نا کہ مان سکتی ہوں یا نہیں۔" رضیہ کے کہنے پر آپا نے ایک طائرانہ نظر حاضرین پر ڈالی اور پھر بولی تو گویا سب پر صور اسرافیل پھونک دیا۔

"میں اپنی نند کا رشتہ لائی ہوں شکیل کے لیے۔" آپا اپنی بات مکمل کر کے اب ان سب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"خدا کا خوف کرو آپا تمہاری نند اور ہمارے بھائی کا بھلا کیا جوڑ، بات کرنے سے پہلے کچھ سوچ ہی لیا ہوتا۔"

رضیہ تو بیٹی کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی تھی جیسے اسے یقین ہی نہ آرہا ہو کہ اس نے جو کچھ سنا وہ ٹھیک سنا ہے۔ شکیل بھی شاک کی کیفیت میں تھا سب سے پہلے نوری نے ہی ہوش میں آکر آپا کو اس کی بات کے بے تکے ہونے کا احساس دلایا تھا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" آپا نظریں چراتے ہوئے بولی تھی۔

"ایسی ویسی کیا اس میں تو ماننے والی کوئی بات ہی نہیں ہے کہاں میرا بیٹا کہاں تمہاری وہ نند چکل صورت کو بھول بھی جاؤں تو عمروں کا فرق کیسے بھول جاؤں۔" رضیہ بھی صدمے سے نکل آئی تھی اور اب بیٹی کے لتے لے رہی تھی۔

"اماں کم از کم تم تو میرا ساتھ دو۔" آپا نے جیسے التجا کی۔

رضیہ اس کے اس انداز پر چپ سی ہو گئی۔ شکیل چپ چاپ سب کی باتیں سن رہا تھا پھر وہ ایسے ہی چپ چاپ ناشتا کیے بنا گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اسٹیشن کی طرف ہی تھا۔

☆......☆

شکیل کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر آپا نے یہ بات کی تھی تو یقیناً یہ بات ان کے ذریعے کہلوائی گئی تھی بلکہ کہلوانا گیا تھا دولہا بھائی کی طرف سے آنے والی ہر فرمائش حکم ہوا کرتی تھی جسے ماننا ہی ہوتا تھا، چاہے اس کے لیے ان کتنی بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا..... لیکن شکیل ایک جیتا جاگتا انسان تھا کوئی چیز یا پیسے نہیں تھے جو وہ بہن کا گھر بسانے کی خاطر بہنوئی کی فرمائش پر دے دیتا یہ اس کی زندگی کا فیصلہ تھا اس کی خوشیوں کا سوال تھا۔ آپا کی نند کے بارے میں اس نے کبھی ایسا سوچا تک نہیں تھا اور سوچنے کی نوبت بھی کیوں آتی جب کہ بہت بچپن سے ہی رانو اس کے دل اور خوابوں میں بس گئی تھی۔ یہ تو اسے کافی بعد میں پتا چلا تھا کہ جس طرح وہ رانو کو پسند کرتا ہے اسی طرح وہ بھی اس کے خواب سجاتی ہے اور اب آپا ان سب خوابوں کو بکھیر دینا چاہتی تھی جو ان دونوں نے مل کر سجائے تھے اور وہ کسی صورت کسی کو بھی یہ حق نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اس کی زندگی اس کی خوشیوں اور خوابوں کے ساتھ کھیلے شکیل عزم کے ساتھ سوچا اور یہ فیصلہ کرتے ہی کہ وہ آپا یا دولہا بھائی کی ایسی کوئی بات کبھی نہیں مانے گا اس نے خود کو کافی پرسکون محسوس کیا لیکن یہ بھی تھا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سکون کب تک قائم رہنے والا تھا۔

☆......☆

اس روز شکیل نے باہر بھی سارا دن کچھ نہ کھایا۔ جب بھی بھوک زیادہ ستانے لگتی تو اسٹیشن پر لگے نلکے سے پانی پی لیا کرتا اس طرح کر کے وہ دوسروں کا غصہ خود پر اتار رہا تھا۔ جتنی آوازیں اسٹیشن پر تھیں اس سے کہیں زیادہ اس کے اندر تھیں جتنا شور دن بھر اسٹیشن پر رہا تھا اس سے کہیں زیادہ شور اس کے اندر ہو رہا تھا۔ شام ہوتے ہی سردی کی شدت بڑھ گئی آسمان کو کالے بادلوں نے گھیر لیا اور کچھ ہی دیر میں خوب تیز تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش اور سردی سے بچنے کے لیے شکیل نے بھی مسافر خانے کے ایک بینچ پر پناہ لی تھی شام کی گاڑی آچکی تھی اور رات کی گاڑی آنے میں ابھی کافی وقت تھا اس لیے مسافر خانہ غیر آباد تھا اتنے میں گرم انڈے کی آواز پر اس کے پیٹ نے احساس دلایا کہ مزید بھوک برداشت نا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تو وہ اٹھ کر باہر آیا اور انڈہ تو اس نے نہ لیا کہ وہ خاصا مہنگا تھا اور اس سے شکیل کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا اس لیے اس نے چائے کا ایک کپ اور بن لے لیا اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔ پیٹ پوجا ہوئی تو عقل نے بھی کام کرنا شروع کیا وہ اب ایسے طریقے سوچ رہا تھا جس سے اپنے اور رانو کے درمیان آنے والی متوقع جدائی کو ٹال سکے۔ "میں جلد از جلد رانو سے شادی کر لوں گا پھر آپا یا دولہا بھائی ایسی بات نہیں کر سکیں گے۔" اس نے سوچا لیکن اپنی بات کے بچکانہ ہونے کا احساس اسے خود بھی تھا اس لیے دل کی تسلی نہ ہوئی اس کے بعد ایک کے بعد ایک کتنے ہی منصوبے اس کے ذہن میں آئے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے انہیں رد کرنا پڑا۔ "میں دولہا بھائی سے خود بات کروں گا۔ ایسے زبردستی تو نہیں کر سکتے وہ۔"

ابھی انہوں نے ایک بار پیغام بھجوایا تھا لیکن اپنے پچھلے تجربوں کی بنیاد پر وہ جانتا تھا کہ اس پیغام کو زبردستی میں بدلنے میں کوئی خاص وقت نہیں لگے گا۔ مسافر خانہ ابھی تک خالی تھا وہ ایک بینچ پر لیٹ گیا لیکن لیٹنے سے سردی کا احساس بڑھ گیا تو وہ جلد ہی دوبارہ اٹھ بیٹھا۔ صبح وہ اتنے غصے میں گھر سے نکلا تھا کہ چادر اٹھانا بھی بھول گیا تھا وہ دونوں بازوؤں کی قینچی سی بنا کر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ چھوٹی آپا کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے اور ہر سال کے حساب سے

ان کے پاس پانچ بچے بھی تھے۔ سال میں ایک دو بار یہ ڈراما دہرایا جاتا آپا کوئی نہ کوئی فرمائش لے کر ان کے گھر آبیٹھتیں اور جب تک ان کا کہا پورا نہ ہوتا دولہا بھائی انہیں لینے آتے اور نہ ہی وہ وہاں سے جاتیں۔ کبھی کبھی شکیل کو اپنی آپا بہت خودغرض لگتی لیکن تو کبھی اسے ان کی بے بسی اور مجبوری کا احساس بے بس کر نے لگتا اس کی دو بہنیں اور بھی تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی ان کی طرف سے بھی مطالبے آتے رہتے تھے۔ لیکن چھوٹی آپا کے میاں اس معاملے میں سب سے بازی لے گئے تھے۔

شکیل کی سوچ نوری کی شادی کی طرف مڑ گئی۔ نوری بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی لیکن کئی سالوں سے شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی لیکن ابا کے بنا ایک بہن کی شادی کرنا بھی رضیہ اور شکیل کے لیے مشکل ہو رہا تھا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ابا کی زندگی میں رضیہ نے بھی دو چار گھروں کا کام پکڑ رکھا تھا اس سے اچھی خاصی سہولت ہو جایا کرتی تھی لیکن جب سے رضیہ کو ہیپا ٹائٹس نے اپنی گرفت میں لیا تھا وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ مناسب خوراک اور دواؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے دن بہ دن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی لیکن اس بیماری کا علاج اس قدر مہنگا تھا کہ ان کے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ شکیل بے بسی سے اپنی ماں کو موت کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا لیکن بے بس تھا اس وقت بھی ماں کا سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

''یا اللہ! میں کیا کروں؟'' وہ لاچارگی سے خدا سے پوچھ رہا تھا۔ تبھی کچھ مسافر مسافر خانے میں داخل ہوئے اور شکیل کا نوٹس لیے بنا ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ ان میں دو نوجوان لڑکا لڑکی بھی تھے ان کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں اور ان کی شادی کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا ہے۔ شکیل کو بے اختیار رانو کی یاد ستانے لگی۔ رانو کی یاد آئی تو یہ فکر بھی ہوئی کہ رانو کو اس رشتے کے بارے میں پتا چلا تو کیا ہوگا۔ وہ کیا کہے گی یقیناً ناراض ہو جائے گی اور اس کا ناراض ہونا بنتا بھی تو ہے لیکن جب میں اس کے علاوہ کسی سے شادی کروں گا ہی نہیں تو اس کی ناراضگی بھی ختم ہو جائے گی اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے خود کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید کا دامن تھام لیا۔ رات گئے آخری ٹرین کے مسافر اترے تو وہ اپنا کام کر کے اسٹیشن سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆

جس وقت شکیل اسٹیشن سے گھر جانے کے لیے نکلا اس وقت تک بارش رک چکی تھی لیکن ہواؤں میں نمی موجود تھی جو سرد تیز ہوا کی وجہ سے ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ وہ اپنے گھر والی گلی کے قریب پہنچا تو پہلی بار اس کا دل چاہا کہ آج رانو اپنی کھڑکی میں نہ آئے وہ اس وقت رانو کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا اس لیے اس نے گھنٹی بھی نہیں بجائی تھی ان کی یہ روٹین تھی وہ گلی میں داخل ہوتا تو دوبارہ سائیکل کی گھنٹی بجایا کرتا یہ سگنل ہوتا تھا کہ وہ واپس آگیا سگنل پاتے ہی رانو کھڑکی میں آکھڑی ہوتی اور ممکن ہوتا تو ان کے بیچ دو چار باتیں ہو جایا کرتیں۔ شکیل نے گھنٹی نہیں بجائی تھی لیکن اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظریں بے اختیار رانو کی کھڑکی کی طرف اٹھی تھیں اور وہ حیران رہ گیا تھا۔ کھڑکی میں رانو کا ہیولہ نظر آرہا تھا جانے کیسے رانو نے اس کی آہٹ پالی تھی اور کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی وہ کھڑکی کے قریب چلا گیا۔

''آج گھنٹی کیوں نہیں بجائی؟'' رانو نے پوچھا۔

''گھنٹی خراب ہو رہی ہے صبح ٹھیک کرواؤں گا۔'' رانو سے یہ جھوٹ بولتے ہوئے اسے کافی شرم بھی آئی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اگر وہ سچ بتاتا کہ اس نے جان بوجھ کے گھنٹی نہیں بجائی تو رانو اس سے ناراض ہو جاتی اور پھر اسے منانا کوئی آسان کام بھی نہیں تھا۔

''سنو آج راشد کے اماں ابا میرے لیے پیغام لے کر آئے تھے۔ اماں ابا بھی راضی ہیں۔'' رانو نے دھیرے سے سرگوشی کی لیکن اس کو لگا اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ آج کا دن ہی منحوس ہے۔ شکیل نے دل میں سوچا۔

''اور تم؟ کیا تم بھی راضی ہو؟'' شکیل کے سوال پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور پھر رانو کھڑکی بند کرنے لگی تو شکیل نے کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑکی بند کرنے سے روک دیا۔ رانو کو یقیناً اس کی بات بہت زیادہ بری لگ گئی تھی۔ اسے بھی اپنے الفاظ کی بدصورتی کا احساس ہونے لگا تو معافی مانگی اور جلد اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیجنے کا وعدہ کرتا وہ اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا۔

☆......☆

شکیل نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ نوری کی بجائے چھوٹی آپا نے کھولا وہ لمحہ بھر کو چونکا لیکن پھر انہیں نظر

انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن وہاں پہنچ کر اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ رضیہ اس کا کھانا سامنے رکھے اس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے اماں تو ابھی تک جاگ رہی ہے۔ سب خیر تو ہے نا؟'' یہ سوال کرتے ہوئے شکیل کا دل کہیں سینے میں ڈوب سا گیا۔

''ہاں تجھ سے کچھ بات کرنی تھی اس لیے تیرا انتظار کر رہی تھی۔'' رضیہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا تو شکیل کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ یقیناً دن بھر میں چھوٹی آپا اماں کو اس رشتے کے لیے منا چکی تھی اور اماں کو منانا کون سا مشکل کام تھا انہیں بس یہی تو بتانا تھا کہ دوسری صورت میں انہیں ان کے پانچ بچوں سمیت گھر سے نکال دیا جائے گا لیکن شکیل اس بار ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں تھا اس نے بھی ٹھان لی تھی کہ وہی کرے گا جو اس کا دل چاہے گا۔ کسی کے مجبور کرنے سے مجبور نہیں ہوگا اس لیے رضیہ کا سمجھانا، چھوٹی آپا کی التجا سب بیکار گیا تھا اور اس نے ان کی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے رضیہ کو رانو کے گھر جانے کا کہہ دیا تھا جس پر رضیہ کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی حد تک بیٹے کی پسند سے واقف تھی۔

☆......☆

اس کے بعد کی کہانی بہت مختصر ہے جب تین مہینے تک بھی دولہا بھائی نے ان کے گھر جھانک کر نہ دیکھا اور آپا کو بھی بچوں سمیت ماں باپ کے گھر پڑے رہنے کا حکم سنا دیا تو شکیل جیسے ٹوٹ سا گیا لیکن پھر بھی اس نے ان کی بات نہیں مانی وہ رانو کو کسی صورت بھی دھوکا نہیں دے سکتا تھا اور بات صرف رانو کو دھوکا دینے کی تو نہیں تھی رانو سے دھوکا کر کے اس کے اپنے ارمانوں کا بھی تو خون ہوتا، اس کا اپنا دل بھی تو ہمیشہ کے لیے اجڑ جاتا تو وہ بھلا ایسی بات کیسے مان سکتا تھا...... لیکن جب چھ ماہ گزر گئے اور حالات جوں کے توں رہے تو شکیل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ بہن کی بے بسی اور رونا پیٹنا بیمار ماں کی پریشانی اس کی برداشت سے باہر ہونے لگی تھی۔ ایک طرف یہ سب تھا اور دوسری طرف رانو کا آنسوؤں سے تر چہرہ جب سے اسے آپا کے میکے آنے کی وجہ کے بارے میں پتا چلا تھا وہ نچڑ کر رہ گئی تھی۔ روز روز کی بیماری نے اس کے حسن کو کملا دیا تھا شکیل اسے دیکھتا تو اس کا بڑا دل دکھتا لیکن وقت آنے پر خون کے رشتے، ذمہ داری کے رشتے ہر رشتے سے بڑھ کر ثابت ہوا کرتے ہیں۔ اس کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا جب دولہا بھائی نے سنجیدگی سے طلاق دینے کے بارے میں بات کرنا شروع کردی تو شکیل جیسے اپنے آپ سے ہار گیا وہ اپنے دل کی خوشی کی خاطر اپنی بہن کا بسا بسایا گھر تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے رانو سے بے وفائی کرلی اور بہن کا مان رکھ لیا۔

☆......☆

چھوٹی آپا کی نند نسرین عمر میں تو شکیل سے دس پندرہ سال بڑی تھی ہی لیکن صورت بھی بس قبول صورت ہی تھی اور اس پہ سونے پہ سہاگا اس کا مزاج تھا...... محلے بھر میں وہ لڑاکا مشہور تھی ذرا ذرا سی باتوں پر محلے والوں سے جھگڑا کرنا اس کا معمول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بھولے بھٹکے اگر کوئی رشتہ آ بھی جاتا تو اس کی شہرت سن کر وہ لوگ دوبارہ ان کے گھر کا رخ نہ کرتے اور جب اس کی شادی کی عمر بالکل ہی نکلنے لگی تو ایسے میں ان کی نظر کرم شکیل پر آرکی اور پھر ہمیشہ کی طرح انہوں نے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا تھا۔

☆......☆

شکیل جو پہلے ہی اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ نسرین کے مزاج کی وجہ سے اور بھی زیادہ بددل ہوگیا تھا۔ نسرین بدمزاج ہی نہیں شکی مزاج بھی تھی۔ رضیہ کے ساتھ بھی اس کو خاص بیر تھا اور جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ شکیل رانو کو پسند کرتا تھا اس نے شکیل اور رانو دونوں کی زندگی تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ اپنی حد تک تو وہ نسرین کی ہر بات برداشت کر ہی رہا تھا لیکن جب اس نے بلاوجہ رانو کے کردار پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا اور اس کی پھیلائی باتوں کی وجہ سے رانو کی شادی ہونا مشکل ہونے لگی تو شکیل کی برداشت کی حد ختم ہوگئی۔ اس روز شکیل کا ہاتھ بھی اس پر اٹھ گیا اور اس کے بعد جو اس نے رونا پیٹنا ڈالا اور شور مچایا تو شکیل کا گھر پورے محلے میں تماشا بن گیا۔ شکیل گلی میں جمع ہوئے محلے داروں سے نظریں چراتا اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

اس روز شکیل اسٹیشن سے زندہ واپس نہیں آیا۔ رات کی ٹرین کے سامنے گر کر وہ دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ یہ بات ہمیشہ لوگوں کے لیے راز ہی رہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسلا تھا یا پھر اس نے جان بوجھ کر خود کو ٹرین کی پٹری پر گرا یا تھا۔

☆☆☆

تیسری منفرد پلیٹ فارم کہانی

# ہیرو سے قلی تک

اسد بٹ

اُس بزنس مین کا قصہ، جسے محبوب کے انتظار نے قلی بنا دیا تھا

ریلوے اسٹیشن پر شالیمار ایکسپریس کے آنے کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر بیٹھے مسافر اور قلی ایکدم الرٹ ہو چکے تھے۔ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم نمبر دو پر آ کر رکی، ایک ہڑبونگ سی ہر طرف مچ گئی۔ ٹرین میں چڑھنے اور اترنے والے مسافروں کے ساتھ ساتھ ہر طرف پھیلے لال وردیوں میں ملبوس قلی بھی اس طرح ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے، جیسے کوئی بلا ان سب کے پیچھے لگ گئی ہو۔

ان قلیوں میں وہ بھی شامل تھا۔ لیکن اس کا انداز سب سے جدا تھا۔ اس کی بڑی بڑی کشادہ آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی ٹھہر چکی تھی۔ ایک بے نام سی بے قراری نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی وہ تیزی سے اٹھا تھا اور فسٹ کلاس کمپارٹمنٹس کی طرف لپکا تھا۔ اس نے بیتابی سے ایک ایک کمپارٹمنٹ کا جائزہ لینا شروع کیا، وہ ہر ڈبے کے دروازے سے اندر جھانکتا اور اس سے قبل کہ مسافر اسے سامان اٹھانے کے لیے پکارتے، وہ فوراً اگلے ڈبے کی طرف بڑھ جاتا۔ اس کے پیچھے پیچھے آنے والے دوسرے قلی، صاحب لوگوں کو حیران ہونے کا موقع دیے بغیر تیزی سے آگے بڑھتے اور سامان اٹھا کر صاحب لوگوں کے اشارے پر ان کے پیچھے چل پڑتے۔ وہ اسی طرح ایک کے بعد ایک کمپارٹمنٹ چھانتا ہوا جیسے جیسے آخری ڈبے کے قریب ہوتا جا رہا تھا، ویسے ویسے اس کی دل کی منتشر دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے بڑی آس اور امید بھرے انداز سے آخری ڈبے میں جھانکا، اور پھر اس کی آنکھوں میں جلتا آس کا دیا، ہر روز کی طرح بجھ گیا۔

''اے قلی۔!! یہ لگیج اٹھانے کا کیا لوگے؟'' وہ جھکے شانوں اور تھکے قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا واپس مڑ چکا تھا کہ اس کے پیچھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ اس کے بڑھتے قدم ایک لمحے کو زنجیر ہوئے، مگر پھر اگلے ہی لمحے اس نے بغیر مڑ کر دیکھے ہی نفی میں سر ہلایا اور پلیٹ فارم کے ایک طرف ایستادہ پیپل کے پرانے اور بڑے سے درخت کی طرف بڑھ گیا۔ اسے آواز دینے والی حیرت کی تصویر بنی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔

''بی بی جی۔!! میں آپ کا سامان اٹھا لیتا ہوں۔ آپ کا جو دل چاہے دے دیجئے گا۔'' ایک بزرگ

صورت قلی نے آگے بڑھ کے اس کا سامان اٹھالیا۔ وہ لڑکی شاید اکیلی ہی تھی۔ اس لیے حیرت اور خاموشی سے قلی کے پیچھے چل پڑی۔ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے اس کی نظر چند قدم دور پیپل کے گرد بنے چبوترے پر پڑی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر آنکھیں موندے، درخت سے ٹیک لگائے خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ لڑکی ایک لمحے کو تھم سی گئی۔ قلی، جو اس کے پیچھے اس کا سامان اٹھائے چل رہا تھا، اسے رکتا دیکھ کر خود بھی رک گیا۔

''کیا ہوا بی بی جی! آپ رک کیوں گئیں۔''

''وہ۔ وہ، وہاں جو قلی بیٹھا ہے۔ کون ہے وہ؟'' لڑکی سراسیمگی بھرے انداز سے بولی تو بابا دینو نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

''وہ۔ چھوڑیں اسے بی بی جی۔ سائیں لوک ہے بیچارا۔ اپنے آپ میں مست رہتا ہے۔ آپ اس کی خاطر اپنا سفر کیوں کھوٹا کر رہی ہیں۔ آپ نے جہاں جانا ہے، مجھے بتائیں میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آتا ہوں۔'' بابا جی نے لڑکی کا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ ابھی تک اس پر نگاہیں جمائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

سیٹھ سکندر کا سب سے چھوٹا بیٹا کاشان سکندر ہاوورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری لے کر وطن واپس آیا تھا۔ سیٹھ سکندر نے اس کی کامیابی کی خوشی میں گرینڈ پارٹی رکھی تھی۔ شہر کی ساری کریم اس پارٹی میں موجود تھی۔ سیٹھ سکندر کے کاروباری حریف بھی اور حلیف بھی۔ سوائے ہاشم درانی کے۔ ہاشم درانی اور سیٹھ سکندر کا شروع سے کانٹے کا جوڑ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، کوئی بزنس کانٹریکٹ، کوئی فارن ڈیلیگیشن، کوئی ڈیل۔ کچھ بھی، ان دونوں کی کوشش ہوتی کہ ایک دوسرے کو ہر میدان میں پچھاڑ کر جیت کا تاج اپنے سر پر سجالیں۔ دونوں ہی بزنس ٹائیکون تھے، اور دونوں کے سورسز ایک سے بڑھ کر ایک ہی تھے۔ سیٹھ سکندر نے کاشان کی پارٹی میں اپنے سب رائیولز کو انوائٹ کیا تھا، بمعہ ہاشم درانی کے اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ ہاشم درانی اس پارٹی میں ضرور شامل ہوں تاکہ وہ اپنے شاندار بیٹے کی شاندار کامیابی کا سر اٹھا فخر سے ان کے سامنے اعلان کریں اور ان کے زخموں پر خوب ڈھیر سارا نمک



ملیں۔مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ ہاشم درانی پارٹی سے ایک دن پہلے ہی کسی بزنس ٹرپ کے سلسلے میں دبئی چلے گئے ۔ ہاں ان کی نمائندگی کرنے کو ان کی خوبصورت اور خوش اخلاق پی۔اے ضرور موجود تھی۔

ہاشم درانی کو اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ دولت، عزت، شہرت، ان کے در کی باندیاں تھیں۔ مگر اولاد کی طرف سے انہیں کبھی کوئی خوشی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ سیٹھ سکندر کی طرح ان کے بھی چار بیٹے تھے، مگر وہ سب باری باری کسی نامعلوم بیماری کا شکار ہو کر انہیں داغ مفارقت دے چکے تھے۔ ان کی بیوی ان صدمات کا بوجھ زیادہ عرصہ جھیل نہ پائی اور بیٹوں کے پیچھے پیچھے ہی راہی ملک عدم ہوگئیں۔ سیٹھ سکندر کے بیٹے نا صرف حیات تھے، بلکہ اپنے باپ کا بازو بنتے ہوئے اس کے بزنس کو کہیں سے کہیں لے جا چکے تھے۔ جوان ہوتے بیٹوں اور عمر بھر کی ساتھی کی دائمی جدائی نے ہاشم درانی کو کچھ عرصے کے لیے ہر طرف سے غافل کر دیا تھا۔ اور یہ وہی وقت تھا، جب سیٹھ سکندر نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ ہاشم درانی کو بزنس میں چوٹ پر چوٹ پہنچانا شروع کر دی تھی۔ ان کے کئی قیمتی کلائنٹس توڑ کر اپنی طرف لے گئے۔ ان کے کئی کانٹریکٹس ایک کے بعد ایک کینسل ہوتے چلے گئے اور قریب تھا کہ وہ دیوالیہ ہو جاتے، انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ اور اس میں انہیں مدد دی ان کی بیٹی نے۔ بریرہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، چار بھائیوں سے چھوٹی تھی جسے انہوں نے اپنی بہن کے پاس بھجوا دیا تھا کیونکہ وہ ماں اور بھائیوں کی جدائی سے بہت پریشان، بہت دکھی ہو چکی تھی۔ آپا جب بھاوج کی آخری رسومات کے بعد واپس جانے لگیں تو بریرہ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گئیں۔ بریرہ ان کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہو چکی تھی، اس لیے ہاشم نے بھی آپا کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔

بریرہ پھوپو کے ساتھ دبئی چلی گئی۔ پھوپو کی بیٹی وشمہ کے ساتھ اس کی اچھی دوستی ہوگئی اور جلد ہی اس کا دل وہاں لگ گیا۔ دوسری طرف ہاشم درانی خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگے، اور قریب تھا کہ تنہائی کا عفریت انہیں نگل جاتا کہ سیٹھ ہاشم کی طرف سے ہونے والے پے در پے حملے انہیں چونکا گئے۔ انہوں نے خود کو اس خود فراموشی کے چنگل سے باہر نکالا اور اپنے ڈوبتے بزنس کو بچانے کی تگ و دو میں جت گئے۔ اب ان کے سامنے صرف ایک ہی مشن تھا۔ سیٹھ سکندر کی بربادی اور اپنے نقصانات کا ازالہ۔

☆☆☆

''ڈیڈ! آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟ میرا ان سب باتوں سے کیا واسطہ؟'' کاشان نے باپ کی باتیں غور سے سننے کے بعد قدرے حیرت سے جواب دیا تو وہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرانے لگے۔

''واسطہ ہے بیٹے۔ تمہارا ان سب باتوں سے گہرا واسطہ ہے۔ ذرا دیکھو ان pics کو غور سے۔'' سیٹھ سکندر نے دراز سے ایک لفافہ نکالا اور اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا تو وہ چونک گیا۔

''کیا ہے اس میں ڈیڈ۔ کس کی pics ہیں یہ۔'' اس نے لفافہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے تجسس بھرے انداز سے پوچھا تو سیٹھ سکندر اسرار بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے مسکراتے چلے گئے۔

''ڈیڈ۔ یہ تو۔ یہ تو میری تصویریں ہیں، ہاورڈ یونیورسٹی کی۔ اور اس میں میرے سارے فرینڈز ہیں۔ اس میں ایسی کیا بات ہے جو آپ مجھے بتانا چاہ رہے تھے۔'' وہ شائد خفا ہو رہا تھا، مگر سکندر کے چہرے پر ویسی ہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''یہ۔ اس کو دیکھو بیٹا۔ کون ہے یہ جانتے ہو؟'' سیٹھ نے ایک بے حد حسین لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا، جو کاشان کے گروپ کے پیچھے سے گزرتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ان کے گروپ کا حصہ نہیں تھی، بس ایسے ہی ان کے گروپ کے آس پاس اپنی دوست کے ساتھ مختلف حالتوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں بیٹھی ہوئی، کہیں چلتی ہوئی، تو کہیں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی۔

''یہ کون ہے ڈیڈ۔ میں تو اسے نہیں جانتا۔؟ اور آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

کاشان خود بھی حیرت سے اس حسینہ کو دیکھ رہا تھا، جو شائد اس کے ساتھ پڑھتی رہی تھی، مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے انجان ہی رہے تھے۔

''یہ ترپ کا اکا ہے بیٹے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس اکے کو تم حاصل کرلو۔ یہ اگر ہمارے قبضے میں آگئی ناں تو سمجھو ہم مقدر کے سکندر بن گئے۔'' سیٹھ سکندر کی آنکھوں میں ایک خاص چمک لہرا رہی تھی۔ ایسی چمک کے کاشان کو اپنا دل اس میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

پلیٹ فارم پر موجود گاڑی کب کی روانہ ہو چکی تھی۔ اب ہر طرف ایک اداسی اور ویرانی کا سا سماں چھایا ہوا تھا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیئے درخت سے ٹیک لگائے چبوترے پر بیٹھا تھا۔

''باؤ! کھانا کھالو۔ آج پھر بھوکا رہنے کا ارادہ ہے کیا؟'' بابا دینو نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنے ساتھ لایا ٹفن کھولتے ہوئے ہمیشہ کی اسے بھی دعوت دی تھی۔

''بابا! آپ روز مجھ سے ایک ہی بات پوچھتے ہیں، میں روز ایک ہی جواب دیتا ہوں۔ نہ آپ تھکتے ہیں نہ میں؟ ایسا کیوں ہے بابا۔'' اس کی آنکھوں میں گہری اداسی پھیلی تھی اور بابا دینو خود کو اس اداسی کے سمندر میں ڈوبتا محسوس کر رہے تھے۔

''وہ اس لیے باؤ کہ نہ تم مجھے اپنا درد بتانا چاہتے ہو، اور نہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھنچتا ہے باؤ۔ جانے کیوں؟ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تجھے ایک بار ہنستا ہوا دیکھوں۔ زندگی سے بھرپور ہنسی۔ لیکن، تم میری سنتے ہی کہاں ہو۔''

''بابا!! میرا درد لادوا ہے۔ میں آپ کو اپنا دکھ سنا کر دکھی نہیں کرنا چاہتا، میری وجہ سے پہلے ہی کوئی دکھ کی گہری کھائی میں جا گرا ہے۔ میں اپنے دل کو ابھی تک اس غم سے نہیں نکال پایا بابا۔ اب اگر آپ بھی میری وجہ سے کسی مصیبت میں گھر گئے تو میں شاید مر ہی جاؤں گا۔'' وہ سر جھکائے ٹوٹے بکھرے انداز میں بولا تو بابا کی دل دکھ سے بھر گیا۔

''نہ پتر! تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ تم تو جب سے اس پلیٹ فارم پر آئے ہو، مجھے لگتا ہے میرا پتر میرے پاس آگیا۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے ناں، مجھے اپنا باپ سمجھ کر ہی بتادو۔''

''باپ!'' بابا دینو کی بات نے اس کی نگاہوں کے سامنے ماضی ایسے لاکھڑا کیا کہ اس کی روح تک جھلس گئی۔ وہ ایک بار پھر اپنے خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ آنکھیں بند کیئے درخت سے ٹیک لگائے نہ جانے کن جہانوں میں کھو گیا اور بابا اپنی پل پل بھیگتی آنکھیں صاف کرتا، بس اسے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

''بریرہ! ہم کب تک ایسے ہی چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟''

''جب تک میں پاپا کو اعتماد میں نہیں لے لیتی۔ تب تک تمہیں انتظار کرنا ہی پڑے گا شانی۔''

''اور تم اپنی پاپا کو کب تک اعتماد میں لے لوگی؟ کچھ اندازہ تو ہوگا تمہیں۔''

''پتا نہیں شانی! میں پاپا سے کھل کر کبھی بھی بات نہیں کر پاتی۔ شائد ممی ہوتیں تو مجھے اس طرح کی مشکل کا سامنا کرنا ہی نہ پڑتا۔ میں ممی کو سب کچھ بتا دیتی، اور وہ......!''

''لیکن اب تو ممی نہیں ہیں ناں بریرہ۔ اب تو جو بھی کرنا ہے ہمیں خود ہی کرنا ہے۔'' وہ دونوں ریسٹورنٹ کے پرسکون ماحول میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بریرہ ہاشم کو کاشان سے محبت ہوگئی تھی۔ ایک معمولی اور عام سے نوجوان سے جو اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو ہر دم تیار رہتا تھا۔ شانی کا اصرار تھا کہ وہ اب اپنے پاپا سے ان کے رشتے کے بارے میں کھل کر بات کرے، تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو باقاعدہ طور ہر رشتے کے لیے لا سکے۔ مگر بریرہ باپ سے بات کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ گو کہ وہ ہاشم کے ساتھ واپس گھر آچکی تھی، مگر سالوں پر محیط یہ دوری ان دونوں کے مابین جیسے ٹھہری گئی تھی۔ شانی اسے یہاں ہی ملا۔ وہ شاپنگ مال سے نکلی ہی تھی کہ کچھ غنڈوں نے اسے گن پوائنٹ پر گھیر لیا۔ اس کا پرس، موبائل اور گاڑی

کی چابی چھیننے کے بعد وہ اسے مزید ہراساں کر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک جوان تماشائیوں کی بھیڑ چیرتا ہوا آگے بڑھا اور ان غنڈوں پر پل پڑا۔ اس نے مارشل آرٹ کے ایسے ایسے داؤ پیچ لڑائے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاروں دھول چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔

بریرہ اس فرشتہ صفت نوجوان سے ایسی متاثر ہوئی کہ اس کے احسان کے بدلے، اسے اپنا دل ہی دے بیٹھی۔ شانی نے اسے کم مائیگی اور غربت کی داستان سنائی بھی کچھ ایسے دلدوز انداز سے تھی کہ اس چڑیا جیسے دل کی مالک لڑکی کی آنکھوں میں اشک بھر آئے۔

بس، اسی دن سے ان دونوں کی دوستی پیار کے ٹریک پر تیز گام بنی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اور اب شانی اس گاڑی کو شادی کے پلیٹ فارم پر بریک لگانا چاہتا تھا، مگر بریرہ کو جانے کس بات کا خوف تھا کہ وہ اپنے پاپا سے ابھی تک شانی کا ذکر تک نہیں کر پائی تھی۔ اور اب اس کے اصرار پر بھی بس سوچتی ہی رہ گئی تھی۔

''میں وشمہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ویسے بھی اس سنڈے کو آ رہی ہے پاکستان۔ وہ خود ہی پھوپو کو بتا دے گی، پھر پھوپو پاپا سے خود ہی بات کر لیں گی۔ ٹھیک ہے ناں شانی۔'' اس نے اپنے تئیں بڑا مناسب حل نکالا تھا، مگر شانی اس کی بات سن کر جلبلا ہی گیا۔

''او گاڈ بریرہ!! تم بجائے پاپا سے خود بات کرنے کے یہ کس کس کو بیچ میں ڈال رہی ہو۔ بیوقوف لڑکی۔ اس طرح تو پاپا کو شائد اور بھی برا لگے اور ہماری بات بنتے بنتے بگڑ جائے۔'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس انداز سے کہا کہ بریرہ بھی پریشان ہوگئی۔

''پھر، میں کیا کروں؟'' اس نے معصومیت سے کہا تو شانی ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

''دیکھو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم پاپا سے کیا کہو گی۔ بس جس طرح میں سمجھاؤں، تم اسی طرح کرنا۔ پھر دیکھنا، پاپا فوراً مان جائیں گے۔'' شانی نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وہ بھی سر ہلاتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پھر شانی نے اسے بہت کچھ سمجھایا۔ ایسی ایسی پٹیاں پڑھائیں کہ وہ خود کو بہت بہادر اور نڈر سمجھنے لگی۔

☆☆☆

''پاپا۔!! پلیز۔ آپ ایکبار تو اس سے مل لیں۔ ایسے کیسے آپ اسے بغیر دیکھے ہی ریجیکٹ کر سکتے ہیں۔ پاپا۔ پلیز۔'' ہاشم درانی نے اس کی پوری بات بہت حوصلے اور صبر سے سنی تھی، اور پھر ان کا جواب انکار کی صورت آیا تھا۔ وہ ایسے کسی بھی شخص سے ملنا نہیں چاہتے تھے، جو ان کی بیٹی کو سیڑھی بنا کر ان کی دولت پر عیاشی کے خواب دیکھ رہا ہو۔ شانی کے بارے میں جو کچھ بھی بریرہ نے انہیں بتایا، اس کا بریرہ کی مدد کرنا، پھر اپنی غربت اور عسرت کی کہانیاں سنانا، اور مزے کی بات اس سارے دورانیے میں ایک بار بھی اسے اپنے گھر یا گھر والوں سے نہ ملوانا، حالانکہ ہر ملاقات میں وہ اپنی ماں اور بہن کے اشتیاق کی کہانیاں بڑے شدومد کے ساتھ اسے سناتا رہتا تھا۔

ہاشم درانی ایک پل میں سمجھ گئے کہ شانی نے ان کی بھولی بھالی معصوم بیٹی کو ٹریپ کیا ہے۔ وہ کوئی بہت بڑی گیم کھیل رہا تھا بریرہ کے ساتھ، مگر وہ اپنی سادگی اور محبت میں اسے سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔ مگر ہاشم درانی نہ تو سادہ تھے اور نہ ہی شانی کے عشق میں گرفتار، سو جیسے ہی حقیقت ان پر کھلی، انہوں نے بریرہ سے بھی کچھ نہیں چھپایا۔ ان کی مدلل باتیں سن کر بریرہ کے ہوش ہی اڑ گئے۔ اس طرف تو اس کا کبھی دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ وہ سخت ٹینشن میں آ گئی اور اسی ٹینشن اور پریشانی نے اسے بیمار کر ڈالا۔

سنڈے کو وشمہ بھی دبئی سے آ گئی۔ ساری صورتِ حال جان کر پہلے تو اسے بریرہ کی بیوقوفی پر خوب غصہ آیا، مگر پھر اس کی حالت دیکھ کر نرم پڑ گئی۔

''تم کال کرو شانی کو۔ اسے ملنے کے لیے بلاؤ۔ میں بھی تو دیکھوں ایسا کیا ہے اس میں کہ تم اس حد تک چلی گئی ہو۔'' وشمہ نے اس کا سیل اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا تو بریرہ نے شانی کو فون ملا دیا۔ دونوں میں چند منٹ بات ہوئی اور پھر بریرہ نے اسے لنچ پر اسی ریسٹورنٹ میں آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

''یہ ہے تمہارا شانی؟'' وہ دونوں مقررہ وقت سے کچھ لیٹ ریسٹورنٹ پہنچیں تو شانی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتا اور پھر منہ بناتا ہوا گلاس وال سے باہر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو دیکھنے لگتا۔ وشمہ نے دور سے ہی اسے دیکھا تو حیرت سے بت بن گئی۔ بریرہ کے ٹہوکا دینے پر وہ اس کی طرف گھومی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے واپس باہر بھاگی۔ بریرہ اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھی، سو گھبرا گئی۔ مگر وشمہ کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔ باہر آتے ہی اس نے بہت چبھتے ہوئے انداز میں بریرہ سے سوال کیا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''شانی۔!! پاپا نہیں مانے۔ وہ تم سے ملنا ہی نہیں چاہتے، اب تم بتاؤ کہ کیا کرنا ہے۔''

''اس نے جی کڑا کر کے کہہ تو دیا، مگر اب ڈر رہی تھی جانے جواب کیا آئے۔ کہیں وشمہ کا کہا سچ ہی ثابت نہ ہو جائے۔

''اور جو میں کہوں گا، وہ تم کر لوگی؟ گھبراؤ گی تو نہیں۔''

''نہیں۔ میں نہیں گھبراؤں گی۔ تم بتاؤ کیا کرنا ہے اب۔'' دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ پاس بیٹھی وشمہ اس کی تاثرات کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے۔ ہمیں یہ شہر چھوڑ کر کہیں دور جانا ہوگا۔ تم میرے ساتھ ایک عام عورت کی طرح عام سی زندگی گذارنے کو تیار ہو؟'' شانی کی طرف سے جواب کے ساتھ ہی سوال بھی آیا تھا۔

''ہاں تیار ہوں۔ تم بتاؤ، کب اور کہاں آنا ہے۔ میں پہنچ جاؤنگی۔'' اٹل اور فیصلہ کن اواز میں کہتے ہوئے اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ کل رات بارہ بجے تم مجھے ریلوے اسٹیشن پر ملوگی۔ میں وہاں پہلے سے موجود ہونگا۔ ہم وہاں سے چلنے والی پہلی گاڑی پکڑیں گے اور یہ شہر تو کیا یہ صوبہ ہی چھوڑ جائیں گے۔'' شانی نے بڑے اطمینان سے اپنا پروگرام اسے بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے میں ٹائم پر پہنچ جاؤنگی۔ تمہارے لیے تو میں یہ دنیا بھی چھوڑ سکتی ہوں شانی، یہ شہر اور یہ صوبہ کیا چیز ہے۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں وقت سے پہلے ہی آ جاؤنگی۔'' بریرہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور وشمہ شاک کی حالت میں اسے دیکھے چلی گئی۔

''بریرہ۔!! تم سچ میں پاگل ہوگئی ہو کیا؟ اس فراڈئے کے لیے اپنے باپ کی عزت کو داؤ پر لگا دوگی۔ کچھ تو خیال کرو بریرہ۔ ماموں کا کیا حال ہوگا۔ کچھ سوچا ہے تم نے۔'' وشمہ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''تم پریشان مت ہو وشمہ۔ اب پاپا کو کوئی رائیول بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا پائے گا۔ میری وجہ سے جو کچھ بگڑا ہے، میں ہی اسے سنواروں گی بھی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' بریرہ کے جواب نے وشمہ کو اور زیادہ پریشان کر دیا تھا، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کرنے کیا جا رہی ہے۔

☆☆☆

اسٹیشن پر ویسی ہی بھیڑ بھاڑ تھی، جیسی کہ گاڑی کے آنے سے پہلے ہوا کرتی ہے۔ بریرہ ایک چھوٹا سا شولڈر بیگ شانے پر لٹکائے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ اس کی متلاشی نگاہیں چاروں طرف شانی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ دو دن پرانے لباس میں تھی۔ حلیہ بھی رف سا ہو رہا تھا اور پریشان اور کچھ گھبرائی ہوئی بھی دکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی بک اسٹال کے پاس جا کر رک گئی۔ شانی نے اسے اسی جگہ رکنے کو کہا تھا۔ اسے وہاں کھڑے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ شانی ایک طرف سے نکل کر اس کے پاس آگیا۔ آج اس کا حلیہ بہت بدلا ہوا تھا۔ وہ نک سک سے تیار کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ پرانے والے شانی کی تو ایک جھلک بھی اس میں ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''بریرہ آگئیں تم؟ اچھا کیا۔ میں کب سے!''

''ہاں، آگئی۔ اور جو تمہیں چاہیے تھا، سب لے آ

ئی ہوں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو شانی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''مجھے کیا چاہئے تھا سوائے تمہارے۔ تم کیا لے آئی ہو بریرہ؟'' اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس کے کہا تو بریرہ نے اپنے شانے سے بیگ اتار کر اس کی سمت بڑھا دیا۔

''اس میں میرے پاپا کے سارے اہم ڈاکومنٹس ہیں۔ جو تمہارے اور تمہارے ڈیڈ کے بہت کام آئیں گے۔ تم نے مجھ سے دوستی اور محبت کا رشتہ اسی لیے بنایا تھا ناں کہ میرے پاپا کو نقصان پہنچا سکو۔ تو لو، یہ سب اپنے ڈیڈ کو دے دینا کاشان سکندر۔'' اس نے شانی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد انداز میں کہتے ہوئے بیگ اس کی طرف بڑھایا تو شانی وہیں کھڑا کھڑا جیسے سن ہو گیا۔

''بریرہ! تم.....!''

''ہاں کاشان سکندر۔!! میں تمہاری ساری حقیقت جان چکی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کاشان کہ میں نے تمہیں دل دیا۔ تم سے محبت کی۔ تم نے مجھے دھوکہ دیا یہ میرا نصیب تھا، مگر میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی۔ میرے باپ کی دشمنی تمہارے باپ سے تھی، مگر تم نے ان دونوں کی دشمنی میں میرے دل کا خون کر دیا۔ شانی کیوں؟ میں اب تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ صرف تمہاری زندگی سے نہیں اپنے باپ کی زندگی سے بھی ہمیشہ کے لیے نکل رہی ہوں۔ کیونکہ تمہاری محبت میں میں نے اپنے باپ کو بھی دھوکہ دے دیا۔ ان کے سارے سیکرٹس تمہارے حوالے کر دیے اور اب کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں۔ اس لیے میں تم دونوں کو یہیں سے خدا حافظ کہہ رہی ہوں۔'' بریرہ نے اس کے قدموں میں بیگ پھینکا، اور تیزی سے پلٹتی ہوئی بھیڑ میں گم ہو گئی۔ اسی لمحے ٹرین کی وسل سنائی دی۔ گارڈ نے جھنڈی لہرائی اور شالیمار ایکسپریس نے رفتار پکڑنا شروع کر دی۔ کاشان کا سکتہ ریل کی آواز سے ٹوٹا، اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے ریل کی طرف بڑھتی بھیڑ میں دور سے بریرہ بھی جاتی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔ بریدہ کا بیگ اس کی ٹھوکر لگنے سے پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ کاشان کو اسے اٹھانے کا بھی ہوش نہیں تھا، وہ بریرہ کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اسے آوازیں دے رہا تھا، مگر وہ اب اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹرین نے اس دوران رفتار پکڑ لی تھی، وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا، اور پھر اچانک فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے کھلے دروازے سے بریرہ کا سرخ اسٹالر اڑتا ہوا آیا اور کاشان کے وجود کے ساتھ لپٹ گیا۔ وہ اس اسٹالر کو ہاتھ میں تھامے بھیگتی آنکھوں سے ٹرین اور بریرہ کو خود سے دور ہوتے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ویلڈن کاشان سکندر۔ ویری ویلڈن۔ اب تو تمہیں سکون مل گیا ہوگا۔ تمہارے ڈیڈ کی پاور فل پلاننگ نے میرے ماموں کو برباد کر دیا۔ ان کی زندگی کی آخری خوشی، آخری نشانی بھی ان سے چھین لی۔ اب تم یہ خوش خبری بڑے شوق سے اپنے ڈیڈ کو سنا سکتے ہو۔ سیٹھ سکندر جیت گیا اور ہاشم درانی ہار گیا۔ ہمیشہ کے لیے ہار گیا۔'' بریرہ کا بیگ کاشان کی طرف بڑھاتے ہوئے وشمہ نے اسے لفظوں کی مار سے لہولہان کر ڈالا تھا۔ وہ شدت ضبط سے سرخ انگارہ آنکھیں لیے ایک دم پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پلیٹ فارم سے باہر نکل گیا۔ وشمہ وہیں کھڑی روتی رہ گئی۔

☆☆☆

''بس، بابا! اس دن کے بعد سے میری زندگی اسی پلیٹ فارم کی ہی ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے ڈیڈ کا ساتھ چھوڑ دیا، ہمیشہ کے لیے۔ انہوں نے ہاشم انکل کے ساتھ برا کیا، بہت برا۔ وہ بیچارے تو پہلے ہی اپنے بیٹوں اور بیوی کی موت کا صدمہ جھیل رہے تھے، ڈیڈ نے ان سے ان کی بیٹی بھی چھین لی۔ ایک جیتی جاگتی ہنستی مسکراتی لڑکی کو تڑپ کا اکا بنا ڈالا مجھے ڈیڈ کی سفاکیت کا احساس بریرہ کے کھو جانے کے بعد ہوا۔''

دینو بابا کے سامنے کل کے کاشان سکندر اور آج کے قلی باؤ نے اپنا آپ کھول دیا تھا۔ دینو بابا اس کی کہانی سن کر رو دیے تھے۔

''پتر۔!! مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی تجھے جانتی تھی۔ بڑی دیر تک تجھے گھور گھور کر دیکھتی رہی اور پھر تیرے بارے میں بہت سوال جواب بھی کر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہی تیری بریرہ ہو۔'' بابا نے پرسوچ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ زخمی مسکراہٹ چہرے پر سجائے سر جھٹک کر رہ گیا۔

''نہیں بابا۔ وہ بریرہ نہیں تھی۔ وہ بریرہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ وہ تو میرے سامنے ٹرین میں چڑھی تھی۔ میں آج تک اس کے انتظار میں قلی بنا اس ریلوے اسٹیشن کی خاک چھان رہا ہوں، اس آس میں شائد وہ مجھے معاف کر دے۔ کبھی اس کے دل میں میرے لیے رحم آ جائے اور وہ واپس چلی آئے۔ کاش، ایکبار وہ مجھے مل جائے تو میں اسے بتاؤں کی میں اس سے کتنا عشق کرتا ہوں۔'' وہ حسب عادت آنکھیں بند کیئے بول رہا تھا اور بابا چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔

''کاش تمہیں اپنی محبت کا ادراک پہلے ہو گیا ہوتا شانی تو نہ تم اس طرح خوار ہوتے اور نہ ہی بریرہ کو اتنا عرصہ تنہائی کا عذاب جھیلنا پڑتا۔'' اپنے پیچھے سے ابھرنے والی آواز سن کر وہ دونوں ایک دم پلٹے تھے۔

''وشمہ! تم یہاں؟'' کاشان ایکدم اٹھتے ہوئے حیرت سے بولا تو وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔

''ہاں میں۔ اور میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ میں تو کل ہی تمہیں دیکھ کر پہچان گئی تھی۔ ویسے تم نے خوب کفارہ ادا کیا اپنے جرم کا۔ ماننا پڑے گا۔'' وشمہ نے ہنستے ہوئے اپنے پیچھے چھپی بریرہ کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کیا تو کاشان ایک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

''شانی!'' بریرہ نے اس کے قریب آتے ہوئے بیقراری سے اس کا نام لیا تو وہ جیسے پھر سے جی اٹھا۔

''بریرہ! تم...... تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں کب سے یہاں بیٹھا تمہاری راہ دیکھ رہا تھا اور تم۔۔''

''یہ ہم سب سے خفا ہو کر پہاڑوں میں جا چھپی تھی۔ سب سے رابطہ توڑ کر خود کو بھی سزا دیتی رہی اور ہمیں بھی۔ وہ تو ماموں اور سکندر انکل نے مل کر کوشش کی تو ان محترمہ کا پتا چلا۔ اور یہ تو شائد ابھی بھی واپس نہ آتیں وہ تو شکر ہوا کہ کل میں نے تمہیں اس حلیے میں یہاں دیکھ لیا۔ پھر دینو بابا سے تمہاری ساری انفونکلوائی اور پھر چپکے سے تمہاری pics لے کر اسے سینڈ کیں تو اسے یقین آیا۔ یہ آج ہی صبح کی فلائٹ سے یہاں پہنچی ہے اور اس وقت تمہارے سامنے ہے۔'' وشمہ نے تفصیل سے اسے جواب دیا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

''یا اللہ۔!! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے بھی اپنے باؤ کو ہنستے مسکراتے دیکھا۔'' بابا دینو نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تو سب ان کے خلوص پر مسکرا دیے۔

''میں اگر واپس نہ آتی تو؟''

''تو میں نے اپنی ساری زندگی اسی جگہ، اسی طرح قلی بنا تمہارا انتظار کرتے گذار دینی تھی۔ چاہے کوئی کچھ بھی کہتا۔''

''اور تمہارے ڈیڈ اور بھائی؟ انہوں نے کچھ نہیں کیا تمہیں یہاں سے لیجانے کے لیے؟''

''بہت کچھ کیا، جو ان سے بن پڑا سب کیا۔ پوچھ لو چاہے بابا دینو سے۔ مگر میری بھی ایک ہی ضد تھی۔ جب تک ہاشم انکل کو ان کی خوشی، ان کی بیٹی واپس نہیں مل جاتی، تب تک سیٹھ سکندر کا بیٹا بھی انہیں نہیں ملے گا، یہیں اسی جگہ قلی بنا بیٹھا رہے گا۔''

وہ دونوں اردگرد سے بیگانہ ایک دوسرے سے سوال و جواب کیئے جا رہے تھے، اور ان پر چھایا گیا بوڑھا پیپل ان دو دیوانوں کے ملن کی خوشی میں جھوم رہا۔ ان سے کچھ فاصلے پر وشمہ سیٹھ سکندر اور ہاشم درانی کو کال ملا رہی تھی کہ وہ اس پلیٹ فارم پر آئیں اور اپنے جگر گوشوں کو واپس اپنی دنیا میں لے جائیں۔ بابا دینو شانی کے ساتھی قلیوں کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کرنے کو بیتاب تھے کہ ان کا ''باؤ'' اپنی محبت، اپنی زندگی کو پانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

☆☆☆

چوتھی منفرد پلیٹ فارم کہانی

# آخری بیٹا

فصیحہ آصف خان

اُس قلی کی کہانی جس نے غربت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنا آخری بیٹا پلیٹ فارم کے حوالے کر دیا تھا

گلی میں داخل ہوتے ہی گھر سے آتی ہکل ہکل جھگڑے کی آوازیں اور شور و غل نے شمس الدین کو ہمیشہ کی طرح سخت بدمزہ کر دیا تھا۔ غصہ عروج پر جانے کو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی ریں ریں نے اس کا دماغ الٹا کر رکھ دیا تھا۔ عمر کی چالیس بہاریں دیکھنے والا شمس الدین اپنی عمر سے دس سال بڑا دکھائی دیتا تھا۔

غربت، مہنگائی اور کثیرالاولاد نے اس کا میٹر گھما کے رکھا ہوا تھا۔

میلا سا پردہ اٹھا کر وہ کھلے دروازے اندر آ گیا۔ اندر کا نظارہ اسے مزید طیش دلانے لگا۔ چھوٹے سے سیمنٹ اکھڑے فرش پر جابجا گند بلا اٹا پڑا تھا۔ کاغذوں کا ڈھیر جہاز اور کشتیاں بنا کر ضائع کر دیے گئے تھے۔ اخباروں کے ٹکڑے، صحن میں سیلے برتنوں کا ڈھیر، بھنبھناتی مکھیاں برآمدے میں رکھی واحد چارپائی پر سر پر دوپٹہ باندھے ہائے ہائے کرتی نجمہ کی بیزار صورت۔

سات بچوں کی آمد کے بعد وہ آج کل پھر تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس بار اس کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ کمزوری، ناکافی خوراک اور اوپر گھر کے کام نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔

شمس الدین پر نگاہ پڑتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ بچے بھی ادھر ادھر کونوں، کھدروں میں جا بیٹھے۔ شمسو اپنے تلخ مزاج اور غصے کی وجہ سے مشہور تھا۔

پچھلی بار جب شمائلہ کو جنم دے چکی تو نجمہ نے مزید بچے پیدا کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر جس روح نے دنیا میں آنا ہوا سے کون روک سکا ہے۔

''کھانا دے مجھے۔'' شمسو حسب عادت رعب جماتا ہوا بولا اور غسل خانے میں جا گھسا۔ نجمہ بدقت اٹھی صحن میں بچوں کے کارنامے دیکھ کر بیزار ہوتی کونے میں نعمت خانے سے ہمسائی کے گھر سے آیا آلو گوبھی کا سالن اور رومال میں لپٹی چھپا کے رکھی دو روٹیاں چھابی میں رکھ کر لے آئی۔ سالن گرم تھا اور روٹی ٹھنڈی۔ شمسو وہیں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ جلدی جلدی بڑے بڑے نوالے نگلتا پانی کا گلاس چڑھاتا باہر کی جانب لپکا۔

دور سے ریل گاڑی کی وسل نے اس کے قدموں کو اور تیز کر دیا تھا۔

شمس الدین عرف شمسو ایک قلی تھا۔ بمشکل پوری ہوتی گزر اوقات نے اس کے اندر چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا مگر ایک فیصلہ جو اس نے چند دن قبل کیا تھا اس پر ابھی تک قائم تھا۔ نجمہ اس سے ایک فیصد بھی متفق نہ تھی مگر حالات اور مہنگائی نے شمسو کے اندر بے حسی پیدا کر دی تھی۔



گاڑی پلیٹ فارم پر رینگتے رینگتے رک گئی۔ آنے جانے والوں کا رش بڑھ گیا تھا۔ چیزیں بیچنے والے گاڑی کی کھڑکیوں سے لگے صدائیں لگا رہے تھے۔ شمسو بھاگ بھاگ کر گاہک تلاش کرنے لگا مگر آج کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس سے سامان اٹھواتا۔ جو لوگ اترے تھے وہ اپنا سامان اٹھائے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ شمسو مایوس سا ہوا کہ دور سے ایک فیملی آتی دکھائی دی۔ انہیں آنے میں شاید دیر ہوگئی تھی۔ شمسو بھاگ کر ان کے پاس آیا اور ان کے بھاری دو بکسے اٹھائے، مرد نے تشکر سے اس کی جانب دیکھا شمسو آگے آگے بھاگ رہا تھا اور وہ سب اس کی تقلید میں، یہاں تک کہ ان کا مطلوبہ ڈبہ آگیا۔ شمسو نے پھرتی سے سامان سیٹ کیا اور وہ سب اندر آگئے کہ گاڑی نے سیٹی ماری مرد نے جلدی سے بٹوا نکالا اور پانچ سو روپے شمسو کے حوالے کیے۔ شمسو نے ممنونیت سے انہیں سلام کیا اور رینگتی گاڑی سے اتر آیا۔ آج دیہاڑی لگ گئی تھی۔

☆......☆

تھوڑا بہت راشن لے کر وہ گھر آگیا۔ گھر کا ماحول کچھ تبدیل سا تھا۔ کچھ بچے سو گئے تھے اور کچھ جاگ رہے تھے۔ نجمہ نے سامان اندر جا کر رکھا۔ اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اب تو اس کی دوائیاں بھی ختم ہوچکی تھیں۔ روکھی سوکھی کھا کر وہ ان دنوں کو گزار رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھتے ہی شمسو کے فیصلے کو مزید تقویت ملی۔

یہ فیصلہ جذباتی انداز کا نہ تھا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے مسلسل سوچ رہا تھا۔ اسے نجمہ کی زندگی عزیز تھی۔ نجمہ اس بار اسے کہتی رہ گئی کہ وہ ابارشن کروا لیتی ہے نہ شمسو مانا اور نہ نجمہ کی صحت اجازت دیتی تھی۔

نویں مہینے کے آخری دن چل رہے تھے۔ اس کے حالات ایسے ہی تھے جیسے سرکاری ملازم کی جیب مہینے کے آخری دنوں میں سسکیاں لیتی ہے اپنی بے چارگی کی داستان سناتے ہوئے۔

شمسو نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا اور نجمہ کو بھی واضح کر دیا تھا کہ اب کچھ بھی ہوجائے وہ اپنے اس فیصلے پر ہر

صورت میں عمل درآمد کرے گا۔
شمسو جیسے کئی قلی حالات کی تشنگی کا شکار تھے۔ روزانہ کئی گاڑیاں آتی جاتیں، بے شمار لوگ اترتے اور چڑھتے شمسو جب بھی کسی اچھے کھاتے پیتے انسان کو دیکھتا اپنی کم مائیگی کا احساس بڑھ جاتا۔ کم از کم وہ اپنے اس بچے کو سسکتا ہوا نہ دیکھ سکے گا۔ اسے سوچ کر ایک جھرجھری تو آئی مگر اس نے خود پر قابو پالیا۔

☆......☆

نجمہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ عصر کے بعد اس کی حالت بے حد خراب ہوگئی تھی۔ شمسو جلدی سے خیراں دائی کو بلا لایا۔ وہ ادھیڑ عمر، سمجھدار خاتون تھیں پھر پہلے بھی سب بچے اس کے ہاتھوں پیدا ہوئے تھے۔
شمسو باہر سہمے ہوئے بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اندر سے آتی وقفے وقفے سے کراہنے کی آوازیں اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگتیں۔ وہ پہلو بدل کر رہ جاتا۔
”تیری بیوی کی حالت ٹھیک نہیں ہے، شمسو دعا کر۔“ آدھے گھنٹے بعد ماسی خیراں گھبرائی ہوئی باہر آئی اور شمسو کا دل دہل گیا۔
شمسو دل سے دعائیں کرنے لگا۔ اسے نجمہ عزیز تھی اور اس وقت تو اور بھی عزیز تر ہوگئی تھی۔ وہ مسلسل دعائیں کر رہا تھا کہ گھنٹے بعد ماسی خیراں دوبارہ آئی اور اسے زندگی کی نوید سنا گئی۔
”بیٹا ہوا ہے شمسو! اللہ کا جتنا شکر ادا کرکم ہے کہ نجمہ کو اس نے دوسری زندگی دی ہے۔ اب بس کردے۔ مت اس کی جان کا دشمن بن۔“ ماسی خیراں غصے میں بولے گئی۔
شمسو کے اندر اطمینان ہلکورے لینے لگا۔ وہ جلدی سے برابر والی ہمسائی کو بلا لایا کہ کچھ کھانے کا بندوبست کر سکے۔ زبیدہ اچھی رحمدل عورت تھی۔ اس نے آتے ہی دال چڑھا دی۔ بچے بھی بھوک سے بے تاب نظر آرہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ماسی خیراں اپنا کام مکمل کر کے جانے لگی تو شمسو نے بعد میں اسے پیسے دینے کا وعدہ کیا۔ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ اس کے حالات سے واقف تھی۔
بچے دال روٹی کھا کر اپنی اپنی جگہوں پر جا سوئے۔ شمسو نے بھی دو چار لقمے زہر مار کیے۔ اس کے اندر کشمکش جاری تھی۔ دماغ میں ہولے اڑ رہے تھے۔
زبیدہ تھوڑی دیر نجمہ کے پاس بیٹھی پھر اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر چلی گئی کہ نجمہ کے لیے کچھ کھانا بنا کر لے آئے۔

☆......☆

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سخت سردی میں یہ وقت آدھی رات سے کم کا نہ لگتا تھا۔ شمسو نے ایک سرد آہ بھری اور ہولے ہولے چلتا نیم مردہ سی نجمہ کے پاس آگیا۔ آہٹ پر اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں۔ جو شمسو کو دیکھتے ہی بھر آئی تھیں۔ پھر اس نے ساتھ لیٹے نوزائیدہ مولود کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ چند گھنٹوں کا معصوم فرشتہ سا بچہ، نجمہ کا جی چاہا کہ وہ بلک بلک کر رو پڑے۔
وہ جانتی تھی شمسو اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے گا اور اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے زبانی ہی روک سکتی کیا زور آزمائی کیا کرتی۔
”لا...... لادے اسے مجھے۔ گاڑی کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔“ شمسو نے اپنی بوسیدہ گرم چادر خود پر لپیٹتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا تو نجمہ کی سسکیاں تیز ہوگئیں۔
”بس اب بند کر رونا۔ سمجھنا یہ مردہ پیدا ہوا تھا۔“ شمسو دل پر پتھر رکھ کر بدقت تمام بولا۔ اور بچے کو اچھی طرح گرم پرانے سے کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر اس کا فیڈر تھامے باہر آگیا اور مڑ کر نہ دیکھا کہ نجمہ کے رونے کی آواز کہیں اس کے قدم نہ جکڑ لے۔
وہ تیز تیز چلتا دروازے کے باہر آکر کنڈی لگا کر اسٹیشن کی طرف جانے لگا۔ بچے نے ذرا سی آواز نکالی تو اس کے منہ میں فیڈر دے دیا۔ جس میں ذرا سا دودھ تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہو کا عالم اور خاموشی تھی۔ وہ چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا پلیٹ فارم کی طرف بڑھنے لگا اور نسبتاً ایک سنسان جگہ کا انتخاب کیا سب جگہیں اور راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔
چھوٹے سے شہر کا یہ معمولی سا پلیٹ فارم تھا۔ اس وقت کئی ٹھیلے بند تھے۔ مبادا گاڑی کے آنے کا وقت ہونے لگا۔ شکر تھا کہ پندرہ بیس منٹ لیٹ تھی اور رات کا اندھیرا تھا۔ شمسو کو اپنے کام کی جلدی تھی۔ اس وقت چہل پہل بہت کم تھی کہ یہاں گاڑی رات بھر میں رکتی تھی۔ یہاں لوگ بھی دکھائی نہ دے رہے تھے۔ قدرت پوری

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اس پر مہربان تھی۔ شمسو نے جلدی سے بچے کو ایک خالی بینچ پر لٹا دیا اور اس کے اوپر فیڈر رکھ دیا اور خود تیز تیز چلتا ایک طرف ہو گیا مگر اس کی نگاہ بینچ پر تھی۔ گاڑی نے یہاں صرف پانچ منٹ قیام کرنا تھا۔

شمسو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آج وہ فیصلہ کر چکا تھا جو اس کا اختتام تھا۔ چند لوگ بینچ کے پاس سے گزرے مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ یہاں تک کہ گاڑی کی آمد اور گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی۔ شمسو کی نگاہوں میں بینچ پر پڑا اس کا بچہ تھا۔ اپنا خون تھا مگر وہ بے حس ہو چکا تھا۔ گویا کوئی ڈرامہ دیکھ رہا ہو۔ گاڑی رکی۔ چند لوگ اترے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کوئی پانی بھرنے لگ تو کوئی چائے کی طلب میں گاڑی سے باہر آیا۔ بینچ سے ذرا فاصلے پر ایک ٹی اسٹال تھا۔ اتنے میں گاڑی سے ایک عمدہ لباس والا پینتیس، چالیس سالہ آدمی اترا اس کے ہاتھ میں چائے والا بڑا مگ تھا۔ وہ جیسے ہی بینچ کے قریب سے گزرا اسے بچے کی رونے کی آواز آئی۔ وہ رک کر ٹھٹکا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کوئی بھی پاس نہ تھا۔ اس نے ذرا سا کمبل ہٹا کر بچے کا چہرہ دیکھا اور دیکھتا وہ گیا۔ روشن پیشانی والا چاند جیسا بچہ تھا۔ نومولود نے جیسے اس کی ساری توجہ کھینچ لی تھی۔

اس کی ماں کہاں ہے۔ نہ سامان نہ کچھ اور؟ وہ اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا کہ دو منٹ گزر گئے۔ شمسو دل پر ہاتھ رکھے۔ لبوں کو بھینچے، آنسو روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس آدمی نے بچے کو اٹھا لیا۔ آس پاس دیکھا کوئی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ سوائے شمسو کے۔

اس آدمی نے بچے کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹا مگ اور فیڈر تھاما اور چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا تیز تیز چلتا یہاں تک کہ اپنے مطلوبہ ڈبے کے اندر آ گیا۔ شمسو کا دل کٹ کٹ کر باہر آنے لگا۔ اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ گاڑی کی رفتار جیسے جیسے تیز ہوئی اسی رفتار سے شمسو کے آنسو بہنے لگے تھے۔ نومولود جس کا نام اس نے آفتاب رکھا تھا کہ اس کا مستقبل روشن ہوگا۔ اس لیے اسے خود سے جدا کیا۔ غربت کے ہاتھوں ستایا ہوا شمسو کیسے نہ روتا۔

اس کی اولاد تھی، اپنا لہو تھا، جگر گوشہ تھا۔ جسے وہ خود انجانے رستے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے کون تھا؟ کوئی درد مند ہی لگتا تھا۔ شمسو نے خود کو تسلی دی۔ صافے سے چہرہ پونچھتا گھر کی طرف آنے لگا۔

☆......☆

وحید احمد جیسے ہی اپنی سیٹ پر ساتھ بیٹھی بیوی کے پاس آیا وہ اس کے ہاتھوں میں بچہ دیکھ کر چونک کر کھلی آنکھوں سے حیرت سے دیکھنے لگی۔ وحید نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ وہ اوکاڑہ سے بیٹھے تھے اور گاڑی میاں چنوں کے اسٹیشن پر رکی تھی۔ جہاں سے یہ بچہ ملا تھا۔

اب ان کی منزل کراچی تھی۔ کراچی انسان جہاں کھو جاتا ہے۔ انسانوں کے سمندر میں وہاں سب کو اپنے کام سے مطلب تھا۔ وحید اور ثریا کی شادی کو 6 برس بیت چکے تھے وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور آج انہیں یوں لگا جیسے رب نے انہیں اولاد سے نواز دیا ہو۔ ثریا حیران اور متجسس تھی جاننے کے لیے۔ بچہ اس کی گود میں کسمسانے لگا۔ ثریا نے اس کا چہرہ دیکھا تو بے اختیار اس کے روشن ماتھے پر اپنے سسکتے لب رکھ دیے تو جیسے ممتا کو قرار آ گیا۔

میں اس کا نام زید رکھوں گی۔ اسے صحابی رسول حضرت زید بن حارثؓ سے بے حد عقیدت تھی۔ وہ بھی لے پالک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پالا تھا۔ سو ثریا نے اس کا نام زید رکھ دیا اور اسے سینے میں بھینچ لیا۔

☆......☆

اور اس پلیٹ پر اب بھی کئی سالوں سے ایک بوڑھا ناتواں ریل گاڑی آمد پر سسک اٹھتا ہے۔ آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔ وہ شمسو تھا۔

دس سال گزر گئے۔ چوبیس گھنٹے میں جتنی بار گاڑیاں آتی، جاتیں شمسو کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ کبھی کبھار اسے پچھتاوا ہونے لگتا جہاں اور بچے پل رہے تھے وہیں آفتاب بھی پل جاتا مگر کسی جذباتی لمحے میں کیے گئے فیصلے پر وہ آج تک دکھ کے تیسرے سمندر میں غرق تھا۔

پھر اسے تسلی ہوئی کہ اس کا بیٹا ایک اچھا انسان بن رہا ہوگا۔ خوش حال اور روشن مستقبل اس کے بانہیں کھولے اس کا منتظر تھا۔ جب یہ سوچ ذہن میں اترتی تو اسے اپنا فیصلہ درست معلوم ہوتا۔

☆☆☆

پانچویں منفرد پلیٹ فارم کہانی

# خودداری

طاہر محمود بٹ

اُس خوددار قُلی کی داستان، جسے اپنی بیٹیوں کے جہیز کا بوجھ ڈھونا تھا

رات کے دو بجے تھے۔ اس وقت ریلوے اسٹیشن پر کچھ خاص گہما گہمی دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی چلتن ایکسپریس پلیٹ فارم پر آ کر رکی تھی۔ ٹرین سے اترنے والے مسافروں کی تعداد کچھ خاص نہیں تھی، یہ اسٹیشن بھی چھوٹا سا تھا۔ یہاں گاڑیاں بہت کم وقت کے لیے رکتی تھیں اور وہ بھی خاص خاص۔ زیادہ تر تو بس تیز رفتاری سے گذرتی ہی چلی جاتی تھیں۔

"بابو صاب! میں آپکا سامان اٹھالوں؟" رامس اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ چھٹیاں گذارنے قریبی قصبے میں جا رہا تھا۔ وہاں اس کا آبائی گھر تھا، اس کی والدین اور بھائی اپنی فیملی کے ساتھ وہیں رہائش پذیر تھے۔ رامس کو اسلام آباد میں بہت اچھی جاب ملی تو وہ وہاں شفٹ ہو گیا۔ لیکن وہ اور اس کے بچے ہمیشہ چھٹیاں گذارنے آبائی گھر ہی آتے تھے۔ یہاں بھی سب کو انکا انتظار رہتا تھا۔ اب بھی وہ پلیٹ فارم پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ بھائی ابھی تک اسے لینے کیوں نہیں آئے کہ اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"بابو صاب۔!! آپ کا جو دل چاہے مجھے دے دیجئے گا، مگر مجھے یہ بوجھ اٹھا لینے دیں۔ مجھے اس وقت پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔" رامس کے سامنے آتے ہوئے اس قلی نے عاجزی بھرے انداز سے کہا تو اس کا دل پسیج گیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن تم یہ سارا سامان اٹھالو گے۔؟ یہ بہت بھاری ہے یار، اپنے کسی ساتھی کو بھی بلا لو۔ میں تم دونوں کو اچھے پیسے دے دوں گا۔" رامس کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ لگ بھی اس قابل رہا تھا۔ عمر رسیدہ، کمزور، ہڈیوں کا ڈھانچہ اور اس پر اس کی بڑھی ہوئی داڑھی، میلی خورہ ملگجا سا لباس اور اس پر سرخ رنگ کی مخصوص قلیوں والی وردی۔ رامس کو اس کی ظاہری حالت دیکھ کر دلی تکلیف ہو رہی تھی۔

"نہیں بابو صاب۔ آپکو اللہ کا واسطہ۔ آپ کسی کو مت بلائیں۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ آپ سارے پیسے مجھے ہی دے دینا۔ میں یہ سارا سامان اٹھالونگا۔ ایک بار میں ہی اٹھالونگا۔ آپ فکر مت کریں آپکو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اس نے جلدی سے بھاری سوٹ کیس اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ لیا۔ ایک بیگ دائیں طرف لٹکایا اور دوسرا بائیں طرف، ہینڈ کیری اور باسکٹ دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہ امید بھری نگاہوں سے رامس کو دیکھنے لگا۔

"چلیے بابو صاب۔!! آپ جہاں کہیں گے، میں



وہاں تک آپکو چھوڑ آؤنگا۔'' قلی نے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا تو رامس روشنی کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی حیرت سے اس کمزور قلی کی ہمت دیکھ رہی تھی۔ روشنی نے رامس کی طرف دیکھ، دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلہ خیال کیا اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔

''ٹھیک ہے بھائی۔ تم ہی لے چلو۔ مگر احتیاط سے۔'' رامس نے اس کے ہاتھ سے ہینڈ کیری کا ہینڈل لیتے ہوئے کہا۔ روشنی نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ سے باسکٹ لینی چاہی تو اس نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''نہیں بی بی جی۔!! آپ فکر مت کریں۔ میں سب کوئی چیز ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ آپ بس، یہاں سے نکلنے کی کریں۔ رات بہت ہو چکی ہے اور پتا نہیں باہر کوئی ٹیکسی بھی آپکو ملتی یا نہیں۔'' وہ فکرمندی سے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا گیا تو رامس اور روشنی بھی دونوں بچوں کو ساتھ لیے اس کے پیچھے چل پڑے۔ پلیٹ فارم سے باہر آتے آتے وہ قلی ہانپ گیا تھا، مگر اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا، کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچنے دیا تھا۔ ابھی وہ لوگ اسٹیشن سے باہر ہی نکلے تھے کہ بڑے بھیا کی گاڑی ان کے پاس آ کر رک گئی۔ دونوں بچے تایا کو سامنے دیکھ کر خوشی سے چلاتے ہوئے ان سے لپٹ گئے۔ رامس اور روشنی نے بھی سکون کا سانس لیا۔ قلی سامان اٹھائے ان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ بھیا سے ملنے کے بعد رامس کا دھیان قلی کی طرف گیا۔ اس نے فوری طور پر اس کے سر سے سوٹ کیس اتروایا اور پھر اس کی مدد سے سارا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھوا دیا۔ روشنی اتنی دیر میں بچوں کو ساتھ لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ بھیا رامس کے انتظار میں باہر ہی کھڑے تھے، رامس نے اپنی جیب سے والٹ نکالا ہو سو کے چند نوٹ نکال کر قلی کی طرف بڑھائے۔ رامس کو والٹ نکالتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں امید کے کئی دیئے جل اٹھے تھے، مگر اس کے ہاتھ میں صرف چند نوٹ دیکھ کر یہ جوت یکلخت بجھ گئی تھی۔ رامس نے تو دھیان نہیں دیا، مگر بھیا، بڑے غور سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ قلی نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو رامس

حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"لے لو بھائی۔ تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔ لیتے کیوں نہیں تم۔؟" قلی نے کوئی جواب نہیں دیا، بس بجھے بجھے انداز سے ہاتھ آگے بڑھا کر پیسے پکڑ لیے۔

"مجید بابو آپ؟ اور یہاں، وہ بھی اس حلیے میں۔؟" بڑے بھیا شاید اسے پہچان گئے تھے، اسی لیے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولے تھے۔ قلی نے ایکدم گھبرا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے واپس پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی، مگر تب تک بھیا اس تک پہنچ چکے تھے اور اس کا بازو بھی تھام چکے تھے، اس لیے وہ چاہ کر بھی نہ بھاگ سکا۔

"مجید بابو۔!! جب تک آپ مجھے اپنے یہاں ہونے کی وجہ نہیں بتائیں گے، میں آپکو جانے نہیں دوں گا۔" بھیا نے اسے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آ گئے۔

☆☆☆

"لالہ جی! آپ تو جانتے ہی ہیں۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔ میں نے ساری عمر ایمانداری اور محنت سے رزق حلال کمایا ہے۔ آپکے سامنے ساری زندگی ہیڈ کلرکی کی، مگر رشوت اور بے ایمانی کو اپنے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ اس سفید پوشی کی حالت میں بھی میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو پڑھایا، لکھایا مگر میں ان کے لیے بھاری جہیز نہیں جمع کر سکا۔ آج میری بیٹیاں شادی کے قابل ہو گئی ہیں۔ میں ان کے ہاتھ پیلے کر کے انہیں عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہتا ہوں مگر کیا کروں لالہ جی۔ کوئی بھی میری بیٹیوں کو خالی ہاتھ لے جانے کو تیار نہیں۔ کلرکی کی آمدن اتنی نہیں کہ میں اس میں گھر بھی چلا سکوں اور بیٹیوں کے لیے جہیز بھی بنا سکوں، اسی لیے میں رات کو ریلوے اسٹیشن چلا جاتا ہوں۔ رات بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک قلی بن کے اپنی بچیوں کے جہیز کے لیے لوگوں کو بوجھ ڈھوتا ہوں اور پھر صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک کلرکی کر کے گھر کا چولہا جلانے کو ایندھن کا بندوبست کرتا ہوں۔" باؤ مجید انکی بیٹھک میں بیٹھا ان کے باباجان کے سامنے پرت پرت کھل رہا تھا۔

باباجان نے اپنے دل میں گہرے دکھ کو اترتے محسوس کیا تھا۔

"مجید پتر! تم مجھ سے تو بات کر کے دیکھتے، ہم مل جل کر کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتے۔ اس طرح دہری دہری محنت تو تمہیں بیمار کر دے گی۔ اب بھی تم اپنی حالت دیکھو، کتنے بوڑھے اور بیمار لگ رہے ہو تم۔" باباجان نے دکھ سے بھرے انداز سے کہا تو باؤ مجید کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"لالہ جی۔!! ساری زندگی میں نے خودداری اور ہمت سے گذاری ہے۔ اب اس عمر میں میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتا تھا، اسی لیے کسی سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا اور جو میری سمجھ میں آیا، میں نے وہ راستہ اپنا لیا۔"

"ٹھیک ہے باؤ مجید صاحب۔!! لیکن اب تو ہمیں سب کچھ پتا چل چکا ہے ناں، اور برسوں پرانے ہمسائے ہونے کے ناتے ہمارا آپ پر اور آپکی بچیوں پر پورا حق ہے۔ آپ فکر مت کریں۔ آپ کی بیٹیاں ہماری بھی بیٹیاں ہیں اور ہم ان کی شادیاں اسی طرح کریں گے جیسے کہ عزت دار باپ کی بیٹیوں کی شادی ہوتی ہے۔" بڑے بھیا نے ان کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا تو رامس اور لالہ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی تائید کی تھی۔

☆☆☆

لالہ جی نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، انہیں چھٹیوں میں باؤ مجید کی دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اس کار خیر میں رامس اور روشنی کے ساتھ ساتھ سب گھر والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بیٹیوں کے فرائض سے بہ احسن فارغ ہونے کے بعد باؤ مجید لالہ جی اور انکی فیملی کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اب ان کے سر سے بیٹیوں کا بوجھ اتر چکا تھا، اس لیے اب انہیں کبھی بھی دوسروں کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اب کبھی بھی رات بارہ سے صبح پانچ بجے تک کی ڈیوٹی دینے والے اس قلی کو پھر کسی نے نہیں دیکھا۔

☆☆☆

ملن اور جدائی کی وسل لیے
پلیٹ فارم نمبر کی 8 سچ بیانیاں، راحت مکانیاں، ستم زمانیاں
جن میں آنسو، قہقہے، وفائیں، بے وفائیاں، ہجر و وصال کے تمام رنگ یکجا ہیں

# قید سے رہائی تک

ثمینہ طاہر بٹ

اُس گدی نشین کی کہانی، جو بھول گیا تھا کہ مالک اوپر والا ہے

وہ ایک کم آبادی والا غیر آباد سا اسٹیشن تھا جس پر گاڑیاں بہت کم وقت کے لیے رکتی تھیں۔ خاص طور سے رات کے دو بجے آنے والی چلتن ایکسپریس جو آخری گاڑی کہلاتی تھی، وہ وہاں صرف پانچ منٹ کے لیے رکتی تھی۔ اس وقت بھی اس اسٹیشن پر ہو کا عالم تھا۔ آخری گاڑی کو وہاں سے روانہ ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ ایسے میں عام طور پر سارا اسٹیشن ہی خالی پڑا ہوتا تھا۔ کیونکہ اس وقت یہاں سے آنے اور جانے والے مسافر نہ ہونے کے برابر ہی ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت یہاں کوئی تھا۔ کوئی ایسا جسے عام حالت میں یہاں دیکھ کر کوئی بھی یقین نہ کرتا۔ اسٹیشن کے کونے میں پڑے بنچ پر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کھڑا اس کا خاص الخاص کارندہ بھی اس کی کی طرح سر جھکائے سوچوں میں گم بت بنا کھڑا تھا۔

☆☆☆

رات کا سفر اپنی مخصوص رفتار سے جاری تھا۔ رات کے ساتھ ساتھ ٹرین کا سفر بھی پوری رفتار سے طے ہو رہا تھا۔ ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے۔ لڑکے کی عمر پچیس، چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ لڑکی بمشکل اٹھارہ انیس سال کی لگتی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی جھلک نمایاں تھی۔ لڑکی زیادہ ڈری سہمی لگ رہی تھی جبکہ لڑکے کے حواس پھر بھی کچھ بہتر دکھائی دیتے تھے۔ حالانکہ اس کے بازو پر شانے کے قریب کسی گہری چوٹ کا نشان تھا۔ چوٹ پر لڑکی کی چادر کے پھٹے پلو کی پٹی باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر پٹی کی ظاہری حالت بتاتی تھی کہ زخم سے خون برابر رس رہا تھا۔

’’تم...... تم ٹھیک ہو ناں؟ تمہیں درد تو نہیں ہو رہا؟‘‘ لڑکی نے اس کے زخم کو ہولے سے چھوتے ہوئے کوئی پچیسویں بار یہی سوال کیا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

’’میں ٹھیک ہوں پری۔ تم پریشان مت ہو۔‘‘ لڑکے نے محبت سے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا تو لڑکی کے حسین چہرے پر حیا کی لالی سی پھیل گئی۔

''تم نے مجھے پھر پری کہا؟'' وہ شرماتے ہوئے بولی تو لڑکا ہنسنے لگا۔

''کیونکہ تم پری ہو۔ میری زندگی میں آنے والی سنہری پری۔ جس نے آتے ہی میرا سب کچھ بدل دیا۔ میری حیثیت، میرا مقام، حتیٰ کی میرا دل بھی۔'' لڑکے نے اسکا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے کہا تو لڑکی ہنس دی۔

''اور تم دیو ہو۔ ایسے دیو، جس نے مجھے اپنا اسیر کر لیا۔ میں کیا تھی، اور تم نے مجھے کیا بنا دیا۔'' لڑکی نے بھی اسی کے انداز سے جواب دیا تو لڑکا کھل کر ہنسا۔ لڑکی کی شرمیلی ہنسی بھی اس کے ساتھ شامل ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اردگرد سے بے نیاز ایک دوسرے میں مگن پیار بھری میٹھی باتیں کیئے جا رہے تھے۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی، اور ان کی منزل کیا تھی؟ وہ ابھی خود بھی انجان ہی تھے۔

☆☆☆

آستانہ عالیہ پر اس وقت خوب رونق چھائی ہوئی تھی۔ نوچندی جمعرات کی محفل اس وقت اپنے عروج پر تھی۔ شاہ سرکار اپنے تختِ عالیہ پر جلوہ افروز تھے۔ اور سامنے بیٹھے عقیدت مندوں سے بھاری نذرانے وصول کر رہے تھے۔ ان اکا مصاحبِ خاص غلام علی ان کے تخت کے پاس کھڑا سب زائیرین کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہی کام تھا۔ وہ شاہ سرکار کا ایسا خادم تھا کہ شاہ کے ایک حکم پر اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کر انہیں پیش کر سکتا تھا۔ اس کی عقیدت کا عالم ہی کچھ اور تھا، اور شاہ سرکار کو اس کی یہی ادا بے حد پسند تھی۔ اس لیے وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ غلام علی انکا ہر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیا کرتا تھا۔

رب نواز بھی انکا ایسا ہی عاشق اور دیوانہ مرید تھا۔ اس نے شاہ کے حکم پر اپنا سب کچھ آستانہ عالیہ پر قربان کر دیا تھا۔ اور اب اپنی آخری پونجی بھی اپنے پیرومرشد شاہ سرکار پر قربان کرنے لے آیا تھا۔



''شاہ سرکار! یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے مراد۔ میں اسے آپکے قدموں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ قبول فرما کر اپنے اس خادم کا مان بڑھا دیں۔'' رب نواز نے اپنے ساتھ بیٹھے وجیہہ و شکیل نوجوان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے عاجزی و انکساری سے کہا تو شاہ سرکار نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں نوجوان پر گاڑ دیں۔ ان آنکھوں سے مقناطیسی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ جنہوں نے ایک ہی لمحے میں مراد کی روح کو جھلسانا شروع کر دیا تھا۔ وہ عجیب سی بے چینی اپنے رگ و پے میں دوڑتی محسوس کرنے لگا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور باپ کی شکل دیکھنے لگا جو عقیدت سے چور شاہ کے قدموں پر ہاتھ رکھے اسے عاجزی سے دیکھ رہا تھا۔

''ہوں۔ سوچ لو رب نواز۔ تم بہت بڑا سودا کرنا چاہ رہے ہو۔ ایک بار تمہارا بیٹا ہماری درگاہ کا خادم بن گیا، تو پھر تم اس پر کوئی حق نہیں جتا پاؤ گے۔ یہ جیئے گا بھی یہیں اور مرے گا بھی اسی جگہ۔ کیا تمہیں منظور ہے؟'' شاہ سرکار کی پرجلال آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو مراد کا دل چاہا اباجی کا ہاتھ جھٹک کر وہاں سے اٹھ بھاگے، اور ایسا بھاگے کہ پلٹ کر بھی پیچھے نہ دیکھے۔ مگر وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔ شاہ کی نگاہوں کا طلسم اسے جکڑ چکا تھا۔ وہ خود کو پتھر سے بھی بھاری محسوس کر رہا تھا۔ سو چپ چاپ سر جھکا کر رہ گیا۔

''مجھے منظور ہے سرکار۔ سب کچھ منظور ہے۔ بس آپ میرے پتر کو اپنے قدموں میں تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ میری اور میرے پرکھوں کی بخشش کا شائد یہی ذریعہ بن جائے۔'' رب نواز کی عاجزی کا انداز ہی نرالا تھا۔ اپنی سادگی میں ایسی جاہلانہ کفریہ بات کہہ کر بھی بخشش کا طلبگار تھا۔ مراد نے کوفت سے باپ کو دیکھا مگر پاس ادب مانع تھا، سو لب بھینچ کر رہ گیا۔ غلام علی اس کی ایک ایک جنبش پر بھرپور نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ رب نواز تو اپنی عقیدت میں بیٹا قربان کرنے آ گیا، مگر شاید بیٹے کا ایسا کوئی پروگرام تھا ہی نہیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے رب نواز۔ آج سے یہ لڑکا ہمارا غلام ہوا۔ یہ اب درگاہ میں ہی رہے گا۔ ہمارے مریدوں اور مہمانوں کی خدمت کرے گا۔ یہیں سوئے گا، یہیں سے کھائے گا۔ اب تمہارا اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ یہ اب ہمارا اور اس درگاہ کا خدمتگار ہے۔ تم اب جا سکتے ہو۔ اگلی بار درگاہ آؤ اس سے باپ بن کر نہیں، ہمارا مرید بن کر ملنا۔ سمجھ گیے۔'' شاہ سرکار نے مراد کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو رب نواز کی خوشی سے باچھیں ہی کھل گئیں۔

''جو حکم سرکار۔ جو حکم۔ جیسا آپ فرمائیں گے، میں ویسا ہی کرونگا۔ اگر آپ حکم دیں گے تو میں یہاں قدم بھی نہیں رکھونگا۔'' وہ شاہ کے قدموں میں جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مراد نے باپ کو بے یقینی سے دیکھا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف متوجہ ہی کہاں تھے۔

''نہیں، نہیں۔ یہ درگاہِ عام ہے۔ اس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اور تم تو ہمارے بہت خاص مرید ہو رب نواز۔ تمہارا جب دل چاہے، تم یہاں آ سکتے ہو۔ کوئی پابندی نہیں، کوئی ممانعت نہیں۔ بس، اب مراد ہمارا ہے۔ اس سے ذرا دور ہی رہنا ہوگا تمہیں۔'' شاہ نے بڑے کروفر اور شان سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا تو رب نواز ان کی اس عنایت پر بھی نثار ہو گیا۔

''لے پتر۔!! اب میں تجھ سے وداع لیتا ہوں۔ تو جم کے شاہ سرکار کی خدمت کر۔ دیکھ پتر، مجھے تیری طرف سے کوئی شکائت نہیں ملنی چاہیے۔ بس تو اتنا یاد رکھنا کہ تیری اس خدمت کے بدلے تیرے باپ دادا کی عاقبت سنورنے والی ہے۔ سمجھ گیا ناں میری بات اچھی طرح سے؟'' بیٹے سے آخری بار گلے ملتے ہوئے رب نواز نے اسے کہا تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ جذبات کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ آواز جیسے گلے میں ہی کہیں اٹک گئی تھی۔

وہ باپ سے کبھی اس طرح جدا ہوا ہی نہیں تھا کہ پھر ملنے کا یارا ہی نہ رہے۔ ماں کا ساتھ تو بہت پہلے چھوٹ چکا تھا، اب یہ دونوں باپ بیٹا ہی تھے ایک دوسرے کا سہارہ، اور جانے اب اباجی کو کیا سوجھی کہ اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھے۔

مراد اپنے باپ کا فرمانبردار بیٹا تھا، سو ان کی حکم پر سر جھکا گیا۔ رب نواز اسے درگاہ میں چھوڑ کر واپس چلے گئے اور شاہ سرکار نے اس کی طنابیں غلام علی کے ہاتھ میں تھما دیں۔ غلام علی مراد کی تربیت پر معمور ہو گیا۔ ویسے بھی وہ رب نواز کا پرانا یار دوست تھا، اس لحاظ سے مراد کو بھتیجا ہی سمجھتا تھا، سو جی جان سے اس کی تربیت کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ صبح کے اجالے کی طرح حسین اور پاک تھی۔ اس پر کبھی کسی غیر مرد کی نظر تک نہیں پڑی تھی۔ اس کی دنیا اس کی حویلی تک ہی محدود تھی۔ حویلی سے باہر کیا ہے، کیسا ہے، کیوں ہے؟ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ بہت معصوم اور بھولی بھالی نازک سی یہ دوشیزہ شاہ سرکار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ نہ کبھی اسکول گئی، نہ کسی مدرسے کا منہ دیکھا۔ جو کچھ بھی پڑھا پڑھایا اپنے بابا اور ماں جی سے۔ شاہ سرکار کو بیٹی اور بیوی کا کسی کے سامنے آنا پسند نہیں تھا، اس لیے وہ کبھی درگاہ بھی نہیں گئی تھی۔ ہاں ماں جی البتہ زنان خانے میں آنے والی عورتوں سے مل لیا کرتیں۔ محفل میں بھی شامل ہوا کرتی تھیں، مگر فریدہ کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ اس لیے اور ان سب خرافات سے دور رہتی تھی۔ اس نے ایک بولنے والا طوطا پال رکھا تھا۔ یا پھر اس کی ایک خاص ملازمہ نوری تھی، جس سے وہ اپنے دل کی باتیں کرتی۔ بی بی صاحبہ کو اس کی بڑی فکر رہتی۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کے ہاتھ بروقت ہی پیلے ہو جائیں، مگر شاہ سرکار تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔

''اوہ! ہم نے ہزار بار کہا ہے کہ اس طرح کی فضول باتیں ہمارے ساتھ مت کیا کرو۔ جب دیکھو ایک ہی بات، ایک ہی قصہ۔ اگر تمہارے پاس کوئی اور بات نہیں ہے کرنے کی تو مت آیا کرو ہمارے پاس۔ پڑی رہا کرو وہیں اپنے حجرے میں۔ بلاوجہ ہی اتنا وقت برباد کر دیا ہمارا۔'' ہمیشہ کی طرح جیسے ہی بی بی صاحبہ نے انہیں فریدہ کے لیے آنے والے رشتے کی بابت بتانا چاہا، وہ ان پر ہی الٹ پڑے تھے۔

''آپ کے خیال میں بیٹی کی بروقت شادی فضول بات ہے؟ کمال کرتے ہیں آپ شاہ صاحب۔ لوگ تو ترستے ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور کب وہ اپنے فرض کو احسن طریقے سے ادا کر کے فارغ ہوں، اور آپ ہیں کہ......!''

''وہ عام لوگ ہوتے ہیں صفورہ بی بی عام لوگ۔ اور ہم۔ ہم شاہ سرکار ہیں۔ شاہوں کے شاہ۔ شاہ سرکار۔ ہمارا مقابلہ کرنا ان عام کمین لوگوں کے بس کی بات کہاں؟ تم ایسے ہی اپنا خون مت جلایا کرو۔ ہماری بیٹی کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے کہ کسی بھی عام شخص کی بیوی بن جائے، اس کی جوتیاں سیدھی کرے، اس کے بچے پیدا کرے اور پھر عام عورتوں کی طرح کسی عام سے مرد کی خدمتیں کرتی کرتی مر جائے۔ نہیں۔ ہماری بیٹی شاہ زادی ہے۔ شاہ زادی۔ اور ہم نے اسے کسی خاص مقصد کے لیے پالا ہے۔ کسی کی بیوی بن کر اس کی غلامی کرنے کے لیے نہیں سمجھیں۔'' بی بی صاحبہ کی بات کاٹتے ہوئے شاہ سرکار نے غرور بھرے انداز سے کہا تو بی بی خوف سے کانپ گئیں۔

''اور وہ خاص مقصد کیا ہے؟ ایک ماں ہونے کے ناطے مجھے بھی علم ہونا چاہیے۔'' خود پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے جی کڑا کر کے کہہ ہی ڈالا تھا۔

''ویسے تو ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے، مگر چونکہ تم نے ماں بن کر پوچھا ہے تو بتا دیتے ہیں۔ ہم اپنی گدی کی وارث اپنی بیٹی کو بنائیں گے۔ درگاہ شریف اور آستانہ عالیہ کی وارث ہماری بیٹی ہوگی۔ ہمارے ساتھ تخت عالیہ پر بیٹھا کرے گی۔ ہم اسے ولائت دیں گے اور وہ شاہ سرکار کی جانشین عالیہ

فریدہ شاہ بنے گی۔'' ان کے خطرناک عزائم سن کر بی بی کا سانس رک سا گیا تھا۔

''شاہ صاحب۔!! یہ آپ اچھا نہیں کر رہے؟ بیٹیاں گھر بٹھانے کی چیز نہیں ہوتیں۔ انہیں تو راجے مہاراجے، پیر پیغمبر گھر نہیں بٹھا پائے تو آپ اور میں کیا چیز ہیں؟'' بی بی صاحبہ کا صدمے سے برا حال تھا اسی لیے بغیر کچھ سوچے سمجھے بولتی چلی گئیں۔ حالانکہ انہیں اتنا بولنے کی نہ تو عادت تھی اور نہ ہی اجازت۔ مگر شاہ سرکار کی باتوں نے انکا جیسے دماغ ہی الٹ دیا تھا۔

''لیکن ہم بٹھا کر دکھائیں گے۔ ہم شاہ ہیں۔ فرید اللہ شاہ۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ سمجھیں تم۔؟''

بی بی صاحبہ ان کے غرور اور تکبر کی تاب نہیں لا سکتی تھیں اسی لیے ان کی کڑوی کسیلی سن کر روتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل گئیں۔ اور کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگی چھپ چھپ کر ان کی باتیں سنتی نوری نے فریدہ کے کمرے کی راہ لی۔

''کیا؟؟ بابا جان ہمارے لیے ایسا سوچ رہے ہیں؟ نہیں نوری نہیں۔ ہمیں نہیں چاہیے یہ گدی شدی۔ تمہیں تو اچھی طرح پتا ہے ناں کہ ہم ان باتوں کے کتنا گھبراتے ہیں۔'' فریدہ کے ہاتھ پیر نوری کی باتیں سن کر پھول گئے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود کو کسی ایسی جگہ چھپا لے کہ اس کے بابا کی نظر ہی اس پر نہ پڑ سکے۔

''چھوٹی بی بی! آپ چاہے کتنا ہی کیوں نہ گھبراتی رہیں۔ شاہ سرکار نے جو سوچ لیا ہے، وہ کر کے رہیں گے۔ یہ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔'' نوری اس سے بھی زیادہ افسردہ تھی۔ ملازمہ تھی تو کیا ہوا، دونوں کا بچپن ایک ساتھ ہنستے کھیلتے گذرا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسری کی واحد دوست اور ہمراز تھیں۔ یا پھر ان کا طوطا جوان کے ساتھ ہر وقت موجود رہتا تھا۔

''مٹھو۔!! تم نے سنا؟ یہ نوری کیا کہہ رہی ہے۔ تم ہی بتاؤ بھلا، ہم اور عالیہ فریدہ شاہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو پیری مرشدی کی الف بے بھی نہیں آتی اور بابا جان۔!!'' وہ مٹھو کے پنجرے کو سامنے رکھے دل کا دکھڑا رو رہی تھی اور مٹھو نا سمجھی سے گردن ہلاتا ٹیں ٹیں کیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

مراد کی ٹریننگ پوری ہو گئی۔ شاہ سرکار کو اس کی خدمت، مستعدی اور تابعداری اس قدر پسند آئی کہ اسے اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔ غلام علی کو اس بات کا بڑا صدمہ ہوا۔ وہ شاہ سے ایک پل کی دوری بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ وہ واحد خادم تھا جو زنان خانے میں بھی بنا روک ٹوک آیا جایا کرتا تھا، مگر اب اس کی جگہ مراد لے چکا تھا۔ غلام حسین اندر ہی اندر کڑھنے لگا، مگر منہ سے بھاپ نکال نہیں سکتا تھا کہ کہیں شاہ سرکار کو برا نہ لگ جائے۔

''شاہ سرکار آپ کے اس خادم سے ایسی کون سی خطا ہو گئی کہ آپ نے مجھ سے نگاہیں ہی پھیر لیں۔ میری جگہ مراد کو دے دی اور مجھے اپنے سے دور کر دیا۔'' غلام علی جب زیادہ دیر رہ نہ پایا تو روتے ہوئے شاہ کے پیروں میں گر گیا۔ شاہ سرکار اس کی محبت اور عقیدت کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ فوراً اسے اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔

''غلام علی۔!! تم ہمارا دایاں ہاتھ ہو۔ دائیں ہاتھ کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟ ہم تمہارے بغیر خود ادھورے ہیں۔ خود کو ہم سے دور مت سمجھا کرو پگلے۔ تم تو ہمارے دل میں رہتے ہو۔'' شاہ سرکار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ ان کے قدموں میں ہی جھک گیا۔ اس وقت شاہ کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ ایک غرور و تکبر تھا جس نے شاہ کی اکڑی گردن میں مزید سریا فٹ کر دیا تھا۔ مراد دم سادھے ہاتھ باندھے غلام علی کو شاہ کے پیروں میں گرا دیکھ رہا تھا۔ اس کی اپنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

''اٹھو غلام علی۔ اٹھ جاؤ۔ ہم نے تم سے یہ سب ذمہ داریاں اس لیے واپس لی تھیں کیونکہ تم اب بوڑھے ہو گئے ہو۔ ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا اب تم سے مشکل تھا۔ مراد جوان بچہ ہے۔

بھاگ بھاگ کر سب امور انجام دے لیتا ہے۔ پھر تمہارا تربیت یافتہ اور تمہارا بھتیجا بھی ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے ذمہ داریاں دے دی۔ مگر تمہاری جگہ اب بھی وہی ہے۔ سمجھے تم۔'' شاہ نے غلام حسین کی اچھے طرح سے تسلی کروا دی تو اسے بھی چین نصیب ہوا۔ اور یہ تو سچ تھا کہ اب اس میں وہ پہلے والی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس لیے جلد تھک بھی جاتا اور بعض اوقات چڑ چڑا بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اب مراد کی وجہ سے اسے بھی بہت آرام رہنے لگا۔ وہ شاہ کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا۔ محفل کی تیاری اپنی نگرانی میں کرواتا، لنگر پکوانے اور تقسیم کروانے کی نگرانی کر لیتا۔ اب وہ بھی خوش خوش رہنے لگا تھا۔ رب نواز ہفتے میں دو تین چکر درگاہ کے لگا جاتا۔ بیٹے کو مستعد اور مصروف دیکھ کر خوش ہوتا۔ شاہ کی درازی عمر کی دعائیں مانگتا اور خوش خوش واپس گھر لوٹ جاتا۔

زندگی اسی ڈھب پر گذر رہی تھی۔ مراد کو درگاہ میں آئے سال ہونے کو آیا تھا۔ اب وہ زنان خانے میں بھی چلا جایا کرتا۔ بی بی صاحبہ کو شاہ سرکار کا کوئی خاص پیغام دینا ہوتا، یا شاہ کی تیاری میں مدد کروانی ہوتی۔ مراد ہر کام منٹوں میں کر لیا کرتا۔ اور زندگی اگر اسی ڈھب سے گذرتی رہتی تو اچھا ہی تھا۔ مگر۔

☆☆☆

مراد شاہ کے پاؤں دبا رہا تھا۔ یہ اسکا روز کا معمول تھا۔ وہ رات کو سونے سے پہلے شاہ کے پاؤں دباتا، شاہ سرکار سو جاتے تو وہ واپس درگاہ آجاتا۔ جہاں غلام علی اس کی راہ دیکھ رہا ہوتا۔ مراد اس کی بھی خوب خدمت کرتا۔ اس کے کندھے دباتا، ٹانگیں دباتا اور اس سے خوب دعائیں لیتا۔ دل میں کہیں یہ خیال بھی جاگزیں رہتا کہ کوئی تو میرے باپ کی بھی ایسے ہی خدمت کرتا ہی ہوگا۔

اس وقت بھی وہ شاہ کی خدمت کر رہا تھا۔ انہیں نیند آنے لگی تو انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ مراد اٹھا، سر جھکایا، سلام کیا اور الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔ اسے درگاہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ غلام علی نے رب نواز کو بھی رات وہیں روک لیا تھا۔ اور اب مراد چاہ رہا تھا کہ اڑ کر باپ کے پاس پہنچ جائے۔ اور اسی لیے وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیز قدموں سے چلتا ہوا غلام گردش میں سے گذر رہا تھا۔ آج اسے یہ راستہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا لگ رہا تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ایک موڑ مڑا ہی تھا کہ اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ ٹکر اس قدر زور دار تھی کہ وہ تو لڑکھڑا یا ہی۔ سامنے والی ہستی تو تیورا کے گر ہی گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جاتی مراد نے لپک کر اسے بانہوں میں تھام لیا۔

''معاف کیجیے گا۔ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟''

لڑکی سنبھل چکی تھی۔ مگر ابھی تک اس کی بانہوں میں تھی۔ گھبراہٹ کے مارے اسکا سانس پھول رہا تھا۔ لمبے گھنیرے کھلے بال چہرے پر پھیلے تھے اور اوڑھنی پھسل کر پیروں میں جا پڑی تھی۔ مراد اس افتاد کے لیے کہاں تیار تھا۔ وہ تو خود بھی گھبرا رہا تھا۔ اسی لیے ابھی تک اسے بانہوں میں تھامے کھڑا تھا۔ لڑکی نے کسمسا کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانا چاہا تو وہ بھی جیسے ہوش میں آگیا۔

''اوہ۔!! معاف کیجئے۔ مجھے خیال ہی نہیں۔۔'' لڑکی نے جیسے ہی اپنے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے اسے دیکھا، اس پر تو جیسے بجلی سی گر گئی۔ اتنا مکمل حسن اور اتنی معصومیت۔ وہ کوئی لڑکی نہیں حور پری تھی۔ جو شاید غلطی سے راہ بھٹک کر اس کی راہیں بھٹکانے اس کے سامنے آگئی تھی۔ وہ گم صم ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے مراد کو اس طرح ساکت و صامت دیکھا تو ایکدم ہنس دی۔ اس کی نقرئی ہنسی کی جھنکار نے مراد کے من کو بھگو کر رکھ دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے جھکی اور اپنے پیروں میں پڑی اوڑھنی اٹھا کر اوڑھنے لگی۔ اس کی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں کسی جلترنگ کی بج اٹھیں۔ مراد منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اس اپسرا کی ایک ایک ادا کو دیکھ رہا ہے۔

''کیا ہے؟؟ اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟ کبھی لڑکی نہیں دیکھی کیا؟'' اسے شاید مراد کا گھورنا عجیب لگا تھا اسی لیے مڑتے مڑتے ایکدم رکی اور تیکھے انداز میں پوچھنے لگی۔

''لڑکی؟ لیکن تم کوئی لڑکی تو نہیں ہو۔ تم تو حور ہو حور۔ جنت کی حور۔'' مراد نے کھوئے کھوئے انداز سے کہا تو لڑکی ایک بار پھر ہنس پڑی۔ نقرئی سکوں کی جلترنگ نے ایکبار پھر مراد کو پاگل کر دیا تھا۔

''حور اور ہم؟ بدھو۔ ہم لڑکی ہیں لڑکی۔ اس حویلی کی مالکن، تمہارے شاہ سرکار کی بیٹی فریدہ ہیں ہم۔ کوئی حور نہیں۔ سمجھے۔ پاگل۔'' وہ ایکبار پھر ہنسی اور مڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔ مراد وہیں بت بنا اسی راہ کو دیکھے جا رہا تھا جہاں سے وہ اپسرا ابھی ابھی گئی تھی۔

یہ مراد کی فریدہ سے پہلی ملاقات تھی۔ اور اس کے بعد یہ اتفاقی ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ فریدہ جس گھٹن اور حبس بھرے ماحول میں جی رہی تھی، مراد اس کے لیے ایک ایسا روزن ثابت ہوا تھا جس سے اسے تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ ان دونوں کی اتفاقیہ ملاقاتیں اب طے شدہ بنتی جا رہی تھیں۔ نوری ان دونوں کے درمیان ایسا پل بن چکی تھی جو ان کے پیغام ایک دوسرے کو پہنچانے کے کام آئے۔ ابھی تک ان کی پریم کہانی کسی کی نگاہ میں نہیں آئی تھی۔ شاہ سرکار کو تو اپنے مریدوں اور زائرین سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی اور بی بی صاحبہ کو حویلی کے انتظامات ہی الجھائے رکھتے تھے۔ اسی لیے راوی ابھی تک ان کے لیے چین ہی چین لکھ رہا تھا مگر کب تک۔

☆☆☆

اس روز بھی نوچندی جمعرات تھی۔ بڑی محفل کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ غلام علی اپنی نگرانی میں تیاریاں کروا رہا تھا۔ مراد پھولوں کا ڈھیر سامنے رکھے ہار اور گلدستے بنا رہا تھا۔ اسے ان پھولوں میں فریدہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ اسے جانے کیا ہوا کہ ایک خوبصورت سا پھول اٹھایا اور اپنے کرتے کی جیب میں چھپا لیا۔ پھر کچھ سوچ کر خود ہی مسکرا دیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ محفل اپنے وقت پر شروع ہوئی اور پھر محفل پر رنگ چھانے لگا۔ جب محفل اپنے عروج پا جا پہنچی تو مراد چپکے سے اٹھا اور درگاہ سے نکلتا ہوا حویلی پہنچ گیا۔ وہ چھپتا چھپاتا، بچتا بچاتا پچھلے صحن میں جا پہنچا۔ یہاں ایک بہت پرانا اور بڑا سا بڑ کا درخت تھا۔ وہ فریدہ سے یہیں ملا کرتا تھا۔ اب بھی وہ درخت کی اوٹ میں جا بیٹھا اور اسکا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد فریدہ بھی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ مراد کو اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے دیکھ کر وہ دلکشی سے مسکرائی اور اس کے برابر آ بیٹھی۔

''آ گئیں تم۔؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کہاں رہ گئی تھیں؟'' مراد نے اسے دیکھتے ہوئے بیتابی سے کہا تو وہ کھل کر مسکرائی۔

''ماں جی نے بلا لیا تھا۔ بس انہیں کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ محفل میں جانے کا کہہ رہی تھیں اور ہمیں تم سے ملنے کی جلدی تھی، اسی لیے بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا۔'' اپنی کارستانی سناتے ہوئے وہ خود بھی محظوظ ہو رہی تھی۔

''بری بات ہے پری۔ تم ماں جی سے جھوٹ بول کر آئی ہو؟ ماؤں سے کچھ نہیں چھپاتے۔ گناہ ہوتا ہے۔ سمجھیں۔''

''اچھا۔ تو ہم انہیں بتا دیتے ہیں کہ ہم مراد سے ملنے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے خوابوں میں آتا ہے اور ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے اب۔ کیوں؟ بتا دیں انہیں سب؟؟'' اس نے مسکرا کر شرارت بھرے انداز سے کہا تو مراد کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

''ارے۔ مرواؤ گی کیا۔ ابھی کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے ابا جی سے بات کرتا ہوں۔ وہ خود شاہ سرکار سے بات کر لیں گے۔ پھر خود ہی سب کو پتا چل جائے گا۔ ٹھیک ہے ناں۔'' مراد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو فریدہ کھلکھلا کر ہنس

پڑی۔ مراد اس کی ہنسی میں کھو سا گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" فریدہ نے لجا کر پوچھا تو مراد ہنس دیا۔

"حور کو دیکھ رہا ہوں۔ اپنی حور پری کو۔" اس نے جیب سے پھول نکالتے ہوئے کہا اور پھر وہ پھول بڑی محبت سے فریدہ کے بالوں میں لگا دیا۔ وہ دونوں ہر طرف سے بے نیاز ہو کر باتوں میں مگن ہو گئے مگر ہر وقت بے نیاز ہونے کا نہیں ہوتا۔ بی بی صاحبہ کو جانے بیٹھے بٹھائے کیا ہوا کہ بیٹی کو ڈھونڈ نے نکل کھڑی ہوئیں۔ جونہی پچھلے صحن میں پہنچیں، بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھے مراد اور فریدہ کو دیکھ کر ان کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔

☆☆☆

"فریدہ! ابھی بھی وقت ہے باز آ جاؤ۔ تم جس راہ پر چل نکلی ہو اس کی نہ تو کوئی منزل ہے نہ کنارا۔ میں تمہاری ماں ہوں بیٹا۔ اور میں تمہارا برا کبھی نہیں چاہ سکتی۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ واپس لوٹ آؤ۔ خود کو بھی بچا لو، اور مراد کی جان بھی بچا لو۔" بی بی صاحبہ نے اپنے طور پر ان دونوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ پیار سے سختی سے، حتیٰ کہ مار سے بھی۔ مگر یہ عشق کا روگ تھا، اتنی آسانی سے اپنے شکنجے میں آئے عاشقوں کی جان نہیں چھوڑتا۔ سو، وہ دونوں ہی کچھ سمجھنے، سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔

"ماں جی! آپ اگر ہمارا ساتھ نہیں دے سکتیں تو ہمیں بد دعائیں بھی مت دیں۔ ہم نے پیار کیا ہے۔ کوئی گناہ نہیں کہ سب سے ڈرتے پھریں۔ آپ ہماری ماں ہیں۔ بجائے ہماری مدد کرنے کے ہمیں مسلسل ڈرا رہی ہیں۔ کیوں؟؟"

"کیونکہ جو تم چاہتی ہو۔ وہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے بابا کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ انہوں نے تو اتنے اعلیٰ، حسب نسب والے رشتے ٹھکرا دیے بیٹی، تو اس بیچارے مراد کی دال کہاں گلنے دیں گے؟" ماں جی اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھیں۔ مگر جن کی قسمت میں بربادی لکھی جا چکی ہو، انہیں کون بچا سکتا ہے۔ ماں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد فریدہ نے مراد پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے باپ سے بات کرے۔ وہاں سے بھی انہیں ہری جھنڈی دکھا دی گئی۔ مایوس ہو کر انہوں نے خود ہی حل تلاش کر لیا۔

☆☆☆

رات کا پچھلا پہر شروع ہونے کو تھا۔ درگاہ اور حویلی میں اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ اس اندھیرے اور سناٹے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سایہ حویلی کی دیوار کے ساتھ لگا چپکے چپکے آگے بڑھ رہا تھا۔ کالی سیاہ چادر میں لپٹا وجود دور سے تو کیا قریب سے دیکھنے پر بھی نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا حویلی کی پچھلے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک مقررہ جگہ پہنچ کر سایہ رک گیا۔ اب اسے کسی کا انتظار تھا۔ شدید انتظار۔ اور بالآخر یہ انتظار اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ حویلی کے اندر سے ویسا ہی کالی چادر میں لپٹا سایہ برامد ہوا اور تیر کی طرح اس طرف بڑھ گیا۔

"آ گئیں تم؟ کسی کو پتا تو نہیں چلا؟؟" اس نے تیزی سے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے تشویش سے پوچھا تھا۔

"نہیں، ابھی تک تو کسی کو پتا نہیں چلا، لیکن اگر تم یہیں کھڑے باتیں بناتے رہے ناں، تو ضرور سب ہوشیار ہو جائیں گے۔" وہ ناک چڑھا کر خفگی سے بولی تو اس نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے اسکا بیگ لے لیا۔

"فکر مت کرو۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ چلو۔ اب ہمارا یہاں سے فوری نکل جانا ہی بہتر ہے۔ وقت کم ہے اور راستہ بہت لمبا۔" اس نے اسکا ہاتھ پکڑتے ہوئے حویلی کے مخالف سمت چلتے ہوئے کہا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو لی۔

"مراد۔ تم نے ابا جی کو کیا بتایا؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے انہیں کچھ بتا کر اپنے راستے نہیں بند کروانے تھے۔ اس لیے نہ انہیں کچھ بتایا اور نہ ہی چاچا کو۔ بس، چپکے سے تیاری کی اور رات کے اندھیرے میں نکل آیا۔"

"اور اگر ان میں سے کسی کو پتا چل گیا تو؟"

''کیسے چلے گا۔؟ دونوں گہری نیند میں مست ہیں۔سارے خادم بھی نوچندی جمعرات کی محفل کی تھکاوٹ کا شکار گہری نیند سو رہے تھے۔ اسی لیے تو میں نے آج کے دن کا انتخاب کیا تھا۔'' مراد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کی تشویش اس طرح دور کی کہ وہ ہنس دی۔

''ہاں۔تم بہت ذہین ہو۔اور بہت بہادر بھی۔ ورنہ شیر کی کچھار میں گھس کر شیر کا شکار کرنا،کوئی معمولی بات تو نہیں۔'' فریدہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔اور وہ اس کی تعریف پر خوش ہو رہا تھا۔

ان دونوں نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد گھر سے بھاگ جانے کا پروگرام بنالیا۔گو کہ مراد کو شروع شروع میں تھوڑا تامل رہا،مگر فریدہ کی ضد کے سامنے وہ مجبور ہو گیا۔فریدہ اب اس گھٹن زدہ زندگی سے نجات چاہتی تھی۔کسی بھی طرح ،کسی بھی قیمت پر۔اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کے پنکھ لگ جائیں اور وہ ایک ہی جست میں حویلی کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر کہیں دور نکل جائے۔ایسی اڑان بھرے کہ شاہ سرکار کی عقابی نگاہیں بھی اس تک نہ پہنچ پائیں۔اور اس کی اسی خواہش نے مراد کو مجبور کر دیا۔

ان دونوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد ایک پلان ترتیب دیا اور پھر اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔مراد آخری گاڑی کی ٹکٹیں پہلے ہی خرید چکا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اسٹیشن پہنچ جائیں۔اسی لیے شارٹ کٹ راستے سے جا رہے تھے۔یہ راستہ تھا تو چھوٹا،مگر تھا خطرناک۔ایک چھوٹا سا بیلا راستے میں پڑتا تھا جس میں سنا تھا کہ جانور بھی بستے تھے اور ڈاکو بھی۔مگر مراد کو اس وقت یہی راستہ بہتر لگ رہا تھا اس لیے وہ فریدہ کا ہاتھ تھامے بے دھڑک بیلے میں گھس گیا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔غلام علی گہری نیند میں گم تھا کہ اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس طرح کی پیاس اور ایسی کیفیت تو اس کی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔وہ اپنی حالت پر پریشان ہوتا ہوا اٹھا اور کمرے میں ایک طرف پڑے گھڑے کی طرف بڑھا۔ دو پیالے بھر کے گھڑے کا ٹھنڈا میٹھا پانی پینے کے بعد اس کے حواس جیسے ٹھکانے پر آئے۔اس نے کمرے میں طائرانہ نگاہ ڈالی تو حیرت سے گھڑے کا کھڑا رہ گیا۔مراد اپنی جگہ سے غائب تھا۔غلام علی کا ماتھا ٹھنکا۔

''یہ مراد کہاں چلا گیا؟ اس لڑکے نے تو ناک میں دم کر دیا ہے میرے۔شاہ سرکار سے بات کرنی ہی پڑے گی۔ جانے اس کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔کچھ بتاتا بھی نہیں اور ہاتھ آتا بھی نہیں۔ اب بھی پتا نہیں کدھر چلا گیا۔ دیکھتا ہوں جا کر۔ بیٹھا ہوگا،وہیں احاطے میں مجنوں کا نانا بن کر۔!!'' غلام علی بڑبڑاتا ہوا باہر کی سمت چلا گیا۔اس نے ساری درگاہ میں تلاش کر لیا،مگر مراد کا کہیں پتا نہ چلا۔اب اسے اور زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو وہ رب نواز کے گھر پہنچ گیا۔اس کا خیال تھا کہ شاید مراد باپ سے ملنے چلا گیا ہو،مگر وہ تو وہاں بھی نہیں تھا۔ اب اس نے مناسب سمجھا کہ شاہ سرکار کو خبردار کر دیا جائے۔وہ اور رب نواز یہی باتیں کرتے درگاہ کی طرف جا رہے تھے کہ بیلے کی طرف سے جنگلی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔وہ دونوں گھبرا کر وہیں رک گئے۔

''غلام علی۔لگتا ہے وہ شوہدا بیلے میں چلا گیا ہے۔تو درگاہ چل۔ میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں،کہیں کوئی نقصان ہی نہ کروا بیٹھے اپنا۔'' رب نواز نے اپنی لاٹھی مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور غلام علی کا جواب سنے بغیر ہی بیلے کی طرف دوڑ لگا دی۔غلام علی بھی درگاہ کی طرف چلا گیا۔

ادھر وہ دونوں کسی نہ کسی طرح بچتے بچاتے بیلے سے باہر نکل گئے تھے اور اس وقت اسٹیشن پر بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ جن کتوں کی آوازوں نے رب نواز کو بیلے کی طرف بلایا تھا،وہ آپس میں شکار کی تقسیم پر لڑ پڑے تھے۔رب نواز بیٹے کی محبت

میں چور جیسے ہی وہاں پہنچا، جوش اور نفرت سے بھرے جانوروں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اپنی لاٹھی کے وار کرتا خود کو بچاتا وہاں سے الٹے پاؤں بھاگا تھا مگر پھر بھی درگاہ پہنچتے پہنچتے بہت زیادہ زخمی ہو چکا تھا۔

''اوئے رب نواز!! یہ کیا ہوا تجھے؟ تو تو مراد کی تلاش میں گیا تھا؟ یہ کیا کروا بیٹھا ہے یار؟'' غلام علی اس کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔

''غلام علی۔ وہ شوہدا وہاں بھی نہیں ہے۔ تو حویلی جا۔ اور شاہ سرکار سے بات کر۔ مجھے کوئی بہت بڑی گڑ بڑ لگ رہی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ وہ سچ ہو جو میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو قیامت آ گئی ہے۔'' رب نواز نے غلام علی کو اپنے پاس سے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''کیسی بات سوچ رہے ہو تم، اور کونسی قیامت کی بات کر رہے ہو؟ کھل کر بتاؤ۔ پہیلیاں مت بجھواؤ۔''

''غلام علی۔ مراد آیا تھا میرے پاس۔ چھوٹی بی بی بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ اور مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں شاہ سرکار سے بات کروں۔ تو خود بتا غلام علی۔ ہم کم ذات، کمی، کمین اور کہاں شاہ سرکار کی شان۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے دونوں کو منع کر دیا۔ مراد تو مارا بھی تھا، مگر وہ دونوں شاید نہیں سمجھے۔ جوانی کے جوش میں اپنے ہوش کہیں گم کر بیٹھے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے کہ......!'' رب نواز کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

''کہ کیا؟؟ کیا لگتا ہے تجھے غلام علی۔ کھل کے بول۔''

''مجھے لگتا ہے کہ وہ دونوں گھر سے بھاگ گئے ہیں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تو حویلی جا اور دیکھ کہ بی بی وہاں ہے کہ نہیں۔ جا غلام علی۔ جلدی جا۔ میری فکر مت کر۔ میرا تو اب آخری وقت آ ہی گیا ہے۔ بیٹے کی اس حرکت کے بعد تو مجھے ویسے بھی مر ہی جانا چاہیئے تھا، اچھا ہے کتوں کے کاٹنے کا سبب بن جائے گا۔'' رب نواز کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ مگر وہ ابھی بھی شاہ کی عقیدت سے منہ موڑنے کو تیار نہیں تھا۔ رب نواز اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ دل سے دعا نکل رہی تھی کہ رب نواز کو دھوکہ ہوا ہو۔ فریدہ بی بی اپنے کمرے میں ہی ہو اور آنے والی قیامت اس کے شاہ سرکار کو چھوئے بغیر ہی ٹل جائے۔ مگر ہر دعا پوری ہونے کے لیئے تو ہوتی نہیں۔

شاہ سرکار کے حکم پر نوری اور بی بی صاحبہ نے پورری حویلی چھان ماری تھی۔ مگر فریدہ کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے طوطے کا پنجرہ بھی خالی تھا۔ وہ جاتے جاتے اپنے طوطے کو بھی آزادی کی سوغات دے گئی تھی اور آزادی پاتے ہی طوطا اڑان بھرتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

''کہاں جا سکتے ہیں وہ دونوں۔ اس وقت تو کوئی سواری بھی نہیں ملتی اور یہاں سے باہر نکلنا اتنا آسان بھی نہیں۔ پھر کیسے نکل گئے وہ دونوں''۔ شاہ کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

''سرکار! ابھی آخری گاڑی کے آنے میں وقت ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ دونوں اسٹیشن ہی گئے ہونگے۔ آپ حکم دیں تو میں جاتا ہوں ان کے پیچھے۔ ابھی تو وہ وہیں ہوں گے۔ ہم انہیں پکڑ ہی لیں گے۔'' غلام علی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تو شاہ اپنی بندوق اٹھائے اس کے ساتھ ہو لیا۔

''ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اپنی غیرت کے دشمن کو اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے اور اس باغی لڑکی کو واپس لے کر آئیں گے۔ اسے ایسی سزا دیں گے کہ ساری عمر آسمان دیکھنے کو ترسے گی۔ کم بخت کہیں کی۔''

''نہیں شاہ صاحب نہیں۔ آپکو خدا کا واسطہ۔ آپ ان بچوں کی جان بخش دیں۔ انہیں واپس لے آئیں اور عزت سے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے اسے رخصت کر دیں۔ اسی میں ہماری بھلائی بھی ہے اور عزت بھی۔ جوان اولاد کی شادیوں میں جلدی کا حکم تو ہمارے نبی پاک ﷺ نے بھی دیا ہے، تو پھر آپ

اس حکم کو کیوں نہیں مان لیتے؟'' بی بی صاحبہ شاہ کے قدموں میں گر گئی تھیں، مگر وہ شاہ سرکار تھے۔ اپنی مرضی کے مالک اور اپنی ضد کے پکے۔

''ہرگز نہیں۔ ہم تمہاری بات کبھی نہیں مانیں گے۔ اس نامراد کو داماد بنا کر سر کبھی نہیں بٹھائیں گے۔ ہاں تمہاری بیٹی کی شادی اب ہوگی اور ضرور ہوگی۔ مگر کسی انسان سے نہیں۔ ہم اسکا نکاح قرآن سے کروائیں گے اور کل ہی کروائیں گے سمجھیں تم۔ جاہل عورت۔ دین کا کچھ اتا پتا ہے نہیں اور چلی آئی ہے ہمیں نصیحتیں کرنے۔'' شاہ سرکار نے پیروں میں گری بیوی کو ٹھوکر مارتے ہوئے اپنے عزائم کا اعادہ کیا اور تن فن کرتے ہوئے غلام علی کے ساتھ باہر نکل گئے۔

''یا اللہ۔!! میری بچی کی حفاظت فرما۔ یا اللہ، اس قید خانے میں آنے سے بہتر ہے کہ وہ مر جائے۔ اسی گاڑی کے نیچے آ جائے، یا پھر...... یا پھر اسی گاڑی پر چڑھ کر یہاں سے دور کہیں بہت دور نکل جائے۔'' ایک ماں کے دکھی دل سے دہائیاں نکل رہی تھیں۔ نوری انہیں ساتھ لگائے بیٹھی رو رہی تھی۔ اور ماں کی دعا، وہ بھی دکھے دل سے کی جانے والی رد ہو جائے۔ ایسا تو کم ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

مراد اور فریدہ پلیٹ فارم پر بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ فریدہ کے دل کی دھڑکنیں بے چین تھیں۔ وہ بار بار ریلوے ٹریک کو دیکھتی اور کبھی پلیٹ فارم کے داخلی دروازے کو۔ اسے دھڑکا سا لگا تھا کہ کہیں کسی کی آنکھ نہ کھل گئی ہو۔ پریشان تو مراد بھی تھا، مگر وہ اظہار نہیں کر رہا تھا۔

''مراد۔ یہ گاڑی ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ کسی سے پتا کرو ناں کہیں لیٹ تو نہیں ہو گئی؟'' اس سے رہا نہیں گیا تو پریشانی سے کہہ اٹھی تھی۔

''پریشان مت ہو فریدہ۔ ابھی آ جائے گی گاڑی۔ میں نے ابھی تو پتا کیا ہے ماسٹر جی سے گاڑی وقت پر آ رہی ہے، بس پہنچنے ہی والی۔۔۔!!'' ابھی مراد کہہ ہی رہا تھا کہ گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔

''لو۔ آ گئی۔ تم تو ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہو میری پری۔'' مراد نے مسکرا کر اس کے گال کو چھوا تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ وہ دونوں خدا کا شکر ادا کرتے اپنی جگہ سے اٹھے اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے۔ ابھی وہ گاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر تھے کہ شاہ سرکار اور غلام علی بھی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئے۔ ٹرین ان کے سامنے ہی رکی تھی۔ وہ تیز عقابی نگاہوں سے پلیٹ فارم اور ٹرین کو دیکھ رہے تھے۔ ادھر فریدہ اور مراد ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہنستے مسکراتے ٹرین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندھیرے سے روشنی میں آئے غلام علی کی نظر ان پر پڑ گئی۔

''وہ رہے۔ سرکار۔ وہ جا رہے ہیں دونوں۔'' غلام علی نے ایک دم شور مچا دیا۔ شاہ سرکار نے تیزی سے ادھر نگاہیں گھمائیں اور اسی وقت فریدہ کی نظر بھی شاہ پر پڑ گئی۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے مراد کا ہاتھ پکڑا اور ٹرین کی طرف دوڑ لگا دی۔ مراد بھی شاہ کو دیکھ چکا تھا صورت حال سمجھ چکا تھا، سو اس نے بھی پوری قوت سے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں لمحہ بہ لمحہ ٹرین کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ شاہ اور غلام علی نے بھی ان کے پیچھے بھاگنا چاہا، مگر بڑھاپے اور بسیار خوری کی وجہ سے دو منٹ میں ہی شاہ کا سانس پھول گیا۔ مراد اور فریدہ اس دوران ٹرین تک پہنچ چکے تھے۔ ادھر ٹرین کی وسل ہوئی ادھر مراد نے سہارا دے کر فریدہ کو فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چڑھا دیا۔ شانے پر جھولتا فریدہ کا بیگ اس نے اندر پھینکا اور خود پائیدان پر پاؤں رکھ دیا۔ شاہ نے جو دور سے یہ منظر دیکھا تو ان کا غصے اور غیرت سے برا حال ہو گیا۔ انہوں نے اپنی گن سیدھی کی اور مراد کا نشانہ لے کر فائر کھول دیا۔ اس اثنا میں ٹرین کچھ رفتار پکڑ چکی تھی۔ ممکن تھا کہ نشانہ چوک جاتا۔ مگر شاہ سرکار بھی کچا کھلاڑی نہیں تھا۔ بہت پرانا گھاگ شکاری تھا۔ نشانہ ایسا تاک کر لگایا کہ گولی سنسناتی ہوئی سیدھی مرد کے شانے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

''مراد۔!! تم ٹھیک تو ہو ناں مراد۔'' گولی لگتے

ہی مراد کو ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔ قریب تھا کہ وہ لہرا کر پلیٹ فارم پر ہی گر جاتا کہ فریدہ نے اسکا بازو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''مراد۔ تم ہاتھ مت چھوڑنا۔ ہمارا ہاتھ پکڑ لو۔ اوپر آنے کی کوشش کرو مراد۔ خدا کے لیے ہمت مت ہارنا۔ مراد۔ مراد۔'' فریدہ نے رورو کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی۔ مراد کو چکر آرہے تھے۔ مگر فریدہ کی ہمت دلانے پر اس نے اپنے حواس قائم کیئے اور اس کے سہارے کسی نہ کسی طرح گاڑی میں چڑھنے میں کامیاب ہوہی گیا۔

''مراد! تم ٹھیک ہوناں؟ تمہیں گولی تو نہیں لگی ناں؟ باباجان نے تمہیں مار کر اچھا نہیں کیا۔'' وہ اس سے لپٹی بری طرح رورہی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا فریدہ۔ میں ٹھیک ہوں۔'' مراد نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ اور زیادہ شدت سے رودی۔

''مراد۔!! اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو ہم بھی اپنی جان دی دیتے۔ زندہ نہیں رہتے۔ یہیں اسی پلیٹ فارم پر چلتی ٹرین سے کود کر خودکشی کرلیتے، مگر تمہارے بغیر دوسرا سانس بھی نہ لے پاتے۔''

''پری۔!! میں ٹھیک ہوں ناں۔ بالکل ٹھیک۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ تمہارے پاس۔ پھر تم کیوں رورہی ہو۔؟'' مراد نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے محبت سے کہا تو وہ برستی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔

* * *

ٹرین تیز رفتار سے چلتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا، سوائے مراد کے شانے سے بہے خون کے دھبوں کے۔ شاہ سرکار کا اونچا شملہ گر کر ان کے گلے میں آن پڑا تھا۔ وہ اپنی بندوق پر ماتھا ٹکائے ہارے ہوئے جواری کی طرح پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھے تھے۔ غلام علی اپنے صافے سے اپنے اشک پونچھتا ہوا ان کے پاس کھڑا ان کی بےبسی کو اپنے دل پر اترتا محسوس کررہا تھا۔

''شاہ سرکار۔!! آپ غم نہ کریں۔ میں انہیں ڈھونڈ لاؤنگا۔ کہیں سے بھی، کسی بھی طرح۔ مگر میرا وعدہ ہے، میں انہیں آپکے قدموں میں لا کھڑا کروں گا۔'' غلام علی نے شاہ کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے عاجزی سے کہا تھا۔

''نہیں غلام علی۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ پنچھی پنجرہ توڑ کر اڑان بھرلیں تو پھر ان کے پیچھے نہیں بھاگا کرتے۔ اپنی ذلت و رسوائی کو چھپانے کا کوئی سدباب کرتے ہیں۔'' شاہ نے تھکے تھکے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور ہارے جواری کی طرح ڈھلکے شانوں کے ساتھ واپسی کی راہ لی۔

اگلے دن درگاہ اور حویلی میں ماتم کا سماں تھا۔ ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ شاہ سرکار کی اکلوتی بیٹی عالیہ فریدہ شاہ رات کے کسی پہر سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہوگئی تھیں۔ سانپ اس قدر زہریلا تھا کہ لاش دیکھتے ہی دیکھتے پھول گئی تھی اس لیے رات کے اندھیرے میں اسے دفنا دیا گیا۔ ہر طرف تعزیت کرنے والوں کا شور تھا۔ شاہ سرکار کے عقیدت مند ان کے دکھ میں سراپا دکھ بنے، غم سے لوٹ پوٹ ہوئے جارہے تھے۔ اور بی بی صاحبہ ہونٹوں پر جامد چپ کا تالا لگائے ٹکر ٹکر ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ نوری بھی غمزدہ تھی، مگر دل میں اطمینان اور سکون بھی تھا کہ اس کی بی بی کو آخر اس قید سے رہائی مل ہی گئی۔

آج بھی ہر نوچندی جمعرات کو اس پلیٹ فارم پر رات گئے آخری گاڑی کی آمد سے پہلے شاہ سرکار، غلام علی اور معذور رب نواز کے ساتھ آتے ہیں۔ اسی امید پر کہ شائد اڑان بھر جانے والے پنچھی کبھی واپس لوٹنے کا بھی سوچ لیں۔

بی بی صاحبہ اور نوری ہر نماز کے بعد ایک ہی دعا کرتی ہیں کہ وہ اب کبھی دوبارہ لوٹ کر واپس نہ آئیں۔ اور جانے والے پنچھی، اوپر پہاڑوں میں ایک نئی دنیا بسائے سکون کی زندگی گذار رہے ہیں۔

☆☆☆

دوسری ٹرین بیتی

# جدائی



ممتاز احمد

**اُس نرس کی کہانی جسے ریل گاڑی کا مریض عمر بھر کی خوشیاں دے کر زندگی بھر کا روگ بھی دے گیا**

رات کا ٹائم تھا۔ ٹرین پوری رفتار کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ مسافروں کی اکثریت سو رہی تھی جب کہ کچھ مسافر جاگ رہے تھے۔ ان جاگنے والوں میں احمد کمال بھی تھا جو مسلسل گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ وہ پچھلے دس گھنٹوں سے ٹرین میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی کی وجہ اس کے گھریلو حالات تھے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے کہ یکلخت اس کے پیٹ کے نچلے دائیں حصے میں درد کی ٹیس اٹھی اور ساتھ ہی اسے ابکائیاں آنی شروع ہو گئیں۔ وہ قے کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف جا رہا تھا مگر درد شدت اختیار کر گیا اور وہ وہیں راہداری میں بیٹھ گیا تو قریبی نشست پر لیٹے ایک مسافر نے فوراً احمد کمال کو اٹھایا اور اپنی سیٹ پر لٹا دیا مگر اسے بہت زور کا درد ہو رہا تھا اور وہ درد کی شدت سے ہائے ہائے کرنے لگا۔

اسی اثناء میں اسپیشل ٹکٹ ایگزامنر بھی آ گیا۔ احمد کمال نے اپنا ایک ہاتھ درد والی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ جب ٹکٹ ایگزامنر نے اس کا حال احوال پوچھا تو احمد کمال نے فقط اتنا بتایا کہ بہت شدید درد ہے اور ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے۔

ایک دو اور بھی جاگتے مسافر اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر آ گئے اور اسے تسلی دلاسہ دینے لگے مگر احمد کمال درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی تو ٹکٹ ایگزامنر نے اسے حوصلہ دلایا کہ ملتان کا ریلوے اسٹیشن آ گیا ہے تو اسے اسپتال لے جائیں گے۔ چند منٹوں کے بعد ٹرین رک گئی تو ٹکٹ ایگزامنر نے فوراً احمد کمال کا اکلوتا ایک چھوٹا سا بیگ اور اسے ساتھ لیا اور ٹرین سے باہر آ گئے۔ درد کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا وہ لنگڑاتا اور کراہتا جا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک خالی بینچ پر اسے لٹا دیا گیا۔ اگلے لمحے ٹکٹ ایگزامنر نے اسٹیشن ماسٹر کو رپورٹ کی تو وہ دو تین بندوں کے ہمراہ احمد کمال کے پاس آ گیا اس سے دو چار سوال کیے اور فوراً اسے سول اسپتال پہنچا دیا جہاں ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور بتایا کہ اسے اپینڈکس کی تکلیف ہے جس کا فوری حل آپریشن ہے۔ اگلے آدھے گھنٹے کے دوران احمد کمال کو آپریشن تھیٹر شفٹ کر دیا گیا جہاں اس کا آپریشن کر دیا گیا۔ آپریشن کے بعد اسے سرجیکل وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔ وہ بے حد ہوش پڑا تھا چونکہ وہ مسافر تھا اور تنہا بھی تھا مگر ریلوے کے عملے کا ایک آدمی ابھی تک اس کے پاس موجود تھا۔ رات کے دو بجے کا ٹائم تھا اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔



احمد بلال نے غربت زدہ ماحول میں آنکھ کھولی وہ دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ احمد بلال سب سے بڑا تھا۔ اس کا والد ایک سرکاری محکمے میں چوکیدار تھا خوش قسمتی سے انہیں ایک سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا جہاں ان کی رہائش تھی۔ اس کے والد کا پہلا اسکیل تھا تو تنخواہ بہت قلیل تھی۔ ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتی تھیں تو اس کی ماں لوگوں کے گھروں میں ماسی کا کام کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے تین ٹائم کا کھانا انہیں کھانے کو مل جاتا۔ احمد بلال شروع سے ہی بہت حساس اور ذہین تھا تو یہی وجہ تھی کہ وہ تعلیمی مراحل بڑی کامیابی کے ساتھ طے کرتا ہوا۔ ایم بی اے کی کلاسز تک آ گیا تھا جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا توں توں احمد بلال کی طبیعت میں نکھار آتا جا رہا تھا۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ لمبا قد، گھنگریالے بال، گوری چٹی رنگت کے ساتھ کلین شیو رہنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کی دونوں بہنیں اور بھائی بھی بہت خوب صورت تھے اور سب کے سب پڑھائی میں بہت اچھے جا رہے تھے۔ احمد بلال نے میٹرک میں اپنے ضلع میں ٹاپ کیا تھا۔ اسی طرح ایف اے میں تیسری پوزیشن حاصل کی اور ایم بی اے کے امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کیے تھے ان کی والدہ اب بیمار رہنے لگی تھیں جس کی وجہ سے اس نے کچھ گھروں کا کام چھوڑ دیا تھا صرف دو گھروں کا کام کرتی تھی۔ تو یہی وجہ تھی کہ اس کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ اب احمد بلال جلد از جلد کوئی نوکری کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی اداروں اور محکموں میں اپلائی کیا ہوا تھا جس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً

ٹیسٹ انٹرویو دیتا رہتا تھا چونکہ اس کی کوئی سفارش نہیں تھی تو اس وجہ سے وہ رہ جاتا، کوئی تقریباً ایک مہینا پہلے رحیم یار خان میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب آئی تھیں جہاں احمد بلال نے اپلائی کیا تھا تو وہاں سے اسے انٹرویو کال آئی تھی تو وہ انٹرویو دینے جا رہا تھا تو راستے میں اسے اپینڈکس کے شدید درد نے گھیر لیا تھا۔

صبح کے چھ بجے تک اسے مکمل ہوش آ گیا تھا۔ وہ سرجیکل وارڈ میں پڑا تھا۔ محکمہ ریلوے کا ایک بندہ ابھی تک اس کے پاس موجود تھا۔ جسے اب نیند آ رہی تھی تو وہ چلا گیا۔ اب احمد بلال اکیلا رہ گیا۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ صبح دس بجے اسپتال کا عملہ تبدیل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ نیا اسٹاف آ گیا۔ آنے والے اسٹاف میں ایک نرس جس کا نام شبانہ تھا وہ بہت خوب صورت تھی۔ غزالی آنکھوں، تیکھے نین نقش، گوری رنگت اور لمبے قد کے ساتھ دل موہ لینے والی اس کی آواز تھی۔ احمد بلال اور شبانہ کی نظریں چار ہوئیں تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ اگلے دو گھنٹوں میں وہ چوری چوری دیکھتے رہے پھر بارہ بجے ڈاکٹر وزٹ پر آ گیا۔ اس نے احمد بلال کا معائنہ کیا اور ایک انجکشن لکھا جو دن میں دو لگنے تھے۔ اب تک اس کا آپریشن اور لگنے والی ڈرپس اور انجکشن اسے فری میں لگے تھے مگر جو انجکشن اب ڈاکٹر نے لکھا تھا وہ اسپتال کے اسٹور میں نہیں تھا اور تین دن لگنے تھے اور یہ انجکشن بہت ضروری تھا۔ ڈاکٹر وزٹ کر کے چلا گیا تو شبانہ نے ایک چٹ پر اس انجکشن کا نام لکھ کر احمد بلال کو دیا کہ یہ منگوا دیں مگر اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے تو یہ سن کر شبانہ بہت حیران ہوئی اس پر احمد بلال نے اسے سارا ماجرا بتایا۔ تو شبانہ نے کہا کہ وہ خود میڈیکل اسٹور سے لے آتی ہے۔ چنانچہ احمد بلال نے اسے پیسے دیئے جس پر وہ انجکشن لے آئی اور لگا دیا تو اس طرح ان دونوں کا ابتدائی تعارف ہوا۔ شبانہ کی ڈیوٹی ختم ہونے تک دونوں کا تفصیلاً تعارف ہو چکا تھا۔ شبانہ کا تعلق بھی ایک غریب گھرانے سے تھا وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی بچپن میں ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا تو اس کی ماں نے دوسری شادی نہ کی۔ شبانہ کا والد سرکاری ملازم تھا تو اس کی فوتگی کے بعد ان ماں بیٹی کو پنشن مل جاتی تھی۔ شبانہ کی ماں کو اس کے ابو سے بہت پیار تھا۔ تو وہ دن رات اپنے مرحوم خاوند کو یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ شبانہ کو ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔ میٹرک میں اس نے بہت اچھے نمبرز لیے تھے۔ وہ ایف ایس سی کر رہی تھی تو اس کی ماں نابینا ہو گئی۔ اس نے اپنی ماں کا بہت علاج کروایا مگر اس کی نظر بحال نہ ہو سکی۔ اب پڑھائی کے ساتھ ساتھ اپنی نابینا ماں کی دیکھ بھال کرنا، گھرداری صفائی ستھرائی کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا تو یہی وجہ تھی کہ اس کے ایف ایس سی کے نمبرز کم آئے تو اسے کسی بھی میڈیکل کالج میں داخل نہ ملا چنانچہ اس نے نرسنگ کورس کر لیا اور بہت جلد اسے سرکاری نرس کی جاب مل گئی تھی اور دو سال سے وہ یہ ڈیوٹی کر رہی تھی۔ ان ماں بیٹی کی رہائش ایک کرائے کے مکان میں تھی تو ابھی دو مہینے پہلے اسے اسپتال کی رہائشی کالونی میں ایک اچھا گھر رہنے کو مل گیا تھا جہاں وہ ماں بیٹی بڑے سکون سے رہ رہی تھیں۔ شبانہ کی معقول تنخواہ تھی علاوہ ازیں اس کی ماں کو پنشن اور محکمے کے ویلفیئر فنڈ سے ہر مہینے پیسے مل جاتے تھے جس سے ان کی گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی اور پس انداز بھی کر رہی تھیں۔

اگلے دو سے تین دن میں دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ شبانہ اپنی ڈیوٹی کے دوران اور ڈیوٹی کے علاوہ احمد بلال کو بہت ٹائم دیتی اسے سہارا دے کر چلاتی اپنے گھر سے اس کے لیے کھانا وغیرہ بنا کر لاتی۔ تیسرے دن ڈاکٹر نے احمد بلال کو اسپتال سے فارغ کر دیا اور کہا کہ تین روز کے بعد دوبارہ آنا ہے ٹانکے کھلوانے کے لیے تو شبانہ کے کہنے پر وہ اس کے گھر شفٹ ہو گیا۔ جہاں وہ شبانہ کی نابینا ماں سے ملا۔ اب یہ تین دن یوں چٹکی بجاتے گزر گئے۔ اب احمد بلال کے ٹانکے بھی کھل گئے تھے تو ڈاکٹر نے اسے مزید ایک ہفتہ دوائیاں کھانے کا کہا۔ اب احمد بلال ٹرین کے ذریعے واپس اپنے گھر پہنچ گیا جہاں اس نے اپنے گھر والوں کو سارا ماجرا بیان کیا جسے سن کر اس کے ماں باپ اور بھائی بہنیں تھوڑی پریشان ہوئیں مگر احمد بلال نے انہیں مطمئن کر دیا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ پہلی نظر میں ہی احمد بلال اور شبانہ اپنا اپنا دل ہار گئے تھے اور ایک دوسرے کی شدید

محبت میں مبتلا ہو گئے تھے مگر ابھی تک دونوں میں سے کسی نے بھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ پھر ایک دن احمد بلال نے شبانہ سے محبت کا اظہار کر دیا۔ آگ تھی دونوں طرف برابر لگی ہوئی کے مصداق شبانہ نے نہ صرف احمد بلال کی محبت کو قبول کر لیا بلکہ اس نے بھی اظہار محبت کر دیا۔ اب دونوں گھنٹوں فون پر لمبی لمبی باتیں کرتے۔ کوئی دس دن گزرے تو احمد بلال کو رحیم یار خان کی اسی ملٹی نیشنل کمپنی سے دوبارہ انٹرویو کال موصول ہوئی۔ پہلے والے انٹرویو منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ اب دوبارہ اسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا تو احمد بلال فوراً رحیم یار خان پہنچ گیا جہاں اس کا تسلی بخش اور بہت شاندار انٹرویو ہوا اور اسے سلیکٹ کر لیا گیا تھا۔ کمپنی نے اسے تین دن کا ٹائم دیا کہ گھر سے اپنی ضروریات زندگی کا سامان لے آئے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے یہ خوش خبری شبانہ کو سنائی پھر گھر ٹیلی فون کیا اور اپنا ضروری سامان لے کر وہ رحیم یار خان پہنچ گیا۔ اس کمپنی نے اپنی ایک بہت بڑی شاخ ملتان میں کھولی تھی تو احمد بلال کا ٹرانسفر بھی ملتان کر دیا گیا۔ چنانچہ اسی دن شام کے وقت وہ شبانہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہ پھل اور مٹھائی لے کر گیا تھا۔ اس نے شبانہ اور اس کی ماں سے مبارک باد وصول کی اور اگلے ہی دن سے اس نے اپنی ڈیوٹی جوائن کر لی۔ شبانہ نے بہت اصرار کیا کہ وہ ان کے ہاں رہائش رکھ لے مگر احمد بلال نے انکار کر دیا اور کہا کہ اسے کمپنی کی طرف سے رہائش مل گئی ہے اور واقعی اسے رہائش مل بھی گئی تھی۔

شب و روز گزرنے لگے۔ ان دونوں کی محبت پروان چڑھتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ اب ان دونوں کی خواہش تھی کہ جلد از جلد ان کی شادی ہو جائے۔ ادھر احمد بلال کی جاب بھی مستقل ہو گئی تھی۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی والی مثال ان پر فٹ آتی تھی۔ بہت جلد دونوں گھرانوں کے مابین معاملات طے پا گئے اور ایک شام دونوں کا نکاح اور رخصتی عمل میں آ گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ احمد بلال ایک ماہ کی چھٹی لی اور دونوں نے خوب گھوم پھر کر ایک ماہ کا عرصہ گزارا۔ وقت کا کام ہے گزرنا تو وقت گزرتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان پانچ سالوں میں دونوں کی محبت میں رتی بھر کمی نہ آئی۔ ایک بیٹی اور دو بیٹوں کی رحمت اور نعمت سے قدرت نے انہیں نوازا تھا۔ ان کا ہر دن عید اور ہر رات شب برأت کی طرح گزرتی وہ دونوں اپنی اپنی زندگیوں میں شادمان تھے۔

احمد بلال جس کمپنی میں جاب کرتا تھا تو انہوں نے ایک اسکیم شروع کی۔ وہ یہ کہ ہر سال بذریعہ قرعہ اندازی ایک بندے کو عمرہ کی ادائیگی کے لیے اپنے خرچ پر بھیجنا۔ اس سال جو قرعہ اندازی ہوئی اس میں احمد بلال کا نام نکلا تو نہ صرف احمد بلال خوش ہوا بلکہ اس کے ماں باپ، بہنیں بھائی شبانہ اور ساس کی خوشی دیدنی تھی۔ ٹکٹ اور دیگر ضروری کاغذات آ چکے تھے۔ لاہور سے روانگی تھی۔ شبانہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ احمد بلال کو لاہور ایئرپورٹ چھوڑ گئی۔ احمد بلال نے احرام باندھا، دو نفل ادا کیے اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ اپنے مقررہ وقت پر جہاز فضا میں بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا تو یہاں بھی یہی ہوا۔ احمد بلال جس جہاز میں سوار تھا۔ وہ اپنی پرواز کے دو گھنٹے بعد ہی سمندر میں گر کر تباہ ہو گیا۔ یہ خبر قیامت بن کر شبانہ پر گزری جیسے ہی یہ خبر شبانہ کی ماں نے سنی تو اس پر ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا اسی طرح احمد بلال کی ماں نے یہ خبر سنی تو وہ سکتے میں آ گئی اور دوسرے دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ شبانہ کی اپنی حالت بہت غیر تھی۔ وہ دن رات روتی رہتی اور اپنے پھول جیسے بچوں کو اپنے سینے سے چمٹا لیتی گو کہ جس ایئر لائن کا جہاز سمندر میں گر کر تباہ ہوا تھا اس نے مرنے والوں کے ورثاء کو ایک معقول رقم دی تھی، اسی طرح جس کمپنی میں احمد بلال جاب کرتا تھا اس نے فوری طور پر احمد بلال کے بھائی کو جاب پر رکھ لیا مگر جانے والے پلٹ کر نہیں آتے۔ شبانہ عین عالم شباب میں بیوہ ہوئی تھی۔ اس نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب وہ ملتان کے سول اسپتال کے کوارٹر میں رہتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو مریضوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے اور دن رات اپنے تینوں بچوں کی پرورش کر رہی ہے۔ رات کی تنہائی میں وہ روتی ہے۔ اب اس نے ایک لمبی جدائی کی سزا کاٹنی ہے۔

☆☆☆

## تیسری ترین بیتی

# ایمیزون



**افتخار چوہدری**

**ایک سیلانی نوجوان کی زندگی کی منفرد کتھا جو یقیناً آپ کو محظوظ کرے گی**

**وچ** ڈاکٹر نے لکڑیوں اور گھاس پھوس سے بنے ہوئے اسٹریچر پر بے سدھ پڑے ہوئے ڈیوڈ کی آنکھیں کھول کر دیکھیں تو اس کی بے جان پتلیاں غیر فطری انداز میں اوپر چڑھ چکی تھیں جبکہ اس کے منہ سے گہرے نیلے رنگ کی جھاگ مسلسل نکل رہی تھی۔ کالے ہونٹ پہلے ہی کافی موٹے تھے، جواب سوج کر دوگنے ہو چکے تھے، اور ان کا رنگ بھی مزید گہرا سیاہ ہو چکا تھا۔

قبیلے کا وچ ڈاکٹر کچھ دیر تک اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر مایوسی سے نفی میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اور جوزف سے اپنے قبیلے کی زبان میں بات کرنے لگا۔

اس عجیب وغریب ہیت کے مالک حبشی وچ ڈاکٹر کی عمر اسی سال سے زائد ہی ہوگی۔

اس نے جسم ڈھانپنے کے نام پر پتوں کو رسی میں پرو کر کمر کے گرد باندھا ہوا تھا، سر کے بالوں کے ساتھ ساتھ دانت بھی جھڑ چکے تھے، بولنے پر اسکے منہ کے اندر اکا دُکا سیاہ کھوڑیں نظر آرہی تھیں، جبکہ اس کے چہرے پر کسی صحرائی ریت کی طرح تہہ در تہہ سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

اس کے علاوہ کانوں میں لکڑی کے بڑے بڑے تاپس نما کوئی زیور پہنا ہوا تھا، جن سے لوئیں پھٹنے کی حد تک پھیل چکی تھیں۔

ماتھے پر تین لکیروں کی صورت میں موجود سفید کشفہ اسے دوسروں سے ممتاز بنا رہا تھا۔

سینٹرل افریقہ کے اس بماسے قبیلے میں مرد و خواتین کا لباس مختصر ترین تھا اس مختصر ترین کو آپ فطری لباس بھی سمجھ سکتے ہیں۔

بلکہ یہاں تو کائنات اپنے تمام تر فطری رنگ میں ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی، مٹی اور گھاس پھوس کے امتزاج سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کے یہ باسی، دنیا کی کسی بھی جدید چیز سے آشنا نہیں تھے سوائے ان چند خوش نصیبوں کے جنہوں نے انتہائی تکلیفوں کے بعد شہر کا رخ کیا تھا۔

”یہ کہہ رہے ہیں کہ ڈیوڈ کی روح انتہائی پاک تھی جو دلدل کے دیوتا کی طرف سے بھیجے گئے کالے فرشتے کے ڈسنے کے باوجود بھی دو گھنٹے تک موت سے لڑتی رہی ورنہ کالے فرشتے کے ڈسنے کے بعد تو کوئی دوسرا سانس بھی نہیں لے سکتا۔“

جوزف نے وچ ڈاکٹر کی کہی ہوئی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ دلدل کے دیوتا والی بات میرے لیے نئی تھی، اور کالا فرشتہ شاید وہ بلیک ممبا کو کہہ رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ڈیوڈ کو ڈسنے والا سانپ



دنیا کا سب سے زہریلا اور خطرناک حد تک پھرتیلا بلیک ممبا ہی تھا، وہ اچانک ہی ایک درخت سے ہماری سفاری جیپ میں آگرا تھا، اس سے پہلے کہ ہم سنبھلتے وہ موذی ڈیوڈ کوڈس کر جا چکا تھا۔

ڈیوڈ جوزف اور سفاری جیپ کو میں نے دالحکومت کنشاسہ سے ہائیر کیا تھا۔

میری نظر انتخاب ان دونوں پر اس لیے پڑی تھی کہ وہ ایمزون کے وسط میں موجود ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

جبکہ میں پاک آرمی کے افریقہ میں یونائیٹڈ مشن کے ساتھ سوڈان میں مقیم تھا، ایک ماہ کی چھٹی ملنے پر میں نے واپس پاکستان آنے کی بجائے اسراروں سے اٹی زمین افریقہ کی سیر کا پروگرام بنالیا۔

جو ساتھ میں موجود کئی ملکوں کی سیاحت پر مبنی تھا۔

کوموریور، اور ایمزون، کے بعد وکٹوریہ اور البرٹ جھیل کو آپ میرے سپنوں کی دادیاں کہہ سکتے ہیں۔

کیمرون سنٹرل افریقی ری پبلک اور ڈیمو کریٹک ری پبلک آف دی کانگو میں پھیلے ہوئے قدرت کے یہ حسین شہکار ہمیشہ سے میری کمزوری رہے تھے۔

ان چھٹیوں میں میرا پروگرام مبانڈ کا، بونگ بونگا، کنیشیا، لوانیڈا، اور بروںڈلی سے لے کر ایمزون کے دور افتادہ قبیلوں تک کی نان اسٹاپ سیر کا پروگرام تھا۔

اس بار میں نے سیاحت کے ساتھ اس سارے ٹور کی ڈاکومینٹری فلم بنانے کا پلان بھی بنا رکھا تھا۔

اس کام میں میری مدد کوئی مقامی شخص ہی کر سکتا تھا اسی لیے میں ڈیوڈ اور جوزف کو ہائیر کیا تھا۔

وہ دونوں کسی جن جیسی جسامت کے حامل نوجوان تھے۔

ہم نے سب سے پہلے ان ہی کے قبیلے سے اپنے کام کا آغاز کرنے کا پروگرام بنایا، اور دو دن گھنے جنگل میں سفر کر کے سرسبز پہاڑوں کے درمیان موجود ان کے قبیلے کے قریب پہنچے تھے۔ میں بہت زیادہ ایکسائٹڈ ہو رہا تھا، وہ قبیلے اور ان کی روایات جو میں اکثر ڈاکومنٹری فلموں میں دیکھا کرتا تھا، آج اپنی آنکھوں سے دیکھنے جا رہا تھا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا، منزل کے قریب پہنچ کر اس حادثے نے میرے حواس مختل کر دیئے تھے۔ ”اب اس کے گھر والوں کو

کیسے اطلاع کریں۔‘‘میں نے جوزف کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

’’جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے تھے تو کئی لوگوں نے ڈیوڈ کو اس حالت میں دیکھ لیا تھا، انہوں نے اس کے گھر اطلاع کردی ہوگی۔ مگر یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوا، کیونکہ اب تمہارے پاس بھاگنے کا آپشن بھی نہیں بچا۔‘‘

جوزف نے تفصیل بتانے کے بعد آخر میں عجیب سی بات کی تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

’’کیا مطلب میں کیوں بھاگوں گا، یہ ایک حادثہ تھا، اس میں میرا کیا قصور ہے۔‘‘

میں نے اپنی صفائی میں دلیل تو دے دی مگر مجھے خطرہ کہیں آس پاس ہی محسوس ہونے لگا۔

اسی لمحے انتہائی سیاہ رنگ کی موٹے نقوش والی نیم برہنہ کئی خواتین جھونپڑی کے اندر داخل ہوئیں، اور لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگیں۔

بین کرنے کے ساتھ وہ میری طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کچھ کہہ بھی رہی تھیں، یقیناً وہ اپنی زبان میں مجھے کوسنے ہی دے رہی تھیں۔

اچانک ان میں سے ایک نوجوان لڑکی نے چیختے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا تو دوسری خواتین نے بھی میرے ساتھ کھینچا تانی شروع کر دی۔

خواتین ہونے کی وجہ سے میں نے اخلاقی طور پر انہیں کوئی جواب نہیں دیا، کرنے کے۔

انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا، اسی دھینگا مشتی میں ہم جھونپڑی میں سے باہر نکل آئے، یہ میرے لیے اور بھی برا ہوا باہر موجود سارا مجمع نیکی کا کام سمجھتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔

کسی نے ٹھوس چیز سے میرے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، میں نے خود کو ہوش میں رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر بے سود، میرا ذہن تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

اندھیرے میں جیسے روشنی کی پھلجڑی کی روشنی پھیلی ہو، ایسے ہی احساس سے مجھے ہوش آیا، تو میرے منہ سے بے اختیار کراہیں نکل گئیں۔

سر کے پچھلے حصے میں ابھرے ہوئے گومڑ پر خون کی چپچپاہٹ موجود تھی، قریب ہی جوزف سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

یہ ایک قید خانہ تھا، جو زمین میں گہرا گڑھا کھود کر بنایا گیا تھا۔

اس کے دہانے پر لکڑیوں کا تختہ رکھا ہوا تھا، جس کی درزوں سے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔

’’کیا میں ساری رات بے ہوش رہا ہوں۔‘‘ میں نے جوزف سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار واضح تھے۔

ڈیوڈ کی جان میری جان وجہ سے گئی ہے۔ ’’مگر تمہیں کیوں قید کیا گیا ہے، میں نے استفسار کیا۔

وہ ڈیوڈ کے مرنے کا ہم دونوں کو مجرم سمجھتے ہیں۔ رات مجھے اس کی تدفین میں بھی شرکت نہیں کرنے دی گئی، اس نے روہانسے لہجے میں جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان مزید کوئی بات ہوتی ہمارے سروں پر موجود تختہ اٹھا لیا گیا۔

گڑھے کے کنارے پر کئی حبشی نوجوان بھالے لیے کھڑے تھے، ایک سیڑھی نیچے اتار کر ہمیں باہر نکالا گیا اور ہمارے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔

یہاں کیلوں کی بہتات تھی انہیں کے درمیان ایک کھلی جگہ میں قبیلے کی پوری آبادی جمع تھی، ایک اونچی جگہ پر قبیلے کا کھیا، وچ ڈاکٹر کے ساتھ براجمان تھا، کھیا انتہائی بد ہیبت بہت موٹے پیٹ والا شخص تھا۔

’’یہ ہی اس قبیلے کا کرتا دھرتا ہے، یہی ہماری قسمت کا فیصلہ کرے گا۔‘‘ جوزف نے سرگوشی کی۔

لوگوں کے درمیان سے گزر کر اس تک پہنچنے کے دوران لوگ ہم پر طرح طرح کی آوازیں کستے رہے، مگر کل کے برعکس دست درازی سے محفوظ رہے۔

کھیا کے سامنے لیجا کر ہمیں گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا گیا۔

وہ چند لمحوں تک ہمیں کینہ توز انداز میں مجھے گھورتا رہا اور پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے چیخ کر کچھ کہا تو ایک طرف کھڑی ہوئی وہی لڑکی آگے بڑھ آئی جس نے کل مجھ پر حملہ کرنے میں پہل کی تھی۔

دونوں کے درمیان کچھ دیر مکالمہ ہوتا رہا، میں نے سوالیہ انداز میں جوزف کی طرف دیکھا۔

’’یہ اوزی ہے، ڈیوڈ کی منگیتر، کھیا نے اس سے پوچھا

ہے کہ وہ تمہیں معاف کرنا چاہتی ہے یا بدلہ لینا چاہتی ہے ،تو وہ کہہ رہی ہے کہ اب وہ اس نوجوان سے شادی کرے گی جو تم سے مقابلہ کر کے تمہیں جان سے مارے گا۔''

جوزف نے ان کے درمیان ہونے والی بات کی تفصیل بتائی۔

''مگر میں تو کسی سے لڑنا نہیں چاہتا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''اب تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا، ہاں اگر تم مقابلے میں آنے والے کو ہرا دو تو ہماری جان بخشی ہو سکتی ہے، اور اوزی بھی تمہیں مل جائے گی۔''

''کیا مطلب یہاں کوئی سوئمبر ہو رہا ہے، کہ جو جیتے گا ،اوزی اس کی ہو جائے گی۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

اسی لمحے کھیا نے ایک بار پھر چیختے ہوئے کچھ کہا تو مجمع پر خاموشی چھا گئی۔

ایک طرف سے لمبا تڑنگا نوجوان برآمد ہوا اس کے کندھوں پر شیر کی کھال لٹک رہی تھی، جبکہ قد کسی بھی طرح سات فٹ سے کم نہیں تھا، بلا شبہ وہ ایک انتہائی طاقتور نوجوان تھا، اس نے کندھوں پر سے کھال اتار کر ایک شخص کی طرف اچھال دی اور میری طرف آنے لگا، اب وہ صرف جانگیے میں تھا۔

اس کی تھائی اور پنڈلیوں کے مسلز ایسے پھڑک رہے تھے جیسے وہ ابھی ابھی باڈی بلڈنگ کا عالمی مقابلہ جیت کر آ رہا ہو۔

''یہ کھیا کا بیٹا زولا ہے، اس نے کندھوں سے جو شیر کی کھال اتاری ہے اس شیر کا جبڑا اس نے اپنے ہاتھوں سے چیرا تھا، اب ہمیں موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' جوزف نے ایسے لہجے میں کہا جیسے عزرائیل کو اپنی آنکھوں سے آتا ہوا دیکھ لیا ہو۔

ایک شخص نے آ کر میرے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے، تو میں بھی اٹھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا، زولا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس کے ہونٹوں پر گہری ہوتی ہوئی مسکراہٹ اور دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا، جیسے کوئی درندہ معصوم ہرن کو دیکھ رہا ہو۔

مجھے مطمئن انداز میں کھڑا دیکھ کر اس کے صبر کا پیمانہ جلد ہی چھلک گیا۔

وہ کسی سانڈ کی طرح دوڑتا ہوا میری طرف بڑھا، اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ دیسی انداز میں مجھے جپھا مار کر میری ہڈیاں توڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

پھر واقعی ایسا ہی ہوا میرے قریب پہنچ کر اس نے دونوں بازو کھولے اور مجھے قلاوے میں لینے کی کوشش کی ،مگر تب تک میں ہائی جمپ والے انداز میں ہوا میں اچھل چکا تھا اور پھر سمر سالٹ لگاتے ہوئے ،اسکے سر کے اوپر سے گزر کر دوسری طرف آیا اور زمین پر پہنچنے سے پہلے ایک نپی تلی بیک کک اس کی پشت پر رسید کر دی۔ میرا ٹارگٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک مخصوص پوائنٹ تھا۔

کک کھا کر وہ منہ کے بل جا گرا، تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے نکلنے والی چیخیں آسمان کی خبریں لا رہی تھیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے اپنی جگہ سے کھسک چکے تھے، اب وہ ایک بے ضرر کینچوے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

پورے مجمعے پر گھمبیر سناٹا چھا چکا تھا، میری نظر جوزف پر پڑی تو اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، اچانک ہی کئی نوجوان تلواریں اور بھالے سونتے ہوئے میری طرف بڑھے، اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچتے میں نے قریب ہی موجود کھیا کی طرف چھلانگ لگا دی۔

اسے تب ہوش آیا جب میں نے اسکے پہلو میں لٹکتے ہوئے خنجر نما ہڈی کے ہتھیار کو اتار کر اس کی شہہ رگ پر رکھتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے حملہ آوروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

''ذرا ادھر آؤ۔'' میں نے جوزف سے کہا تو وہ دوڑتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

''کھیا کو بتاؤ میں کون ہوں۔'' میں نے اپنا سروس کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے کارڈ پر سے تفصیل پڑھ کر اونچی آواز میں دہرائی تو چند لمحوں میں ہی ماحول یکسر تبدیل ہو گیا۔

اس کا بیٹا موت سے بھی زیادہ بری حالت میں تھا مگر میری حقیقت جان کر وہ میرے سامنے بچھا جا رہا تھا۔

''اس کے کندھوں پر کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے زولا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو جوزف اس کے

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماءے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

کندھوں پر سوار ہو گیا۔
میں بھی اس کی کمر پر بیٹھ گیا، اور اسکی دونوں ٹانگوں کو اپنے قلادے میں لے کر آہستگی سے اوپر اٹھانے لگا تو درد کی شدت سے چیختے ہوئے زولا کی آواز بھی بیٹھ گئی، ایک خاص زاویے تک ٹانگیں اٹھانے کے بعد میں نے مخصوص انداز میں جھٹکا دیا تو کڑک کی آواز کے ساتھ مہرے واپس اپنی جگہ بیٹھ گئے۔
''بس ٹھیک ہے، پیچھے ہٹ جاؤ'' میں نے اس کی کمر سے اٹھتے ہوئے کہا تو جوزف بھی پیچھے ہٹ گیا۔
اگلے ہی لمحے زولا بھی اٹھ کھڑا ہوا، وہ حیرت اور خوشی سے بار بار اپنے وجود کو دیکھ رہا تھا۔
مکھیا نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ چومے اور تعظیم دینے کے انداز میں جھکتا چلا گیا، جبکہ زولا سمیت پورا قبیلہ اس کی تقلید کر رہا تھا۔
''یہ سوئمبر تم نے جیت لیا ہے، قبیلے کی روایات کے مطابق تمہیں اوزی سے شادی کرنا پڑے گی۔''
جوزف کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گیا، میں تو کبھی خواب میں بھی اس کالی کلوٹی حبشن سے شادی کا نہیں سوچ سکتا تھا، اگلے کئی گھنٹے اس بات کو لے کر گرما گرم بحث ہوتی رہی، جب میں کسی صورت راضی نہ ہوا تو مکھیا نے اپنے سر پر موجود تاج جو پرندوں کے پروں سے بنا ہوا تھا، اتار کر میرے قدموں میں رکھ دیا، اور پھر میان سے خنجر کھینچ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کچھ کہا۔
''یہ کہہ رہا ہے کہ یا تو اوزی سے شادی کر کے تاج واپس میرے سر پر رکھ کر مجھے عزت اور مان دو، یا پھر اسی خنجر سے میرا گلا کاٹ کر یہاں سے چلے جاؤ، اب اس کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔'' جوزف نے اسکی بات کا ترجمہ کیا۔
''ویسے اگر تم ابھی وقتی طور پر اوزی کو ساتھ لے جاؤ، اور پھر اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دینا، اس کے علاوہ مجھے کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔'' جوزف نے مشورہ دیا۔
اس صورتحال میں مجھے بھی یہی مناسب لگا تو میں نے نا چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا، مجھے راضی ہوتا دیکھ کر مکھیا کا چہرہ کھل اٹھا۔
اسی وقت وچ ڈاکٹر کی سربراہی میں پورے قبیلے والے ہماری شادی کی مختلف رسومات ادا کرنے لگے۔ جو اگلے دن تک جاری رہیں، سب سے کراہیت آمیز رسم، مجھے اور اوزی کو ایک دوسرے کا خون پلایا گیا۔
مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے اس کا خون ٹیسٹ کیا تو ابکائیوں اور الٹیوں سے میرا برا حال ہو گیا۔
سارا قبیلہ میری حالت کو انجوائے کر رہا تھا، جبکہ میرے برعکس وہ لڑاکا چڑیل میرے خون کی پیالی مزے سے پی گئی۔
اور پھر شادی کے بعد ہمارا سفر شروع ہوا۔ سمندر سے ہوتے ہوئے ہم بس میں بیٹھے اور پھر ریل میں سوار ہو کر بقیہ ماندہ سفر کرنے لگے۔ ریل میں ایک جشن کے ساتھ سفر کسی قدر ذلالت دلا رہا تھا وہ بیان سے باہر تھا مگر۔ ریل میں وہ جشن آزادی سے میرے اعصاب پر سواری کر رہی تھی اور آخر یہ بھیانک ریل کا سفر اختتام پذیر ہوا اور ہم پلیٹ فارم پر اترے اور گھر آ گئے۔

☆......☆

میں نے جوزف کی طرح یہی سوچا تھا کہ شہر جاتے ہی اسے واپس بھیج دوں گا، مگر آج دس سال گزر چکے ہیں وہ کسی چڑیل کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی ہے، اور لگتا نہیں کہ لحد میں اترنے سے پہلے وہ میری جان چھوڑ دے۔
افریقہ کبھی میرے سپنوں کی سرزمین ہوا کرتا تھا مگر اب تو یہ نام بھی میرے لیے ایک ڈراؤنے خواب جیسا ہے۔
ماں مجھے ہمیشہ گھر کے پچھواڑے میں موجود جنگل میں جانے سے منع کیا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگل میں بھوتوں اور چڑیلوں کا بسیرا ہوتا ہے وہ بچوں کو چمٹ جائیں تو پھر زندگی بھر جان نہیں چھوڑتے۔ تب میں ماں کی بات کو مذاق سمجھتا تھا۔
مگر ٹھوکر کھا کر سمجھ آئی کہ سیانوں کی بات نہ ماننے والا ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے اور پھر ریل کی وسل سنائی دینے لگتی ہے جیسے اس خسارے کا سلسلہ رکنے نہیں پائے گا اور ہم ریل کی دو پٹڑیوں کی طرح ساتھ ساتھ زندگی گزارتے چلے جائیں گے۔

☆☆☆

چونکا دینے والی کہانی

# درست فیصلہ

نسیم سحر

مڈل کلاس کی محرومیوں سے جڑی محبت کے آغاز و انجام کی ایک داستان

**پلیٹ** فارم ایک ایسی جگہ ہے جہاں بیک وقت خوشی اور غم دونوں ملتے ہیں۔ کسی کو جانے والے کا دکھ اور کسی کو آنے والی کی خوشی، پلیٹ فارم کسی کے راز کا امین بھی ہوتا ہے اور بعض مرتبہ یہ



بھٹک جانے والوں کو رستہ بھی دکھا دیتا ہے۔

☆......☆

''اماں بھوک لگی ہے۔'' مانو نے ماں کا گھٹنا ہلایا۔

''جا کر آپا سے مانگ لے۔'' اماں نے اپنی گود میں موجود چھوٹے کو تھپکتے ہوئے کہا اور مانو کو باورچی خانے کی طرف دھکیلا۔

''آپا کھانا دے بھوک لگ رہی ہے۔'' مانو اب روبینہ کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی جو چولہے کے پاس نہ جانے کن سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ مانو کی آواز سے چونک گئی۔

''کیا ہے۔ تم لوگوں کو ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے ابھی نہیں پکا۔'' روبینہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اماں!'' مانو نے وہیں سے رونے جیسی آواز میں ماں کو پکارا۔

''روبینہ کھانا کیوں نہیں پکا ابھی تک تیرے ابا بھی آنے والے ہوں گے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کام میں دل نہیں لگتا تیرا۔'' اماں نے وہیں سے روبینہ کو ہانک لگائی۔

''پکا تو رہی ہوں اماں ہر وقت تمہارے بچوں کی خدمت میں تو لگی رہتی ہوں۔'' روبینہ نے بھی تنگ کے کے جواب دیا۔

''ارے تو کیا ہو گیا، سب لڑکیاں کرتی ہیں تیرے بہن بھائی نہیں ہیں کیا۔'' اماں نے بھی پھر اس کو لتاڑا۔

''ہاں تم بس پیدا کیے جاؤ۔'' روبینہ نے ذرا ہلکی آواز میں چڑ کے کہا مگر اماں نے سن لیا۔

''اری بے شرم ماں سے ایسی بات کرتی ہے بے غیرت۔''

''ہاں تو صحیح تو کہہ رہی ہوں، کبھی تم نے اور ابا نے ان کو پڑھانے لکھانے کا سوچا نہ کھانا ڈھنگ سے دیا۔ بس پیدا کیے جاؤ۔'' روبینہ کو آج خوب تپ چڑھی تھی۔ اس کے صبح شام بس بہن بھائیوں کو سنبھالتے اور پکاتے گزرتے تھے۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ لڑلڑ کے اس نے میٹرک کیا تھا اس سے آگے وہ چاہنے کے باوجود نہ پڑھ سکی اس لیے سارا دن بس کڑھتی رہتی تھی۔

☆......☆

ٹرن ٹرن ہلکی سی بیپ کی آواز نے اسے متوجہ کیا تکیے کے نیچے سے موبائل نکال کے دیکھا۔ تین میسج آئے ہوئے تھے اور ایک ہی سوال پوچھا گیا تھا۔ پچھلے دو دن سے ایک انجان نمبر سے کال اور پیغام آرہا تھا آج بھی میسج دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور جواب دے بیٹھی۔

لڑکا: اپنا نام تو بتا دیں۔

لڑکی: آرزو۔

لڑکا: آپ کی آواز جتنی پیاری ہے نام بھی اتنا ہی پیارا ہے۔

لڑکی: کوئی جواب نہیں۔

لڑکا: آپ نے میرا نام تو پوچھا نہیں۔

لڑکی: خود ہی بتا دیں۔

لڑکا: ارمان۔

☆......☆

''بیٹا نوکری ملی؟'' سعید جیسے ہی گھر میں داخل ہوا ماں نے بے تابی سے پوچھا۔ سعید کو اماں کی آنکھوں میں امید آس کے دیئے بجھانے کی ہمت نہیں ہوئی وہ سر جھکا کر کمرے میں چلا گیا اور ماں سمجھ گئی کہ وہ آج بھی مایوس لوٹا ہے۔

☆......☆

اسٹیشن کے ایک کونے میں بیٹھی وہ کافی گھبرا رہی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو آس پاس موجود تھا۔ سب کو ہی ٹرین کے آنے کا انتظار تھا لیکن اسے ٹرین سے زیادہ کسی اور کی آمد کا انتظار تھا۔

☆......☆

''اماں یہ پکڑ اپنے لعل کو مجھ سے نہیں سنبھل رہا۔'' اماں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی روبینہ نے سب سے چھوٹے والے کو اماں کے ہاتھ میں دیا جسے چھوڑ کے اماں محلے کے دورے پر نکلی تھیں اور واپسی پر ایک پڑوسن کو ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اس کے لہجے کی بیزاری دیکھ کر پڑوسن خالہ بولیں۔

''اے ہے روبینہ کیا ہوا ہے تجھے! اس طرح بات کرتے ہیں ماں سے۔'' انہوں نے گھر کا۔

''بس خالہ رہنے دے تجھے سنبھالنے پڑیں نا تو......'' روبینہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ارے بات تو پوری کر، سنبھالنے پڑیں ارے سنبھال تو رہی ہوں اللہ رکھے اپنے نو بچوں کو۔'' خالہ نے فخریہ لہجے میں بتایا تو روبینہ کی جان جل گئی۔

''ہاں تو تمہارے اپنے ہیں نا کسی دوسرے کے ہوں تو پتا چلے۔''

''ارے کیا بک رہی ہے، جا جا کے چائے بنا۔'' اماں نے بیچ میں ٹوکا۔

''چائے کہاں سے بناؤں پتی تو ہے نہیں اپنا تو پورا ہوتا نہیں دوسروں کو چائے پلاؤ۔'' روبینہ بکتی جھکتی کمرے میں چلی گئی۔

''ارے رشیدہ اسے کیا ہو گیا پہلے تو ایسے نہیں تھی۔'' خالہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''بس کیا بتاؤں سب حالات تو تمہارے سامنے ہیں۔ رمضان کی نوکری ڈھنگ کی نہیں پورا نہیں پڑتا اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا وہ بھی پورا نہ ہوا بس چڑ چڑی ہو گئی اس لیے۔'' اماں نے تفصیل سے بتایا۔

''ہاں یہ تو ہے ایسا کر شادی کر دے اس کی، لڑکیاں جب منہ کو آنے لگیں نا تو یہی حل ہے۔'' خالہ نے پتے کی بات کی۔

''ہاں بات تو لگی ہے اس کی پھوپی کے گھر مگر اس کی ابھی نوکری ہی نہیں لگی ورنہ سلمٰی خود بات کرتی چلو میں پتا کرتی ہوں۔'' اس نے بات ختم کی۔

☆......☆

ٹرن ٹرن ٹرن۔

لڑکا: آرزو آپ کیا کرتی ہیں؟

لڑکی: گریجویشن کر رہی ہوں اور آپ؟

لڑکا: میں ایم بی اے کر رہا ہوں۔

لڑکی: پھر کیا کریں گے اور آپ کی فیملی......؟

لڑکا: پاپا کا بزنس سنبھالوں گا میں اکلوتا ہوں۔ آپ کی فیملی؟

لڑکی: میں بھی اکلوتی ہوں۔

لڑکا: ارے واہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے اکلوتے دو۔

لڑکی: کیا مطلب؟

لڑکا: کچھ نہیں ایسے ہی منہ سے نکل گیا آرزو پڑھنے کے بعد کیا ارادے ہیں؟

لڑکی: جو ممی پاپا چاہیں گے۔

لڑکا: مگر آپ کی بھی تو کوئی خواہش ہو گی نا؟

لڑکی: نہیں میری کوئی خواہش نہیں اور آپ کیا کریں گے؟

لڑکا: میں بھی پاپا کا بزنس سنبھالوں گا اور شادی تو میں اپنی پسند سے کروں گا۔

لڑکی: آپ کے والدین کو اعتراض نہیں ہو گا؟

لڑکا: نہیں میں ان کا لاڈلا اکلوتا بیٹا ہوں۔ وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔

لڑکی: ہوں ں ں۔

☆......☆

''کیا وہ آئے گا کہیں وہ دھوکا تو نہیں دے گا۔'' وہ دل ہی دل میں وسوسوں اور اندیشوں کا شکار تھی۔ اچھی طرح خود کو چادر میں لپیٹے چہرہ میں تقریباً چھپایا ہوا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے بیگ کو مضبوطی سے تھامے ارد گرد دیکھ رہی تھی کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

☆......☆

سعید نے انٹر کیا تھا وہ آگے پڑھنا چاہتا تھا مگر ابا کی اچانک موت نے اس کے سارے خوابوں کو جیسے چکنا چور کر دیا اب وہی بڑا تھا اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ اس نے پڑھائی چھوڑ کے نوکری ڈھونڈنا شروع کر دی جس میں اسے ابھی تک کامیابی نہیں ملی تھی۔ پھر ایک دوست کے ذریعے اسے ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ تنخواہ کم تھی مگر نہ ہونے سے بہتر تھا کہ وہ اس ملازمت کو قبول کر لے چنانچہ وہ اب فیکٹری جانے لگا۔ یوں زندگی کی گاڑی پٹڑی پر چلنا شروع ہو گئی۔ اس کی منزل کچھ اور تھی وہ ایک اچھی زندگی جینا چاہتا تھا اور اپنے گھر والوں کو بھی وہ سہولیات دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کو پڑھا رہا تھا۔ اس کی بات اس کے ماموں کے گھر طے تھی مگر ابھی اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہ تھا پہلے وہ کچھ بننا چاہتا تھا۔

☆......☆

اس کی بے رنگ زندگی میں ارمان نے جیسے رنگ بھر دیئے تھے اب اسے بھی ارمان کے میسجز کا انتظار رہتا تھا۔ ایک دن ایسے ہی کسی کا رانگ نمبر آیا۔ اس نے آرام سے رونگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا مگر چند دن بعد نئے نمبر سے میسج آیا۔ آرزو بھی اپنے ماں باپ کی بے جا سختیوں سے تنگ تھی ایسے میں وہ بھی ارمان سے بات کرنے لگی اب اس سے کافی اچھی بات چیت تھی۔ تقریباً دو سال تو ہو رہے تھے ان کی موبائل دوستی کو مگر ابھی تک ارمان نے

اس سے کوئی فضول بات یا تقاضا نہیں کیا تھا۔ اس لیے آرزو مطمئن تھی اور اسے پسند بھی کرنے لگی تھی۔

☆......☆

''بیٹا! اب تیری نوکری لگ گئی ہے اور رشیدہ کا بھی فون آیا تھا اگر تو بولے تو......'' اماں رک کر سعید کا منہ دیکھنے لگیں۔

''نہیں اماں ابھی نہیں، ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے گھر کی حالت دیکھ۔'' سعید نے گھر کے خستہ درودیوار پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی کوئی ذکر نہ نکال شادی کا اور ماموں کو بھی منع کردے۔'' اماں سعید کے خوابوں سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے اصرار نہیں کرسکیں اور خاموش ہوگئیں۔

☆......☆

اسے آتے ہی اسٹیشن پر ایک بینچ پر خالی جگہ مل گئی تھی اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی باتوں میں مصروف تھے اور بچے سامنے ہی کھیل رہے تھے۔

☆..... ☆

ٹرن ٹرن۔

لڑکا: آرزو تم ایک خوش حال فیملی سے تعلق رکھتی ہو، پڑھی لکھی بھی ہو، پھر بھی تمہاری باتوں میں کافی اداسی محسوس ہوتی ہے۔

لڑکی: میرے گھر کا ماحول بہت سخت ہے۔ میرے والدین نے سب کچھ دیا سوائے اعتبار کے محبت کے۔ میرا دم گھٹتا ہے اپنے گھر میں۔

لڑکا: تو پھر تم شادی کیوں نہیں کرلیتیں۔

لڑکی: وہ بھی وہی کریں گے۔

لڑکا: تمہاری کوئی پسند نہیں؟

لڑکی: نہیں۔

لڑکا: افسوس ہوا تمہیں میرا خیال نہیں آیا ہم دو سالوں سے رابطے میں ہیں آخر کوئی تو وجہ ہوگی جو میں تم سے بات کرتا ہوں۔

لڑکی: خاموشی۔

لڑکا: آرزو پلیز جواب دو۔

لڑکی: میرے والدین نہیں مانیں گے ہمارے ہاں فیملی میں شادی ہوتی ہے۔

لڑکا: تو تم کرلوگی۔

لڑکی: پتا نہیں۔

لڑکا: آرزو میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں اگر تم چاہو تو ہم ایک ہوسکتے ہیں۔

لڑکی: کیا تمہارے گھر والے قبول کرلیں گے؟

لڑکا: دیکھو ایمانداری کی بات ہے وہ اعتراض کریں گے لیکن جب ہم شادی کرہی چکے ہوں گے تو وہ پھر مان جائیں گے۔ آخر میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔

لڑکی: کیا مطلب ہے تمہارا؟

لڑکا: دیکھو ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہم چھپ کے پہلے نکاح کرلیں گے پھر میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔

لڑکی: ارمان یہ کیا کہہ رہے ہو یہ بہت مشکل ہے۔

لڑکا: تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟

لڑکی: نہیں ایسی بات نہیں لیکن......!

لڑکا: اچھا تم سوچنا اس بارے میں میری طرف سے کوئی جبر نہیں ہے، اوکے۔

☆......☆

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔ آواز نہایت قریب سے آئی تھی اس لیے اسے متوجہ ہونا پڑا۔ ذرا سا رخ موڑ کے اس نے چادر سے اندر ہی دیکھا ایک لڑکا اس لیے اسے متوجہ ہونا پڑا ذرا سا رخ موڑ کے اس نے چادر کے اندر سے ہی دیکھا ایک لڑکا اس سے مخاطب تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی فیملی اٹھ کے جاچکی تھی اور جگہ خالی دیکھ کر وہ اس سے پوچھ رہا تھا اس نے جواب دینے کے بجائے مزید کونے میں خود کو کرلیا اور وہ دوسرے کونے پر ٹک گیا۔

☆......☆

''روبینہ کے ابا۔'' اماں نے کھانا کھاتے شوہر کو مخاطب کیا۔

''ہاں کیا ہوا؟'' ابا نے روٹی کا نوالہ سالن میں بھگوتے ہوئے پوچھا۔

''آپا کا فون آیا تھا بتا رہی تھیں سعید کو نوکری مل گئی ہے۔''

''اچھا یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' ابا نے کھانا جاری رکھا۔

''ہاں مگر انہوں نے شادی کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔'' اماں نے بات پوری کی۔

''ارے تو کیا ہوا ابھی تو لگی ہے نوکری ذرا جمع جوڑ کرلے پھر اس دوران ہم بھی کچھ جمع کرلیں

گے۔'' ابا نے تسلی دی۔

''میں سوچ رہی ہوں ہم ایک چکر حیدر آباد کا لگا لیں۔ برسوں ہو گئے، بس فون پر ہی بات ہوتی ہے۔ سعید کو بھی دیکھ لیں گے کیسا ہو گیا بڑا ہو کے، دس سال پہلے دیکھا تھا۔ ایک تو یہ مہنگائی کچھ کرنے ہی نہیں دیتی۔ سب میل ملاپ بس فون پر ہی رہ گیا ہے۔'' اماں نے پانی شوہر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہہ تو صحیح رہی ہے چل دیکھتا ہوں پھر چلیں گے حیدر آباد۔'' ابا کو بھی اچانک ہی بہن کی یاد ستانے لگی تھی۔ روبینہ جو ابا کے لیے چائے لے کر آ رہی تھی یہ سب سن کر واپس پلٹ گئی۔

☆......☆

''کیا میں صحیح کر رہا ہوں۔'' ارمان نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''میں اس کو دھوکا تھوڑی دوں گا۔ ہمیشہ محبت اور عزت کروں گا بس اس کی دولت اگر میرے بھی کام آ جائے تو سالوں کا سفر جلدی طے ہو جائے گا اور وہ بھی تو خوش رہے گی اپنے والدین کی اکلوتی ہے، ہر چیز کی مالک تو اگر اس کا پیسا میرے بھی کام آ جائے تو کیا برائی ہے۔'' ارمان نے خود کو مطمئن کیا۔

☆......☆

ٹرن ٹرن ٹرن......

لڑکی: ارمان میں تیار ہوں۔

لڑکا: واقعی!

☆......☆

''تم سے شادی کر کے تو میری قسمت پھوٹ گئی۔'' آواز پر بینچ کے کونے پر بیٹھے نفوس چونک کے سامنے دیکھنے لگے جہاں ایک عورت اپنے شوہر سے لڑ رہی تھی۔ اس کی آواز زیادہ تیز نہیں تھی لیکن اتفاق سے وہ بینچ کے قریب ہی کھڑے تھے۔ اس لیے آواز کانوں میں پڑ گئی۔

''ہاں تو مجھے کون سی خوشیاں ملی ہیں خالی ہاتھ تو آ گئی تھیں۔'' شوہر بھی دوبدو بولا۔

''تو تم نے لالچ میں کی تھی نا شادی مجھ سے جب کچھ نہیں ملا تو اصلیت دکھا دی۔'' بیوی تڑخ کے بولی۔

''تو تم کون سی نیک بی بی تھیں تم بھی لالچ میں ہی میرے پاس آئی تھیں۔ تم گھر بنانے والی نہیں ہو۔'' شوہر نے منہ بنایا۔

''بچے کا ہی کچھ سوچ لو۔'' بیوی نے اب دو سالہ بچے کو سامنے کیا۔

''کیوں میں کیوں سوچوں جب تمہیں ماں ہو کر خیال نہیں، ایک بار پھر سوچ لو اگر تم گئیں تو واپس مت آنا۔'' شوہر نے آخری وارننگ کے طور پر کہا۔

''تم جیسے کنگلے کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے میں اپنے ماں باپ کے گھر رہوں۔'' بیوی نے حتمی بات کی اور بچے کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گئی۔ جہاں ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔

☆......☆

''کیا ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔'' ارمان اور آرزو نے بیک وقت سوچا۔

''جھوٹ اور دھوکے کا یہی انجام ہوگا تو پھر......''

اس سے آگے دونوں سے سوچا نہ گیا۔ وائبریشن پر آرزو نے موبائل دیکھا۔ ارمان کا میسج آیا ہوا تھا۔

''کیا تم گھر سے نکل گئی ہو؟''

آرزو: نہیں ابھی نہیں۔ دھڑکتے دل سے اس نے جواب دیا۔ ''اور تم......؟''

ارمان: میں بھی ابھی گھر پر ہوں۔

آرزو: کب نکلو گے؟

ارمان: آرزو......!

آرزو: ہاں کہو۔

ارمان: کیا ہم اس طرح جھوٹ بول کر اور گھر والوں کو دھوکا دے کر خوش رہ پائیں گے۔ مجھے معاف کر دو آرزو میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں ایک غریب گھر کا لڑکا ہوں۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔

آرزو: پلیز گھر سے نہیں نکلنا بھول جاؤ سب، ہمیں جو اللہ نے دیا ہے ہمیں اسی میں خوش رہنا چاہیے۔

آرزو: ہاں ارمان تم صحیح کہہ رہے ہو۔ مجھے بھی لالچ آ گیا تھا مگر شکر ہے اللہ نے بروقت ہماری مدد کی۔

ارمان: سب بھول جاؤ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔

آرزو: خدا حافظ۔

☆......☆

ایک دوسرے کو میسج بھیجنے کے بعد ارمان عرف سعید اور روبینہ عرف آرزو نے گھر جانے کے لیے پلیٹ فارم سے مخالف سمت میں قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

پانچویں ٹرین بیتی

# دو پل کا ساتھ



عاطر شاہین

اُس محبت کرنے والے جوڑے کی کہانی جو بس پل بھر ہی ساتھ دے سکا

لاہور ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کا جم غفیر موجود تھا۔ ان میں بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے شامل تھے۔ سب مسافر ملتان جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ مسافر پلیٹ فارم پر موجود بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے تو کچھ مسافر کھڑے ہوئے تھے۔ گرمی بھی شدت کی تھی۔ پلیٹ فارم پر چلنے والے پنکھے گرمی کی شدت کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ گرمی سے لوگوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک ادھیڑ عمر شخص ایک نوجوان لڑکی کا ہاتھ تھامے پلیٹ فارم میں داخل ہوا۔ ادھیڑ عمر شخص نے براؤن کلر کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جبکہ لڑکی ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کی ظاہری حالت سے یہی لگتا تھا جیسے وہ کافی عرصے سے بیمار تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ تھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ بوڑھے آدمی کے بائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی تھا۔

بوڑھے آدمی کا نام ڈاکٹر وقار تھا اور اس کا شمار ملتان کے معروف ڈاکٹروں میں ہوتا تھا جبکہ اس کے ساتھ اس کی بیٹی نبیلہ تھی۔ نبیلہ کی عمر لگ بھگ اٹھائیس سال ہوگی۔ وہ حسین اور دبلی پتلی لڑکی تھی لیکن غم نے اس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی۔

نبیلہ ٹیچر تھی اور ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھاتی رہی تھی۔ پلیٹ فارم میں داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر وقار نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن انہیں کوئی بینچ خالی دکھائی نہ دیا جہاں وہ دونوں بیٹھ سکتے۔

''پاپا...... آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' نبیلہ نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ڈاکٹر وقار سے پوچھا۔

''اپنے گھر......'' ڈاکٹر وقار بولے۔

''اپنے گھر......'' نبیلہ کے چہرے پر حیرت عود آئی۔ ''مگر...... مگر میرا گھر تو یہاں ہے، اسی شہر میں۔''

''نہیں، اب تمہارا گھر یہاں نہیں ہے اس بات کو قبول کر لو۔''

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے پاپا۔ آپ مجھے واپس جانے دیں۔ جب شرافت کو پتہ چلے گا کہ آپ مجھے لے جا رہے ہیں تو وہ ناراض ہوں گے۔ مجھے چھوڑیں، میں واپس جا رہی ہوں۔''

''نبیلہ! اب تمہارا شرافت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔'' ڈاکٹر وقار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو نبیلہ کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔

اس پر گویا سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ وہ خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر وقار کو دیکھنے لگی۔

''پاپا...... شرافت نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ وہ...... وہ تو مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے...... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' نبیلہ پر آہستہ آہستہ ہذیانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

''میری بیٹی! اس حقیقت کو تسلیم کر لو، اب تمہارا شرافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی کم ظرف کی وجہ سے آج تم اس حالت کو پہنچی ہو۔'' ڈاکٹر وقار نے عاجزی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ ان کے درمیان مزید کوئی بات ہوتی اسی اثناء میں ایک نوجوان لڑکا ان کے پاس آیا۔ لڑکے کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی اور اس نے پتلون شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

''آپ انکل وقار ہیں ناں۔'' نوجوان نے کہا تو ڈاکٹر وقار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شناسائی کے سائے ابھرے لیکن انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے اس لڑکے کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔

''جی...... میں ڈاکٹر وقار ہوں مگر تم......''

''انکل۔ میرا نام خرم ہے اور میں آپ کے دوست سعید حسن کا بیٹا خرم ہوں۔'' لڑکے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر وقار کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ انہوں نے والہانہ انداز میں خرم سے مصافحہ کیا۔

''کیسے ہو خرم بیٹے؟''

''انکل میں ٹھیک ہوں۔ یہ باجی نبیلہ ہیں ناں۔'' لڑکے نے نبیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔''

''کیا یہ بیمار ہیں؟''

''ہاں۔ ان کی طبیعت ناساز ہے۔''

''آیئے میرے ساتھ۔ گاڑی تو ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔''

خرم، ڈاکٹر وقار اور نبیلہ کو لیے ایک طرف پڑے بینچ کی طرف لے گیا۔ اس بینچ پر تین اور لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ خرم نے ان لڑکوں کو وہاں سے اٹھ



جانے کا کہا تو وہ وہاں سے اٹھ گئے اور ڈاکٹر وقار اور نبیلہ اس بینچ پر بیٹھ گئے۔ نبیلہ ایک بار پھر خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اچانک اس کی نظر پلیٹ فارم کے ایک ستون پر پڑی تو وہ یکلخت ساکت و جامد ہو گئی جیسے پتھر کی بت بن گئی ہو۔ اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور پھر وہ انہی دھندلائی آنکھوں کے ذریعے ماضی میں پہنچ گئی جب اس کی شرافت سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ اس روز اتوار تھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اسی روز نبیلہ اپنے والدین اور چھوٹی بہن کے ساتھ ملتان کے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی۔ وہ سب ایک ستون کے قریب پڑے بینچ پر بیٹھے لاہور جانے والی گاڑی کے انتظار کر رہے تھے۔ ستون کے ساتھ ایک نوجوان کھڑا تھا جو مسلسل نبیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی تھی۔ نبیلہ اور اس کی بہن عدیلہ دونوں باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ نبیلہ کافی شوخ، چنچل اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اچانک نبیلہ کی نظر ستون کے سہارے کھڑے لڑکے پر پڑی تو لڑکے نے گڑبڑاتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اسے چہرہ دوسری طرف کرتے دیکھ کر نبیلہ کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ اس کے یوں بے ساختہ ہنسنے پر لڑکے نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ لڑکا کافی ہینڈسم اور جاذب نظر شخصیت دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کی رنگت نکھری نکھری سی تھی۔ نبیلہ کو اس لڑکے کا چہرہ دوسری طرف کرنے پر ہنسی آئی تھی۔ نبیلہ کے والد ڈاکٹر وقار نے بھی تیکھی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا تھا تو نبیلہ یکدم ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''آپی! تمہیں کس بات پر ہنسی آئی؟'' عدیلہ نے حیرت بھرے لہجے میں نبیلہ سے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

''اس لڑکے کو دیکھ رہی ہو۔'' نبیلہ نے عدیلہ کی توجہ لڑکے کی طرف دلوائی تو عدیلہ نے چونک کر ستون کے ساتھ کھڑے لڑکے کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔

''ہاں۔ مگر یہ کون ہے؟''

''مجھے کیا پتہ۔'' نبیلہ نے منہ بنایا۔

''تو تم ہنسی کیوں؟''

''مجھے اس لڑکے کو دیکھ کر ہنسی آ گئی تھی۔'' نبیلہ نے جواب دیا۔ ''کیونکہ وہ مسلسل مجھے ہی دیکھے جا رہا ہے۔''

''دیکھتا رہے، کیا فرق پڑتا ہے۔'' عدیلہ نے کہا۔ ''ویسے بھی مردوں کی عورتوں کو دیکھنے کی عادت ہوتی ہے۔''

''مگر میرا خیال ہے کہ میں اسے پسند آ گئی ہوں۔'' نبیلہ مسکرائی۔ پھر اس سے پہلے کہ ان کے درمیان مزید کوئی بات ہوتی، ستون کے ساتھ کھڑا لڑکا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ڈاکٹر وقار کے پاس پہنچ گیا۔ نبیلہ اور عدیلہ دونوں حیرت بھری نظروں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھیں۔

''السلام علیکم۔'' لڑکے نے شستہ لہجے میں کہا تو ڈاکٹر وقار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وعلیکم السلام۔''

''انکل۔ کیا آپ ڈاکٹر وقار ہیں؟''

''جی۔'' ڈاکٹر وقار کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

''میرا نام شرافت ہے اور میں آپ کے دوست صداقت صاحب کا بیٹا ہوں۔'' لڑکے نے کہا تو ڈاکٹر وقار سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے پھر جیسے ڈاکٹر وقار کو کچھ یاد آ گیا تو وہ بولے۔

''ہاں یاد آیا۔ تم اسی صداقت کے بیٹے ہو جو ایک ٹانگ سے معذور ہے۔''

''جی انکل۔''

''تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر وقار نے اس بار اٹھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا پھر وہ انہوں نے اسے اپنے ساتھ بینچ پر بٹھا لیا اور حال احوال پوچھنے لگے۔ شرافت نے بتایا کہ وہ انجینئر ہے اور لاہور میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتا ہے۔ صداقت حسین ایک غریب انسان تھا۔ وہ اور ڈاکٹر وقار لاہور کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر وقار تو میڈیکل لائن میں آ گئے تھے جبکہ صداقت

نے غربت کے باعث ایف اے کرنے کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا اور ایک مقامی فیکٹری میں ملازمت کر لی تھی۔ صداقت حسین کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑی بیٹی تھی جو شادی شدہ تھی اور لاہور میں ہی رہتی تھی جبکہ بیٹے شرافت اور مراتب پڑھتے تھے۔ شرافت ایک خوش شکل اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ وہ کمپنی کے کسی کام سے ملتان آیا تھا اور اب واپس لاہور جا رہا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر وقار اپنی فیملی کے ساتھ ایک رشتے دار کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکٹھے ہی سفر کیا۔ بس یہیں سے ہی نبیلہ اور شرافت میں محبت کی ابتداء ہوئی جو بڑھتے بڑھتے شدت اختیار کر گئی۔ لاہور سے واپسی پر ان کے درمیان فون اور فیس بک پر بات چیت ہونے لگی۔ دونوں نے ساری زندگی ایک ساتھ رہنے کے عہد و پیماں کیے۔ یہاں تک کہ شرافت نے نبیلہ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے علاوہ کبھی کسی اور سے محبت نہیں کرے گا اور صرف اسی کا بن کر رہے گا۔

پھر ایک روز صداقت حسین اپنے بیٹے شرافت کے لیے نبیلہ کا ہاتھ مانگنے آ گئے۔ چونکہ شرافت خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ برسر روزگار تھا اس لیے ڈاکٹر وقار نے فوری طور پر ہاں کر دی اور دو ماہ بعد نبیلہ، شرافت کی شریک حیات بن کر اس کے گھر پہنچ گئی۔

شرافت نہ صرف ایک اچھا شوہر ثابت ہوا بلکہ وہ ہر طرح سے نبیلہ کا خیال رکھتا تھا۔ نبیلہ بھی شرافت کی رفاقت پا کر بے حد خوش تھی اور ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ شادی کا ایک سال گزرنے کے باوجود ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو شرافت گم صم رہنے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی کوئی اولاد ہو لیکن اللہ کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ ان کی شادی کو دو سال ہی گزرے تھے کہ شرافت کو دبئی سے اچھی ملازمت کی آفر ہوئی اور اس نے فوراً ہی آفر قبول کر لی اور کچھ عرصہ کے بعد دبئی چلا گیا جبکہ نبیلہ وقت گزاری کے لیے ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ حالانکہ اسے ملازمت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن نبیلہ اکیلی رہ رہ کر بور ہو جاتی تھی۔

نبیلہ کے ساس سسر بھی بے حد اچھے اور خوش اخلاق تھے۔ انہوں نے کبھی بھی نبیلہ کو اولاد نہ ہونے پر طعنہ نہ دیا تھا بلکہ وہ بھی اللہ کی رضا پر راضی تھے۔

ادھر شرافت نے دبئی کی جس کمپنی میں ملازمت کی تھی اس کمپنی کے مالک طارق ریاض کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام نور جہاں تھا۔ طارق ریاض کا بنیادی طور پر تعلق پاکستان سے تھا اور وہ اپنی فیملی سمیت دبئی میں مقیم تھا۔ نور جہاں کی جب شرافت سے ملاقات ہوئی تو دونوں ہی ایک دوسرے کو پہلی نظر میں پسند آ گئے تھے۔ شرافت جانتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس نے اپنی بیوی نبیلہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ساری زندگی اسی کا ہو کر رہے گا کسی اور لڑکی کی محبت میں کبھی گرفتار نہیں ہو گا لیکن اس دن وہ سب عہد و پیماں ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔

شرافت نے نور جہاں سے یہی کہا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اور اس کی کسی جگہ منگنی بھی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں کی رضامندی سے طارق ریاض نے ان دونوں کی شادی کر دی اور کمپنی کا آدھا شیئر شرافت کے نام کر دیا۔

☆......☆......☆

نبیلہ اپنے سیل فون پر فیس بک دیکھ رہی تھی۔ فیس بک پر اس کی کئی فرینڈز تھیں۔ ان فرینڈز میں پاکستانی لڑکیوں کے علاوہ غیر ملکی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ نبیلہ فارغ اوقات میں ان سے چیٹنگ بھی کرتی تھی۔ انہی لڑکیوں میں دبئی میں رہنے والی ایک لڑکی نور جہاں بھی تھی۔ جس نے چند روز پہلے اسے بتایا تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ نبیلہ نے اس سے پوچھا تھا کہ اس کی شادی پسند کی ہے یا ارینج میرج ہے تو نور جہاں نے بتایا تھا کہ اس کی لو میرج ہے۔ اس نے نبیلہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی شادی کی تصاویر اسے دکھائے گی۔

آج ایک ہفتہ کے بعد نبیلہ فیس بک پر آئی تھی اور اس وقت وہ نور جہاں سے چیٹنگ کر رہی تھی۔

''نور جہاں۔ تمہیں شادی بہت بہت مبارک ہو۔''

نور جہاں نے جواب دیا۔ ''شکریہ نبیلہ۔''

''اپنی شادی کی تصاویر تو شیئر کرو۔ میں بھی دیکھوں تمہارا دلہا کیسا ہے؟'' نبیلہ نے لکھا تو نور جہاں

نے او کے لکھ کر اپنی شادی کی چند تصاویر شیئر کر دیں جن میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ نبیلہ نے جب نور جہاں کے شوہر کی تصویر دیکھی تو وہ بے اختیار چونک پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک جائے گی اور وہ زمین میں سما جائے گی۔ نور جہاں کے ساتھ شادی کرنے والا اس کا شوہر شرافت تھا۔

''شش..... شرافت۔'' نبیلہ کے حلق سے سرسراتی آواز نکلی۔

''کیسا ہے میرا شوہر۔'' نور جہاں کا میسج آیا ہوا تھا لیکن نور جہاں اپنے ہوش و حواس میں کہاں تھی۔ دوسری طرف اس کی ساس اسے کھانے پر بلانے کے لیے آوازیں دے رہی تھیں لیکن نبیلہ تو گویا ساکت و جامد ہو گئی تھی جیسے پتھر کی بت بن گئی ہو۔

''ہیلو نبیلہ۔'' نور جہاں کا ایک بار پھر میسج آیا لیکن نبیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سپنوں کا محل زمین بوس ہو گیا ہو۔ اس کے سارے ارمان بکھر گئے ہوں۔ شرافت نے اس سے کیا ہوا عہد توڑ دیا تھا۔ اس نے سیل فون میز پر رکھا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر ہچکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔

''نبیلہ۔ کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں۔ تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو۔'' اسی لمحے اس کی ساس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں مگر جب انہوں نے نبیلہ کو ہچکیاں لے کر روتے ہوئے دیکھا تو وہ بے اختیار ٹھٹک گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نبیلہ کی طرف بڑھیں۔

''ارے کیوں رو رہی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' انہوں نے نبیلہ کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا لیکن نبیلہ جواب دینے کی بجائے روتی رہی۔

''اگر تم اسی طرح روتی رہی تو مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ ہوا کیا ہے۔'' نبیلہ کی ساس کی نظر اچانک میز پر پڑے اس کے سیل فون پر شرافت کی تصویر پر پڑی تو وہ بھی چونک پڑیں۔ وہ سیل فون اٹھا کر بغور تصویر دیکھنے لگیں۔

''شرافت کے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولیں۔ چونکہ وہ ان پڑھ تھیں اس لیے وہ میسج بھی نہ پڑھ سکتی تھیں۔ وہ نبیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹی! تم بتاؤ، شرافت کے ساتھ یہ لڑکی کون ہے، اس کا شرافت سے کیا رشتہ ہے۔''

نبیلہ نے اشکبار آنکھوں سے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

''امی! شرافت نے دوسری شادی کر لی ہے اور یہ لڑکی..... یہ لڑکی اس کی دوسری بیوی ہے۔''

نبیلہ نے یہ خبر سنا کر گویا بم پھاڑ دیا تھا۔ امی انگشت بدنداں رہ گئیں۔

''شرافت نے دوسری شادی کر لی ہے۔'' نبیلہ کی ساس منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ انہیں بھی بیٹے کے شادی کرنے پر دھچکا لگا تھا۔ انہوں نے سیل فون میز پر رکھا اور نبیلہ کو تسلیاں دینے لگیں لیکن نبیلہ کے لیے یہ صدمہ کسی سانحے سے کم نہیں تھا۔ اس صدمے نے اس کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا جس سے اسے چپ لگ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے کھانا پینا بھی بند کر دیا تھا۔ اسے شرافت سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی۔

شرافت کے والد صداقت حسین نے فوری طور پر بیٹے کو فون کیا اور شادی کی تصدیق چاہی تو شرافت نے اقرار کر لیا کہ اس نے نور جہاں سے دوسری شادی کر لی ہے۔

''شرافت۔ دوسری شادی کرنے سے پہلے تمہیں نبیلہ کے بارے میں سوچ لینا چاہئے تھا کہ جب اسے پتہ چلے گا تو اس پر کیا بیتے گی۔''

''ابو۔ نبیلہ مجھے اولاد تو دے نہیں سکتی پھر میں اس کے بارے میں کیا سوچتا۔'' شرافت نے جواب دیا۔ ''اور ویسے بھی میں نے شادی کی ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ تم نے دوسری شادی کر کے گناہ کیا ہے۔'' صداقت حسین نے کہا۔ ''لیکن تمہیں نبیلہ کو آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ جانتے ہو تمہاری دوسری شادی کا سن کر اس کا صدمے سے برا حال ہے اور وہ نیم پاگل ہو چکی ہے۔''

”میں نے نبیلہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور دو دن کے بعد اسے طلاق نامہ مل جائے گا۔“ شرافت نے جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا جبکہ صداقت حسین اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

☆......☆......☆

دو روز کے بعد شرافت نے دبئی سے نبیلہ کو طلاق نامہ بھجوا دیا تھا۔ نبیلہ پہلے ہی شرافت کی شادی کا سن کر نیم پاگل ہو چکی تھی۔ رہی سہی کسر طلاق نامے نے پوری کر دی۔ اس کی ذہنی حالت ابتر ہو گئی اور وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی تھی۔ صداقت حسین نے ڈاکٹر وقار کو فون کر کے فوری طور پر لاہور بلوالیا تھا تاکہ وہ اپنی نیم پاگل بیٹی کو وہاں سے لے جائیں اور ڈاکٹر وقار اگلے دن لاہور پہنچ گئے۔ انہیں ساری صورتحال معلوم ہوئی تو وہ بھی دکھی ہو گئے تھے لیکن مجبور تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ نبیلہ اپنے شوہر کی بے وفائی کے غم میں نیم پاگل ہو گئی ہے اسی لیے وہ اپنی بیٹی کو لے کر وہاں سے چلے گئے تھے۔

ستون کی طرف دیکھتے ہوئے نبیلہ کی آنکھوں کے سامنے سارے مناظر گھوم رہے تھے جب اسی ستون کے سہارے کھڑا شرافت مسلسل اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ نبیلہ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخسار سے پھسل کر زمین بوس ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی محبت اسی پلیٹ فارم سے شروع ہوئی تھی اور اسی پلیٹ فارم پر ہی اس کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ اس پر نیم پاگل پن کا اثر ختم ہو گیا تھا اور اس کی دماغی حالت ٹھیک ہو گئی تھی لیکن اس کے دل میں پھانس تھی جو کبھی ختم نہ ہو سکتی تھی۔ انمٹ یادیں اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملتان جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی تو سب مسافر اٹھ کر ٹرین کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ڈاکٹر وقار بھی بیٹی کو لیے اس ڈبے کی طرف بڑھ گئے جہاں ان کی سیٹیں ریزرو تھیں۔ ان کے ساتھ خرم نہیں تھا کیونکہ اس کی سیٹ کسی اور ڈبے میں ریزرو تھی۔ پھر جب ٹرین ملتان کے لیے روانہ ہو گئی تو نبیلہ نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ اپنی انمٹ یادوں کو مٹانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

چھٹی ٹرین بیتی

# تمھیں اجازت ہے

مہتاب خان

پلیٹ فارم کی ایک رات نے ان کے درمیان ہر بدگمانی دور کر دی تھی

وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ رات کے دس بجے تھے۔ وہ لاہور کے نزدیک واقع پنج گراں نامی ایک چھوٹے اور غیر معروف ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش ہو رہی تھی کچھ دیر پہلے وہ پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر اپنی ٹرین کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا مختصر سامان بیگ میں اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ اس کی ٹرین کو شام چار بجے روانہ ہونا تھا پھر اچانک ہی تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ قلی کے ذریعے اسے پتا چلا تھا کہ ٹرین چند گھنٹے لیٹ ہے۔ اس طوفان بارش میں وہ واپس اپنے گاؤں بھی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ اس وقت کسی سواری کا ملنا بھی محال تھا۔

چچا جان نے موسم ابر آلود دیکھ کر اسے کہا تھا کہ کل سویرے چلی جانا مگر اس پر تو گھر جانے کی دھن سوار تھی یہاں سے پنڈی صرف چار گھنٹے کا تو سفر تھا اور وہ پہلی بار اکیلے سفر نہیں کر رہی تھی وہ اکثر اکیلے گاؤں جاتی رہی تھی۔ اسے بس اور کوچ سے زیادہ ٹرین کا سفر پسند تھا اسی لیے وہ ٹرین سے سفر کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔

وہ کافی دیر پلیٹ فارم پر بیٹھی ٹرین کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اس چھوٹے سے غیر معروف اسٹیشن پر ویسے بھی لوگوں کا رش کم ہی ہوتا تھا مگر آج تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سناٹا چھا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر اس سے کچھ دور چائے کا واحد کیبن تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ بارش کی وجہ سے خنکی بڑھ گئی تھی اور ریل کی پٹڑیاں زیر آب آ گئی تھیں۔ اسے اب کچھ خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی کہ کیا کرے اتنے میں اسٹیشن ماسٹر اس کے قریب آئے اور کہا۔ ”محترمہ پنڈی جانے والی ٹرین اب صبح سات بجے آئے گی۔ بہتر ہے کہ آپ ویٹنگ روم میں انتظار کر لیں۔“

وہ ان کا شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اس کا رخ ویٹنگ روم کی جانب تھا۔ ویٹنگ روم ایک ہال نما کمرہ تھا جس میں دیوار کے ساتھ ایک آرام دہ صوفہ رکھا ہوا تھا جب کہ درمیان میں ایک میز اور اس کے گرد میز کرسیاں رکھی تھیں۔ ویٹنگ روم کی ایک جانب باتھ روم بھی بنا ہوا تھا۔ ویٹنگ روم کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ کاش اس نے چچا جان کی بات مان لی ہوتی۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ گاؤں اپنی چچا زاد بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی اور ایک ہفتے سے یہیں تھی۔ شہلا صرف اس کی کزن ہی نہیں بلکہ اس کی بے تکلف سہیلی بھی تھی۔

اس وقت وہ بجے سجائے کامدار سوٹ پر میک اپ اور



جیولری پہنے خطرناک حد تک حسین لگ رہی تھی۔ ابھی ویٹنگ روم میں بیٹھے اسے بامشکل چندمنٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈارک براؤن سوٹ پہنے ایک ہاتھ میں سفری بیگ اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس لیے ہوئے ایک شخص تیزی سے ویٹنگ روم میں داخل ہوااور سیدھا کمرے کے درمیان میں رکھی ہوئی میز کی طرف بڑھا۔ میز پراس نے اپنا بریف کیس اور بیگ رکھا۔ اس کی پشت شازیہ کی جانب تھی۔ وہ بری طرح بھیگا ہوا تھااس نے اپنا بیگ کھول کرتولیہ نکالا اور سر خشک کرنے لگا پھر جیسے ہی وہ شازیہ کی جانب پلٹا ان دونوں کو جیسے سکتا ہو گیا بال خشک کرتا اس کا ہاتھ جہاں کا تیاں رہ گیا شازیہ بھی ایک تک اسے دیکھ رہ گئی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ اور کوئی نہیں ارسلان تھا۔ کچھ دیر وہ دونوں گم صم سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''ارسلان!'' شازیہ نے زیرلب دہرایا۔

وہ پانچ سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے سالوں میں وہ کافی حد تک بدل گیا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور لگ رہا تھااوراس کی شیوہ بڑھی ہوئی تھی۔ ارسلان اسے دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا تھا۔ یہ وہ پہلے والی سیدھی سادی شازیہ تو نہیں تھی۔ اس کا گورا سنہرا رنگ نشیلی آنکھیں اس وقت وہ بجی سجائی شازیہ اپنے اس دلکش روپ میں انتہائی حسین لگ رہی تھی۔ شازیہ کو اسلام آباد جانا تھا جب کہ ارسلان کا رخ کراچی کی جانب تھا۔ یوں دونوں کو مخالف سمت میں سفر کرنا تھا۔ ارسلان اپنے نیوز چینل کی طرف سے پشاور ایک رپورٹ کے سلسلے میں آیا تھا اور اب واپس کراچی جارہا تھا۔ وہ پشاور سے بائی روڈ لاہور جارہا تھا۔ اور لاہو سے اسے کراچی کی ٹرین پکڑنی تھی مگر قدرت کی ستم ظریفی کہ اس گاؤں کے نزدیک اس کی رینٹ پر لی ہوئی گاڑی خراب ہوگئی جو کافی کوششوں کے بعد بھی ٹھیک نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ باقی سفر وہ ٹرین کے ذریعے ہی کرے گا۔ اسی لیے وہ اس اسٹیشن پر آیا تھا۔ اس طوفانی بارش میں بائی روڈ سفر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ ٹرین بھی اب صبح ہی ملے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا اس نے سوچا تھا کہ باقی وقت وہ ویٹنگ روم میں

گزارے گا۔ بہر حال زندگی اپنے کسی موڑ پر اس طرح انہیں ایک دوسرے کے سامنے لاکھڑا کرے گی دونوں کو ہی پتا نہیں تھا۔ وہ ایک دم چونک کر اپنے خیالوں سے واپس آیا اور بولا۔ ''تم!'' شازیہ جو اسی کی جانب دیکھ رہی تھی کچھ نہ بولی اور اپنی نظریں جھکا لیں تھیں۔ وہ خاموشی سے مڑا اور اپنے سفری بیگ سے کپڑے نکالے اور باتھ روم کی جانب چلا گیا۔ بیگ وہ یونہی کھلا چھوڑ گیا تھا۔

اسی وقت ایک انیس بیس سالہ لڑکا کمرے میں داخل ہوا اور شازیہ کو مخاطب کر کے بولا۔

''میڈم چائے چاہیے تو لے آؤں، میں کیبن بند کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لے آؤ'' کہتے ہوئے وہ اٹھی اور ارسلان کا بیگ بند کر دیا جسے وہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔

وہ تولیے سے منہ پونچھتا باتھ روم سے نکلا اور میز کے نزدیک رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت چائے والا دو کپ چائے لے کر آ گیا تھا۔ اس نے کپ لا کر میز پر رکھے۔

''ارے چائے کس نے منگوائی؟'' ارسلان نے چائے والے سے استفسار کیا۔

''میڈم نے آرڈر کیا تھا'' وہ حیران نظروں سے شازیہ کو دیکھنے لگا۔ شازیہ نے کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ارسلان نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے جاؤ'' چائے والا واپس چلا گیا۔

''وہ خود پوچھنے آیا تھا میں نے کہہ دیا لے آؤ'' شازیہ نے وضاحت پیش کی۔

''اب آ گئی ہے تو آ ؤ پی لو'' وہ جو صوفے پر بیٹھی تھی آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو تم؟'' ارسلان نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اسلام آباد''

''وہیں رہتی ہو؟''

''جی'' شازیہ نے مختصر جواب دیا۔

''اچھی ہو گئی ہو۔ خوب صورت ہو گئی ہو'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''پانچ سال پہلے خوب صورت نہیں تھی کیا؟''

''نہیں...... پہلے بھی خوب صورت تھیں مگر اب زیادہ ہو گئی ہو۔''

''آپ یہاں کیسے؟''

''ایک نیوز رپورٹ کے سلسلے میں پشاور گیا تھا۔ واپس جا رہا ہوں۔''

''کہاں؟'' وہ بولی۔

''گھر۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''وہیں رہتے ہیں آپ؟''

''ہاں وہیں، وہی شہر ہے وہی گلی وہی گھر...... سب کچھ وہی تو نہیں رہا لیکن ہے وہیں۔ اسی جگہ۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا تھا۔ وہ گہرے خیالوں میں کھو گیا۔

پنج گراں نامی اس اسٹیشن سے کوئی دس پندرہ کلو میٹر دور دینا نامی گاؤں سے اس کا تعلق تھا۔ شازیہ اس کی خالہ زاد تھی۔ ارسلان کی امی اور شازیہ کی امی سگی بہنیں تھیں اور ان دونوں میں پرانی محبت تھی۔ ارسلان کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ والد کی وفات کے بعد خالہ اور خالو نے ہی ان بے سہارا ماں بیٹے کو سہارا دیا تھا۔ ارسلان ابھی میٹرک میں ہی تھا کہ اس کی امی بھی مختصر عدالت کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ اس مشکل گھڑی میں خالہ اور خالو نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ یوں ارسلان خود کو ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرتا تھا۔

ارسلان اور شازیہ کی منگنی ارسلان کی امی نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ اس وقت وہ کم عمر اور ناسمجھ تھے۔ اس وقت ارسلان کو اس منگنی پر کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔ اعتراض تو اسے کافی بعد میں ہوا۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے کراچی گیا تھا۔ یہاں اس نے ایم اے ماس کمیونی کیشن بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور اسے ایک بڑے نیوز چینل پر ملازمت بھی مل گئی تھی۔ یہاں اس کی ملاقات ایک نہایت بے باک شوخ اور تیز طرار ماڈل سوہا سے ہوئی تھی۔ وہ اتنی تیزی سے اس کے نزدیک آئی کہ وہ سنبھل بھی نہ سکا تھا۔ دوستی سے محبت تک کے تمام مرحلے سوہا نے ہی طے کیے تھے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہیں بتا سکا تھا کہ اس کی منگنی بچپن میں ہی کر دی گئی ہے اور اس کی منگیتر شازیہ گاؤں میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ سوہا کی طوفانی محبت کے تیز بہاؤ میں بہہ گیا تھا۔

سوہا اس وقت کی بڑی مشہور و معروف ماڈل تھی اور

اپنے کیریئر کے عروج پر تھی۔ اس کا احساس ارسلان کو تب ہوا تھا جب اس نے سویا کو پروپوز کیا تھا۔ اس کا پرپوزل سن کر وہ زور سے ہنسی تھی۔

''شادی اور میں ہرگز نہیں میں اپنے کیریئر کے اس عروج پر شادی کر کے گم نامی کے اندھیروں میں ڈوبنا نہیں چاہتی۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ لائف انجوائے کرنی ہے۔ اس کی باتیں سن کر ارسلان بڑا مایوس ہو گیا تھا۔

کچھ دن گزرے تھے۔ سویا ایک شوٹ کے سلسلے میں ان دنوں مرا کو گئی ہوئی تھی۔ جب اسے خالو جان کا خط موصول ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ تمہاری خالہ بہت بیمار ہیں اور تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں جتنی جلدی ممکن ہو آجاؤ۔ وہ خالہ کی بیماری کا پڑھ کر بے چین ہو گیا تھا اس نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور گاؤں آ گیا۔

گاؤں میں سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ خالو جان اسے گھر کے دروازے پر ہی مل گئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور اسے گلے سے لگا لیا۔

''بڑی راہ دکھائی ارسلان، شہر جا کر تو ہمیں بھول ہی گئے۔'' پھر وہ اسے لیے ہوئے گھر کے اندر آ گئے جہاں برآمدے میں ایک چارپائی پر اس کی خالہ لیٹی ہوئی تھیں۔

''لو بھئی بھاگوان تمہارا داماد آ گیا۔'' خالہ جان نے وہیں سے آواز لگائی۔

''ارے آ گیا بیٹا۔'' وہ چونک کر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''السلام علیکم خالہ۔'' ارسلان نے ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام! کیسا ہے بیٹا، بڑا انتظار کروایا تو نے۔'' وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔

''تمہاری جاب کیسی چل رہی ہے اور سنا ہے تم نے وہاں اپنا گھر بھی خرید لیا ہے؟'' خالو جان ان کے نزدیک ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''جی خالو آپ کی مہربانی اور دعاؤں سے جاب بھی اچھی ہے اور اپنا گھر بھی لے لیا ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنی امانت لے جاؤ اب کیا انتظار ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔

''ہاں بیٹا اب میری زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنی زندگی میں شازیہ کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ ان کی باتیں سن کر اس نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے ارسلان تمہاری اور شازیہ کی منگنی تمہاری ماں بچپن میں ہی کر گئی تھیں۔ پہلے تم پڑھ رہے تھے پھر جاب کر لی۔ نئی نئی جاب تھی اس لیے ہم نے کچھ نہیں کہا۔ انتظار کرتے رہے مگر اب تو جاب کیے بھی تمہیں تین سال ہو گئے ہیں۔ شازیہ نے بھی پرائیویٹ بی اے پاس کر لیا ہے۔ تمہارے کہنے پر ہی اسے پڑھایا ہے ورنہ تمہیں تو پتا ہے کہ گاؤں میں کوئی لڑکی پڑھی لکھی نہیں ہے۔'' خالو جان نے کہا تھا۔

''مجھے پتا ہے بیٹا تم اب انکار نہیں کرو گے۔ اب آئے ہو تو شادی کر کے ہی جاؤ گے۔'' خالہ جان نے اس کا ہاتھ اپنے کمزور اور نحیف ہاتھوں میں لے کر بڑے مان سے کہا تھا۔ وہ بھلا انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے سر جھکا دیا۔ ارسلان جو ان کے احسانوں اور لازوال محبتوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اب وہ قرض چکانے کا وقت آ گیا تھا۔

اس نے تو ابھی شازیہ کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے دیکھے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے اب وہ کیسی ہو گی۔ ارسلان نے سوچا تھا۔

''پھر ٹھیک ہے اگلے ہفتے ان دونوں کی شادی کروا دیتے ہیں۔ میں ذرا برادری کو خبر دے دوں۔'' خالو جان اٹھتے ہوئے بولے۔

''اگلے ہفتے اتنی جلدی۔'' وہ ایک دم چونک کر جلدی سے بولا۔

''ارے بھئی گھر کی لڑکی، گھر کا لڑکا ہے زیادہ تام جھام تو نہیں کرنا ہے۔ بس تم دولہا بن کر آ جانا اور اپنی امانت لے جانا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے اور باہر چلے گئے۔

پھر ایک ہفتے بعد اس کی شادی ہو گئی اور اسی رات وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر کراچی روانہ ہو گیا تھا۔

آج اس کے گھر میں شادی کے بعد پہلی رات تھی۔ اس کے ایک کولیگ ندیم کی وائف نے شازیہ کو تیار کیا تھا۔ وہ حجلہ عروسی میں شازیہ کا رنگ و روپ دیکھ کر حیران

رہ گیا تھا۔ اس کا ملکوتی حسن نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہا تھا۔ وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور شازیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

''دیکھو شازیہ! آج سے ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں۔ میں اپنی اس نئی زندگی کا آغاز کسی دھوکے یا جھوٹ پر نہیں رکھنا چاہتا۔ تم بچپن سے میرے نام سے منسوب ہو تم نے اس زندگی کے لیے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ انشاء اللہ میں ان سارے خوابوں کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھ سے یہاں ایک بھول ہو گئی تھی بس سوہا نامی ایک ماڈل سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں اسے بھلانے کی اب پوری کوشش کروں گا۔ ہو سکے تو اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔''

اس پہلی ہی رات شازیہ کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی حسین آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ ان آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے پلکیں جھکا لیں کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی پھر شازیہ بولی۔

''آپ کو اس شادی سے انکار کر دینا چاہیے تھا اگر آپ ابا کو ساری بات بتا دیتے تو وہ یہ شادی نہیں کرواتے اور نہ ہی میں راضی ہوتی۔ آپ کو سوہا سے شادی کرنا چاہیے تھی۔'' وہ نظریں جھکائے کہتی رہی۔

''تمہیں نہیں پتا وہ بہت عجیب لڑکی ہے۔ وہ مجھ سے شدید محبت کرتی ہے لیکن شادی کرنے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنا کیریئر ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔''

''تو یوں کہیں نا کہ اسے اپنا کیریئر آپ سے زیادہ عزیز ہے۔'' اس کی اس بات پر ارسلان نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ایسا ہی لگتا ہے۔''

شازیہ نے بہت جلد اس کے گھر کو اور اسے سنبھال لیا تھا وہ بڑی سمجھدار تھی۔

شازیہ نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا اسی وقت کیبن والا چائے کے خالی برتن لینے ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔

''سنو یہ لو پیسے اور باقی پیسے تم رکھ لینا۔'' ارسلان اسے پیسے دیتا ہوا بولا۔ ''اچھا سنو یہاں پر کچھ کھانے والے کو ملے گا۔''

''ابھی تو سب بند ہو گیا صاحب کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' لڑکا بولا تھا۔

''کچھ بھی نہیں بسکٹ وسکٹ سموسہ وغیرہ۔''

''نہیں صاحب کچھ بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' وہ سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

ارسلان اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے پر کھڑا کچھ دیر پلیٹ فارم کی طرف دیکھتا رہا جہاں دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایسی طوفانی بارش تو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اتنی دیر میں زور سے بادل گرجا اور بجلی کڑکی کہ پورا ماحول روشن ہو گیا۔ وہ کمرے کے اندر آتے ہوئے بولا۔

''بارش تو اور تیز ہو گئی ہے لگتا نہیں کہ آج رکے گی۔''

''برس جائے گی تو اپنے آپ رک جائے گی۔'' وہ بولی تھی۔ ''سوہا کہاں ہے۔ آپ نے اس سے شادی کی؟''

ارسلان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ پوچھنے لگا۔

''تمہاری ٹرین صبح کس وقت کی ہے؟''

''صبح سات بجے کی۔''

''میری آٹھ بجے کی ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''ایک رات کی بات ہے۔ ایک رات تمہیں میرا ساتھ اور برداشت کرنا پڑے گا۔ خیر جہاں اتنے سال برداشت کیے تھے وہاں ایک رات اور سہی۔'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کس نے برداشت کیے تھے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''تم نے برداشت کیے تھے۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے شادی کے بعد کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ خدا گواہ ہے میں تم سے وفادار تھا۔ میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تم سے کچھ نہیں چھپایا سب کچھ تمہیں سچ سچ بتا دیتا تھا۔ یہی غلطی تھی نہ میری۔''

''دیکھیں یہ گھر نہیں پلیٹ فارم ہے۔''

''ہمارا گھر بھی تو پلیٹ فارم کی طرح تھا۔''

آپ پھر وہ جھگڑا کیوں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں مانگا آپ سے یہاں

تک کہ آپ کی محبت بھی نہیں۔"

"وہی تو..... وہی تو میں کہہ رہا ہوں تم نے کچھ کہا ہوتا کچھ سنا ہوتا۔ کچھ انتظار کرلیا ہوتا تو یہ دوریاں نہ ہوتیں ہمارے درمیان۔"

ابھی ارسلان کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ اسٹیشن ماسٹر کمرے میں داخل ہوئے اور بولے۔

"بڑی طوفانی بارش ہوئی ہے آج ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ خنکی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ آپ دونوں کی ٹرین تو صبح آئے گی۔ رات آپ کو یہیں کاٹنی ہوگی اگر چاہیں تو کمبل اور تکیے کا انتظام ہوسکتا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے ارسلان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" ارسلان بولا۔

"جی نہیں رہنے دیں ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔" وہ جلدی سے بولی تو ارسلان نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟" اسٹیشن ماسٹر بولے۔

"ہاں۔" ارسلان نے کہا۔

"نہیں۔" وہ فوراً بولی۔ "جی آج ہی رات ان سے جان پہچان ہوئی ہے۔" اس نے وضاحت پیش کی۔

"ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ بندہ اچھی طرح کاٹ لے تو بڑی بات ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" وہ ارسلان کی طرف دیکھ لے۔

"جی ہاں یہ زندگی بھی تو ایک ویٹنگ روم ہے۔" وہ بولا۔

"اب بس بھی کیجیے۔" شازیہ نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ زور سے ہنسا۔

اسٹیشن ماسٹر واپس جانے لگے تو ارسلان نے کہا۔

"یہاں کھانے کو کچھ مل سکتا ہے؟"

"کھانے کو تو کچھ نہیں ملے گا بھائی ہاں چائے پینی ہے تو میرے آفس میں آجائیں۔" چائے کا انتظام ہوسکتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اسٹیشن کے باہر کچھ ملے گا۔"

"بہت مشکل ہے اس وقت کچھ ملے۔"

"اب چھوڑیے بھی کھانا وانا جانے دیں انہیں۔"

"بہت ہنس مکھ ہیں صاحب اگر آپ اکیلی ہوتیں تو گھبرا جاتیں۔" کہتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کمرے سے چلے گئے۔

"وہ اسٹیشن ماسٹر کیا سمجھا ہوگا؟" کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"کیا سمجھا ہوگا یہی نا کہ میں تم کو بتا رہا ہوں اور کیا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہی تو سمجھے گا۔" وہ دھیرے سے بولا تھا۔

کچھ دیر بعد ارسلان اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جاکر کچھ کھانے والے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"رہنے دیں مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ بولی تھی۔

"بھوک کیسے نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے کی تو تم یہاں بیٹھی ہو۔" وہ بولا۔ "تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔"

"لیکن مجھے بھوک نہیں ہے۔" "تم دروازہ اندر سے بند کرلو۔"

"پھر وہی بحث، میں جاکر دیکھتا ہوں۔" وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

پلیٹ فارم پر صرف بارش کی آواز تھی۔ بارش پہلے سے کچھ کم ہوگئی تھی لیکن رکی نہیں تھی۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر ایک جانب چل دیا تھا۔

ارسلان کو گئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ شازیہ نے ویٹنگ روم کا دروازہ اندر سے لاک کیا ہوا تھا۔ وہ میز پر بکھرا ارسلان کا سامان سمیٹ کر اس کے بیگ میں رکھ رہی تھی کہ دروازہ بجا۔ وہ دروازے کے قریب آئی۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یارو دروازہ کھولو میں ہوں تمہارا دیوداس۔" ارسلان شوخی سے بولا تھا۔

شازیہ نے دروازہ کھولا۔ "کہاں چلے گئے تھے آپ اتنی دیر کردی۔"

"کھانا لانے گیا تھا محترمہ آپ کے لیے کھانا تو نہیں ملا یہ بسکٹ کے کچھ پیکٹ ہی ملے ہیں۔ انہی سے گزارا کرو فی الحال۔"

"آپ تو پورے بھیگ گئے ہیں۔" اس نے جلدی سے تولیہ لاکر اسے دیا۔ "جایئے پہلے کپڑے بدل لیجیے۔ میں آپ کے کپڑے نکال دیتی ہوں۔"

وہ اس سے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔

ابھی وہ کپڑے بدل کر کرسی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اسے زور دار چھینک آ گئی۔

''دیکھا لگ گئی نا سردی، کیا ضرورت تھی باہر جانے کی۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی امی اور اپنی گرم چادر لا کر اس کے کاندھوں پر ڈال دی۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

''ایسے میں گرما گرم چائے مل جائے تو مزا آ جائے۔'' وہ بولا۔ اس کی بات سن کر وہ ماضی میں کھو گئی۔

''یار ایک کپ چائے اور ملے گی۔'' وہ دونوں اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ارسلان نے اخبار پر نظریں جمائے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''کچھ پتا بھی ہے صبح سے کتنے کپ چائے پی چکے ہیں آپ۔ بس اب چائے وائے نہیں ملے گی۔''

''بڑی کنجوس ہو میری چائے کا حساب رکھتی ہو۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی تو ارسلان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''جانے دیں بہت کام پڑے ہیں۔'' وہ بولی تھی۔

''ارے بیٹھو نہ کیا صبح صبح کام شروع کر دیتی ہو۔ کبھی میرے پاس بھی بیٹھا کرو۔ آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا۔ مجھے بس اس میں دلچسپی ہے کہ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے اور آپ کو آفس نہیں جانا کیا۔ وہ بھی میں یاد دلاؤں؟''

''یار دل نہیں چاہ رہا۔''

''جائیں تو اچھا ہے اور نہ جائیں تو اور بھی اچھا ہے۔'' وہ شوخی سے بولی تھی۔

''تمہیں دیکھ کر لگتا نہیں کہ پہلی بار تمہاری شادی ہوی ہے۔ بڑی ایکسپرٹ بیوی دکھائی دیتی ہو۔'' وہ زور سے ہنس پڑی تھی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

شازیہ نے ہنستے ہوئے فون اٹھایا۔ ''ہیلو۔'' کچھ دیر وہ دوسری طرف کی آواز سنتی رہی۔

''میں شازیہ بول رہی ہوں۔'' کچھ دیر ٹھہر کر اس نے پوچھا۔ ''آپ کون؟''

''جی میں ارسلان کی وائف ہوں۔'' کچھ دیر اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر بولی۔ ایک منٹ میں ابھی بات کرواتی ہوں۔ آپ کا فون ہے؟'' اس نے ریسیور ارسلان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جو اس کے نزدیک آ گیا تھا۔

''کون ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''سوہا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس سے کہہ دو آفس میں فون کر لے میں آفس ہی جا رہا ہوں۔''

''آپ خود ہی کہہ دیجیے۔'' کہہ کر ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑا کر وہ ناراضگی سے مڑی تھی۔

ارسلان نے ہیلو کہا مگر دوسری طرف سوہا فون بند کر چکی تھی۔

وہ اس کے پاس چلا آیا۔ ''شازیہ میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ تمہیں سچ سچ بتا دیا ہے۔ سوہا مرا کوئی ہوئی تھی۔ اسے میری شادی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ ہر تعلق توڑ لوں گا۔ پلیز ہمیں تھوڑا وقت دو۔'' اس نے خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ابھی وہ آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ سوہا اس کے کمرے میں آ دھمکی۔

''تم...... تم نے شادی کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''میں نے تمہیں پرپوز کیا تھا۔ تم نے خود ہی تو انکار کر دیا تھا پھر میں کیا کرتا۔''

''تمہیں شادی کی ایسی جلدی کیا تھی۔ کون ہے وہ جس سے تم نے شادی کی ہے۔''

''میری کزن ہے۔ گاؤں میں رہتی تھی۔''

''تم...... تم جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے تھے۔ میرے بہترین دوست تھے مجھے ایک فون تک نہیں کیا۔''

''تم اتنی دور تھیں اور بہت مصروف بھی۔ فون کرنے سے بھلا کیا ہوتا۔''

''تم بہت برے ہو ارسلان بہت برے ہو۔'' وہ سر پکڑے کچھ دیر اس کے سامنے بیٹھی رہی پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور چلی گئی۔ وہ اس کے ری ایکشن پر حیران تھا۔

ندیم اس کا کولیگ جو شاید کمرے کے باہر ہی کھڑا تھا اندر آ کر بولا۔

''بلا ٹل گئی۔ تم نے بھی کیا مصیبت گلے لگائی ہوئی ہے۔''

''یار کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

''یہ مصیبت اتنی آسانی سے ٹلنے والی نہیں ہے۔ میری سیدھی سادی بھابی کو اس نے بڑا تنگ کرنا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''نہیں یار شازیہ بڑی سمجھدار ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''ارے تم ان عورتوں کی فطرت کو نہیں جانتے۔ اللہ تم پر رحم کرے۔'' وہ اوپر کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' ارسلان اطمینان سے بولا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ شازیہ پر صبح سے ہی صفائی کا بھوت سوار تھا۔ وہ اوپر کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی جب کہ ارسلان نیچے اپنے بیڈروم میں بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ اچانک بیڈروم کا دروازہ کھلا اور شازیہ اندر آئی۔

''یہ اوپر کمرے میں لیڈیز سامان کس کا ہے؟'' اس نے ایک لیڈیز سوئیٹر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

''سوہا کا ہوگا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''کیا وہ یہاں آتی رہتی تھی؟''

''ہاں اکثر۔'' وہ کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

شازیہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ارسلان کی نظر اچانک اس کے چہرے پر پڑی تو وہ کچھ ہچکچا گیا۔

''تم ایسا کرو کہ اس کا سامان باندھ دو میں اسے واپس بھجوا دوں گا۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا تھا۔

''رہنے دیں سامان سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ویسے بھی تو ہمارے درمیان رہ رہی ہے۔'' کہتے ہوئے وہ ناراضگی سے کمرے سے چلی گئی۔ وہ اسے منانے کے لیے تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔

کچھ وقت اور گزر رہا تھا۔ اس دوران سوہا خاموش نہیں رہی تھی۔ وہ بار بار ارسلان سے ملنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور وہ ہر بار اسے ٹالتا رہتا تھا۔ وہ اسے کبھی گھر پر فون کرتی تو کبھی اس کے موبائل پر تو کبھی آفس میں۔ کبھی وہ اس سے بات کر لیتا اور کبھی ٹال دیتا تھا۔ اس دن بھی اس کا فون ارسلان کے آفس کے نمبر پر آیا ہوا تھا۔

''میں تمہیں بہت مس کر رہی ہوں ارسلان۔ میں نے تمہیں بھلانے کی بہت کوشش کی مگر میں ناکام رہی ہوں۔ میں نے بہت سوچا ہے ارسلان۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو۔ میں..... میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ بے قصور ہے۔ میں اسے سزا نہیں دے سکتا۔''

''ہاں قصوروار تو صرف میں ہوں نا۔ اچھا تم اسے نہ چھوڑو مگر مجھ سے بھی شادی کر لو۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو فضول باتیں کر رہی ہو۔''

''ہاں ہاں میں پاگل ہوگئی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سن لیا نا تم نے۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلاتے ہوئے بول رہی تھی۔ ارسلان نے اس کی بات پوری سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔

''یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ دن کے دو بجے تھے۔ ارسلان کے موبائل فون کی گھنٹی بھی اجنبی نمبر دیکھ کر وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس کا ہے پھر اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سوہا کی سہیلی رابعہ تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ارسلان آپ جلدی سے میرے اسپتال آجائیں۔ سوہا نے سلیپنگ پلز کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔''

رابعہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی اور شہر کے پوش علاقے میں اس کا ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا رابعہ کے اسپتال پہنچا تھا۔

''کیا ہوا سوہا کو وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' رابعہ کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ بروقت اسے بھی امداد مل گئی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''کیا ہوا تھا؟''

''میں تو اتفاقاً اس کے گھر گئی تھی۔ وہاں اپنے

روم میں یہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے بڑی مشکل سے ملازمہ کے سہارے میں نے اپنی گاڑی میں اسے ڈالا تھا اور اسے اسپتال لے آئی تھی۔ تمہیں تو پتا ہے اپنے گھر والوں سے اس کی نہیں بنتی اسی لیے اکیلی رہتی ہے۔ اچھا ہوا نا میں اسے یہاں لے آئی ورنہ پولیس کیس بن جاتا۔''

''ابھی کہاں ہے؟''

''چلو میرے ساتھ۔'' وہ ارسلان کو ساتھ لیے ایک کمرے کی سمت بڑھ گئی۔ سوہا انہیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

''کیوں بچایا تم نے مجھے مرجانے دیتیں، میں جینا نہیں چاہتی۔'' وہ بری طرح رورہی تھی۔

''ارسلان تم ہی اسے سمجھاؤ۔'' کہتی ہوئی رابعہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

''یہ سب کیا ہے سوہا۔ تمہیں پتا ہے نا خودکشی حرام ہے۔ خدا کے لیے اس چکاچوند والی مصنوعی دنیا سے باہر نکل آؤ۔ شادی کرو اپنا گھر بساؤ۔ یہ زندگی جو تم گزار رہی ہو دھوکے اور فریب سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں شازیہ کے حوالے کردوں۔ وہ بہت سمجھدار ہے۔ وہی تمہیں سمجھا سکتی ہے۔''

''چلے جاؤ یہاں سے میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''جبھی خودکشی کر کے میری دوڑیں لگوائی ہیں دل چاہ رہا ہے اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا دبا دوں۔''

''تو دبا دو اچھا ہے جان چھوٹ جائے گی۔ میری اور تمہاری دونوں دونوں کی۔''

''مجھے معاف کردو ارسلان میں واقعی غلطی پر تھی۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اب تمہیں تنگ نہیں کروں گی اور تمہارے کہنے کے مطابق شاید کبھی شادی بھی کرلوں۔ تم جاؤ اور شازیہ کے ساتھ خوش رہو۔ میں اب تمہاری زندگی میں کبھی نہیں آؤں گی۔'' وہ بڑے ٹھہرے لہجے میں بول رہی تھی۔ اتنی دیر میں رابعہ بھی آگئی تھی وہ کافی دیر وہاں بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔

اسی شام کی بات ہے شازیہ گھر کا کچھ ضروری سامان لینے مارکیٹ گئی تھی شاپنگ کے دوران اسے ندیم اور اس کی وائف ملے۔

''ارے بھابی آپ اکیلی یہاں، ارسلان کہاں ہے؟''

''ان کا فون آیا تھا کہہ رہے تھے دفتر میں کچھ کام ہے دیر ہوجائے گی۔ اسی لیے میں اکیلی چلی آئی۔''

''اچھا۔'' وہ حیرانی سے بولا۔ ''دفتر۔ سے تو وہ آج دو بجے ہی چلا گیا تھا۔''

''کیا؟ جلدی چلے گئے تھے۔'' شازیہ حیرانی سے بولی۔

''ہوسکتا ہے کسی کام سے گیا ہو۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا تھا۔

وہ واپس گھر آئی۔ ارسلان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ کافی دیر لاؤنج میں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی۔ پھر اٹھ کر بیڈروم میں آگئی۔ رات کافی گہری ہوگئی تھی۔ کافی دیر وہ کروٹیں بدلتی رہی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اٹھ کر دوبارہ لاؤنج میں آگئی۔

وہاں صوفے پر ارسلان لیٹا ہوا تھا۔ آنکھوں پر اس نے اپنا بازو رکھا ہوا تھا۔

''ارے آپ کب آئے۔ کھانا کھائے بغیر سو رہے ہیں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ نیند آرہی ہے۔ تم بھی جا کر سوجاؤ۔ مجھے بس سونے دو۔'' وہ آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر بولا۔

''سچ سچ بتائیں آپ کہاں گئے تھے؟'' ''فضول سوال نہ کرو سونے دو۔''

''آپ سوہا کے پاس گئے تھے نا؟''

''ہاں گیا تھا۔ اب جاؤ دماغ نہ کھاؤ صبح بات ہو گی۔'' وہ کروٹ لیتے ہوئے بولا تھا۔

وہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پیتی بیڈروم میں چلی آئی تھی۔ کافی دیر وہ سوچتی رہی پھر اس نے ارسلان کے نام ایک مختصر سا خط لکھا اور اپنے کپڑے سوٹ کیس میں ڈالے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے صبح ہونے تک کا وقت کاٹا تھا۔ یہ اس کی زندگی میں آنے والی ایک بڑی کٹھن اور فیصلہ کن رات تھی۔ اس نے وہ خط لاؤنج میں رکھی میز پر اس کی گاڑی کی چابی

کے نیچے رکھا تھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ سوٹ کیس اٹھائے اس کے گھر اور اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر ایک الوداعی حسرت بھری نظر اس گھر پر ڈالی تھی جسے اس نے اپنا سمجھا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنے گاؤں جانے کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

صبح وہ سو کر اٹھا تو گھر کا سناٹا اسے عجیب سا لگا تھا۔ وہ بیڈ روم میں آیا تو وہ خالی تھا۔ اس نے شازیہ کو کئی آوازیں دیں۔ اسے پورے گھر میں تلاش کرتا رہا۔ وہ لاؤنج میں آیا اور ٹیبل پر رکھا اس کا خط پڑھ کر تو ارسلان کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ شازیہ نے لکھا تھا۔

''آپ نے پہلی بار آج مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے پتا ہے آپ سوہا سے محبت کرتے ہیں اور وہ بھی آپ کو چاہتی ہے۔ مجھے زبردستی آپ پر مسلط کیا گیا ہے۔ اب میں اپنی مرضی سے آپ کی زندگی سے نکل رہی ہوں۔ سوہا اور آپ ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ آپ اسے اپنا لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کی مرضی ہے مجھے طلاق دیں یا نہ دیں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے اپنی پوری زندگی آپ سے منسوب رہ کر گزارنی ہے اور آپ سے منسوب رہ کر ہی میں مرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہیں۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش فضول ہوگی۔ میں اب آپ سے کوئی بات نہیں کروں گی۔''

وہ سر پکڑے وہیں صوفے پر کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس نے کہا تھا مجھ سے کوئی رابطہ نہ کرنا لیکن ارسلان نے اسے سینکڑوں فون کیے کئی بار گاؤں اسے منانے گیا لیکن وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ خالہ اور خالو نے بھی اس سے بات کی مگر وہ کسی کی نہیں سنتی تھی۔ پھر ارسلان نے سنا کہ اسے اسلام آباد میں اچھی گورنمنٹ جاب مل گئی ہے اور وہ اسلام آباد لیڈیز ہوسٹل میں رہ رہی ہے۔ ارسلان نے اس سے وہاں بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور آج اتنے سالوں بعد وہ اس طوفانی رات میں اس اسٹیشن پر اسے ٹکرائی تھی۔

''شازیہ تم نے کتنے سالوں بعد آج مجھ سے پوچھا ہے کہ سوہا کہاں ہے اور میں نے اس سے شادی کی یا نہیں؟ کاش تم یہ سوال پہلے کر لیتیں اپنی بدگمانی کو پہلے ہی دور کر لیتیں یا مجھے صفائی کا موقع دیتیں تو اتنے سال ہم جدا نہ رہتے۔''

''کیا مطلب؟ آپ نے اس سے شادی نہیں کی؟''

''نہیں۔ میں اس دن سوہا سے ملنے گیا تھا اس لیے کہ اس بیوقوف لڑکی نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر بعد میں آنے والے تمام واقعات ارسلان نے شازیہ کو بتائے۔

وہ اسے سنا رہا تھا اور شازیہ رو رہی تھی۔

''تمہیں اس دن صبح کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ میری بات سننی چاہیے تھی۔ میرا اس سے ہر تعلق اسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن تم میرے گھر سے چلی گئی تھیں۔ تمہیں نہیں پتا تمہارے بغیر یہ تمام عرصہ میں نے کیسے کاٹا ہے۔ میں ہر وقت ہر لمحہ تمہیں منانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا لیکن تم اتنی پتھر دل ہو کہ تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں کبھی تم سے غافل نہیں رہا تھا۔ بس اب گھر چلو شازیہ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں یہ سب میری بدگمانی کی وجہ سے ہوا ہے۔''

صبح کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ کراچی جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آنے والی تھی۔ وہ دونوں سامان اٹھائے پلیٹ فارم پر آ گئے تھے اور ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

''ویسے شازیہ ہمیں اس اسٹیشن اور اس پلیٹ فارم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا ورنہ ہم نہ جانے کب تک مخالف سمتوں میں چلتے رہتے شازیہ نے ہنستے ہوئے اپنا سر اس کے کندھے پر لگا دیا تھا۔

☆☆☆

سانحہ ٹرین ٹریجڈی

# راستے ایک ہوئے

ڈاکٹر طارق محمود آکاش

ایک پروفیسر کا زندگی نامہ، جس کی زندگی میں آخر بہار آ ہی گئی تھی

پچھلے ایک ہفتے سے دھند کا راج تھا۔ حد نگاہ چند میٹر تک دھند تھی۔ میرا چھوٹا بھائی حسب معمول مجھے چھوڑنے اسٹیشن آیا تھا۔ میری روٹین تھی کہ میں روزانہ صبح ساڑھے سات بجے اسٹیشن پہنچ جاتی تھی۔

بھائی مجھے بائیک پر چھوڑ جاتا تھا۔ تقریباً پونے آٹھ کے قریب لاہور سے گاڑی آتی تھی۔ میں اس پر بیٹھ جاتی اور صرف آدھا گھنٹے کا سفر ہوتا تھا۔ گاڑی مجھے پسرور ریلوے اسٹیشن پر اتار دیتی اور پھر میں وہاں سے کالج چلی جاتی تھی۔ واپسی پر دو بجے والی گاڑی سے میں واپس آجاتی تھی۔

ڈومالہ کے چھوٹے سے قصبہ میں میری رہائش تھی۔ ماں باپ سے بہت مشکل سے پڑھائی کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ میرا پروگرام بی کام کے بعد ایم کام یا ایم بی اے کرنے کا تھا۔ انتہائی ذمہ داری سے میں اپنی پڑھائی میں لگی تھی۔

پچھلے چند روز سے میں دیکھ رہی تھی کہ ایک پچیس چھبیس سالہ انتہائی ہینڈسم آدمی دو بچوں سمیت جن کی عمریں بچے کی چار سال اور بچی کی عمر بمشکل ایک سے کم ہی رہی ہوگی۔ ٹرین میں سوار ہو کر سفر کرتا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ واپسی بھی اس کی دو بجے ہی ہوتی تھی اور جس گاڑی پر میں واپس آتی اسی پر وہ واپس آتا تھا۔ میں ڈومالہ سے بیٹھتی اور وہ چند کلومیٹر آگے قلعہ احمد آباد سے سوار ہوتا اور پسرور اتر جاتا، واپسی پر اس کا اسٹاپ مجھ سے پہلے آجاتا اور وہ قلعہ احمد آباد اتر جاتا تھا۔ پہلے تو میں نے غور نہیں کیا مگر بعد میں بہت سی سوچیں ذہن میں آتیں کہ نہ جانے یہ ہر روز کہاں جاتا ہے اور پھر اتنی سردی میں دو چھوٹے بچوں کو ساتھ لے جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بچہ تو چار سال کا تھا۔ وہ تو تنگ نہ کرتا تھا مگر بچی چھوٹی ہونے کے باعث کافی تنگ کرتی تھی۔ وہ بھی اس کو چھوٹے سے ہینڈ بیگ سے دودھ کی بوتل نکال کر منہ کو لگاتا کبھی کسی چیز کے ساتھ اسے بہلانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت خیال رکھتا کہ بچوں کو سردی سے ہر ممکن طریقے سے بچایا جا سکے۔

میں نہیں جانتی کہ وہ کب سے اسی ٹرین میں سفر کر رہا ہے مگر مجھے اس کو دیکھتے چند ہفتے سے زیادہ نہ ہوا تھا۔ اب تو میں محسوس کر رہی تھی کہ جیسے مجھے اس کا انتظار رہنے لگا تھا اور میں جب بھی وہ کسی اور ڈبے میں سوار ہو جاتا تھا تو پریشان ہو جاتی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دھیان رکھتی اور جب قلعہ احمد آباد کا اسٹاپ آجاتا تو میں اس کو ڈھونڈتی



کہ پتا نہیں وہ آج آیا بھی ہے یا نہیں اور جب وہ سوار ہو جاتا تو جیسے دلی اطمینان محسوس کرتی۔ ایک یا دو دن ایسا ہوا تھا کہ وہ نہ آیا تھا ورنہ وہ روزانہ آجاتا تھا۔

پسرور اسٹیشن پر تانگہ اس کے انتظار میں ہوتا۔ وہ فوراً اس پر سوار ہوتا اور چلا جاتا تھا جب کہ میں اسٹیشن سے باہر آتی اور پیدل چلتے ہوئے اپنے کالج کی جانب چلی جاتی تھی۔

☆......☆

اسی روٹین کو دو ماہ ہونے کو تھے۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ موسم بہار جاری تھا۔ ہماری روٹین حسب معمول جاری تھی آج تک نہ تو میں سمجھ سکی کہ یہ بندہ کہاں جاتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا موقع ملا کہ اس سے بات ہو سکی۔

قدرتی بات تھی کہ جب میں رات کو اپنے بستر پر لیٹتی تو مجھے اس شریف آدمی کی یاد ستانے لگتی اور میں بہت دفعہ حوصلہ جمع کرتی۔ سوچتی کہ صبح اس سے ضرور بات کروں گی اور یہ معمہ ضرور حل کروں گی کہ اس کا روزانہ سفر کہاں کے لیے ہوتا ہے مگر صبح نہ جانے کون سی طاقت مجھے روک دیتی۔


Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !
i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

چونکہ سردی کا موسم تھا اس لیے اس نے بچی کو کمبل میں لپیٹا ہوتا تھا اور اب جب سردی قدرے کم تھی تو بچی کمبل سے باہر تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ دونوں بچے ماشاءاللہ سے بہت پیارے ہیں۔ یقیناً ان کی ماں بھی حسین ہی ہو گی مگر آج تک میں نے کبھی اس کو ان کے ساتھ نہ دیکھا تھا۔ اس لیے میرے دل میں خیال آتا کہ یا تو خدانخواستہ ان کی ماں اس دنیا میں نہیں ہے یا پھر دونوں میاں بیوی میں کچھ اختلاف ہے۔ بہرحال میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔

☆......☆

''شہلا بیٹا اٹھ بیٹا آج کیا کالج نہیں جانا۔ بیٹا آٹھ بج گئے ہیں۔ آج تو آپ نے نماز بھی نہیں پڑھی۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا آپ تو ٹائم کی بہت پابند ہو بیٹا۔''

''اوہ سوری ماما! مجھے واقعی آج ہوش نہیں آیا اور آپ بھی نا...... اب آئی ہیں تو ذرا پہلے اٹھا دیتیں۔''

''بس بیٹا میں نے سوچا شاید تم رات پڑھتی رہی ہو گی۔ اس لیے میں نے نہیں اٹھایا۔ اب اٹھو اور جلدی سے فریش ہو کر باہر آؤ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''جی امی میں ابھی آئی۔ بھائی ابھی گھر میں ہیں یا چلے گئے ہیں کالج۔''

''بیٹا بس وہ نکلنے ہی والے ہیں۔ تم آ جاؤ تو ان سے بھی مل لینا۔''

''جی ماں جی میں ابھی آئی۔''

☆......☆

شہلا حسن، حسن علی اور رابعہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ شہلا حسن سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ وقاص اور وقار۔ وقاص ایف اے کر رہا تھا جب کہ وقار ابھی 9th میں تھا۔

حسن علی محکمہ ڈاک سے ریٹائرڈ تھے اور آج کل بس دوستوں سے گپ شپ میں وقت گزار رہے تھے۔ تینوں بچوں کی طرف سے وہ مطمئن تھے کہ تینوں اپنی مرضی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

شہلا آج کافی دنوں بعد چھٹی کر کے گھر پر ہی تھی اور ماں جی کا ہاتھ بٹا رہی تھی مگر اس کا ذہن بار بار اسی طرف تھا کہ نہ جانے وہ بھی آج آیا ہو گا یا نہیں۔ نہ جانے آج کتنا تنگ کیا ہو گا اسے بچوں نے۔

☆......☆

''مئی کا مہینا چل رہا تھا۔ موسم کافی حد تک گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں تک شہلا کے Exam اسٹارٹ ہونے کو تھے۔ اس لیے وہ کالج کی طرف سے کافی حد تک فری تھی۔ وہ گھر پر ہی تیاری میں مصروف رہی۔ اس لیے کچھ حد تک اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ مگر وہ جب بھی کتابیں رکھتی اسے اپنا ٹرین کا سفر یاد آنے لگ جاتا۔

اور پھر اس کے Exam اسٹارٹ ہو گئے۔ چھوٹا وقار اسے بائیک پر چھوڑنے اسٹیشن آیا۔ ٹرین اپنے وقت پر آئی۔ شہلا حسن اس میں سوار ہو گئی۔ اسے بہت بے چینی سے انتظار تھا کہ قلعہ احمد آباد کا اسٹیشن آئے اور وہ نظر آئے۔

چند منٹ بعد جب اس کا مطلوبہ اسٹاپ آیا اور ٹرین وہاں رکی تو شہلا حسن کی نظریں، چھوٹے سے پلیٹ فارم پر اس کی متلاشی تھیں۔ مگر اسے جوس اور ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور گنڈیریاں بیچنے والے کے علاوہ کوئی نظر آیا۔

شہلا حسن کے ذہن میں آیا کہ شاید وہ کسی اور ڈبے میں سوار ہو گیا ہو گا یا پھر آج اس نے نہ آنا ہو گا۔ یا پھر ہو سکتا ہے اس نے سفر کرنا چھوڑ دیا ہو۔

بہرکیف وہ پسرور اسٹیشن پر اتری اور جب تک ٹرین آگے کی منزل کی جانب نہ بڑھ گئی وہ اسٹیشن پر ہی کھڑی رہی۔

تمام مسافر باہر کی جانب نکل رہے تھے مگر وہ ان مسافروں میں شامل نہ تھا۔

☆......☆

نو بجے پیپر شروع ہوا اور بارہ بجے ختم ہو گیا تو شہلا لائبریری آ گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ واپسی اپنی روٹین کے مطابق دو بجے ہی جائے گی کیونکہ ہو سکتا ہے پہلے ٹائم وہ نہیں نظر آیا تو دوسرے ٹائم ہی واپسی پر مل جائے۔ نہ جانے کون سی کشش تھی کہ وہ انجانی شخصیت کے پیچھے کھنچی چلی جا رہی تھی۔

شہلا کی سب فرینڈز آپس میں پیپر کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں اور کچھ دوست جن کا پیپر سیکنڈ

سیشن میں تھا وہ شہلا سے پوچھ رہی تھیں کہ اس کے خیال میں دوسرے سیشن میں کون سے سوالات آسکتے ہیں۔

ابھی شہلا لائبریری کے دروازے کے پاس ہی پہنچی تھی کہ جیسے اس کی سانس رک سی گئیں۔ اس کے قدم وہیں منجمد ہو گئے۔ شہلا حسن خود کو بھول گئی۔ کیونکہ جو چہرہ اس کے ذہن میں تھا جس کو اس کی نظریں تلاش کر رہی تھیں وہ اس کے سامنے سے گزر کر لائبریری سے Examination Hall کی جانب چلا جا رہا تھا۔

بعد میں اسے پتا چل گیا تھا کہ امتحان لینے والا جو عملہ آیا ہے موصوف اسی کا حصہ ہیں اس سے یہ بات تو طے تھی کہ صاحب کسی کالج کے پروفیسر رہے ہوں گے۔

☆......☆

یہ تو پتا چل گیا تھا کہ وہ کسی کالج میں پڑھاتے ہوں گے مگر بچے کہاں چھوڑ کے آتے ہیں اور روزانہ ان کو ساتھ کیوں لے کر آتے ہیں ابھی بہت سے سوالوں کے جواب باقی تھے۔

آخری پیپر تھا جب قلعہ احمد آباد اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ شہلا حسن کی نظریں حسب معمول پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی تھیں اور آج جب پروفیسر صاحب اپنے بچوں کے ہمراہ ٹرین پر سوار ہونے کے لیے آگے بڑھے تو ہمیشہ کی طرح انہوں نے اپنی بیٹی کو اٹھایا ہوا تھا اور آج بیٹے کی انگلی انہوں نے نہیں بلکہ ان کے ساتھ آتی ایک لڑکی نے پکڑ رکھی تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی گمان ہو رہا تھا کہ یہ ان کی بیوی ہی ہیں مگر اصل حقیقت کا ابھی تک کچھ علم نہ تھا۔ وہ پوری فیملی ٹرین پر سوار ہوئے اور گاڑی اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگی۔ دوسرے ڈبے میں سوار ہونے کے باعث شہلا حسن پروفیسر فیملی کو دیکھ نہ پا رہی تھی۔ جب پسرور اسٹیشن پر گاڑی رکی تو شہلا بھاگ کر نیچے اتری۔ اس کی توجہ اپنی مطلوبہ شخصیت کی جانب مرکوز تھی۔ وہ سب اپنی روٹین کے مطابق اترے اور تانگہ پکڑ کر اپنی منزل کی جانب چل دیئے۔

☆......☆

دنیا میں سب سے تیز رفتار گاڑی وقت ہے۔ جو چلتی چلتی اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ شہلا اب پروفیسر شہلا حسن بن چکی تھی حسن علی اور رابعہ اپنی بیٹی کے لیے بر تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ ان کا ارادہ ساتھ ساتھ ہی وقاص کی دلہن لانے کا بھی تھا تاکہ گھر میں بیٹی کی کمی محسوس نہ ہو مگر شہلا حسن آج تک ماضی کو نہ بھلا سکی تھی۔ پروفیسر کی شکل میں اس کا آئیڈیل اس کی آنکھوں میں چھایا رہتا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اس نقش کو ہٹا نہ پائی تھی۔

اسے اپنے آپ پر رہ رہ کر غصہ آتا کہ آخر تب اس نے کیوں بات نہ کی تھی کیوں نہ پوچھا تھا کہ ان کے ساتھ آخر کیا ٹریجڈی ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ روزانہ ڈیوٹی پر آتے ہیں۔

اور پھر ایک روز جب انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ سفر کیا تھا تو تب کیا معاملہ تھا۔ بیوی...... بیوی نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ قدرت میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ پروفیسر صاحب کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔ میڈم شہلا حسن یہ تم کیا سوچ رہی ہو۔

''آخر لوگ کیا سوچیں گے۔ تم اپنے گھر والوں کو کیا کہو گی کہ ایک پڑھی لکھی سمجھدار ذہین لڑکی کو آخر ہوا کیا ہے۔ جو ایک دو بچوں کے باپ کی یادیں دل میں سمائے نہ جانے کیا سوچ رہی ہے۔ وہ نماز پڑھتی اور خدا کے حضور دعا کرتی کہ یا خدا میرے دل و دماغ یہ بوجھ اتار دے۔ میں کب تک اس حصار میں قید رہوں گی۔ اے خدا میری مشکل آسان کر دے اور مجھے اس امتحان میں سرخرو کر دے۔

☆......☆

شہلا کو سیالکوٹ کے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب ملی ہوئی تھی۔ وہ اسی پرانی روٹین کے مطابق روزانہ پونے آٹھ بجے ڈومالہ اسٹیشن سے بیٹھتی اور سیالکوٹ آجاتی تھی۔

اب وہ اکیلی سفر نہ کرتی تھی بلکہ پروفیسر صاحب کی یادیں ہمہ وقت اس کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ جیسے ہی قلعہ احمد آباد کا اسٹیشن آتا اس کی بے چین نگاہیں پلیٹ فارم پر اپنے آئیڈیل کو تلاش کرتیں۔ پسرور اسٹیشن پر تو وہ کافی دفعہ گاڑی سے اتر کر تانگہ اسٹینڈ کی طرف بھی چکر لگا چکی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکی تھی اور پھر ایک روز جس دوست نے اسے کالج میں جاب دلوائی تھی اس کے کالج میں کوئی

فنکشن تھا تو اس نے شہلا کو بھی انوائیٹ کر رکھا تھا۔
شہلا اپنے کالج جانے کی بجائے سیدھی خادم علی روڈ سیالکوٹ پر واقع اس کامرس کالج میں پہنچی۔
جب وہ ہال میں پہنچی تو پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ سب مہمان آ چکے تھے۔ ٹھیک سوا نو بجے تلاوت کلام پاک شروع ہوئی۔ جیسے جیسے کلام پاک پڑھا جا رہا تھا شہلا حسن کے لب دعائیہ کلمات کے ساتھ ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے پانی ساون کی طرح برس رہا تھا اور پھر شاید قدرت کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ اس کا امتحان ختم ہو گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے اسٹیج پر پروفیسر صاحب بیٹھے تھے۔
شہلا حسن فوراً اپنی کرسی سے اچھل ہی پڑی۔ ایک لمحے کو تو وہ جیسے بھاگ کر اسٹیج پر ہی چڑھ جاتی مگر اسے موقع اور وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔
مگر ابھی صرف ایک گھنٹہ ہی پروگرام ہوا تھا شہلا کی ہمت جواب دے گئی تو وہ فوراً اٹھی اور اسٹاف روم میں آ گئی۔ واش بیسن سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ خود کو فریش کیا۔ اس لمحے اس کی دوست فہمیدہ بھی اس کے پیچھے آ گئی اور پوچھا۔
”شہلا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے کیا ہوا بھئی ابھی تو پروگرام شروع ہوا ہے۔ ابھی تو انٹرٹینمنٹ کا بہت سامان باقی ہے۔ پھر بھی اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تو میں چائے بھجوا دیتی ہوں تم تھوڑا ریلیکس ہو کر آ جانا۔“
”نہیں فہمیدہ نہیں پلیز میری بات سنو...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
شہلا اب کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے سب ہمت جمع کر کے اپنی مطلوبہ شخصیت کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔
”فہمیدہ پچھلے دس سال سے اسی کالج میں وائس پرنسپل کی سیٹ پر کام کر رہی تھی۔ اس کے اپنے حلقہ احباب کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ پروفیسر علی کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے جو کہانی شہلا کو سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔

☆......☆

علی اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھا۔ باقی بہن بھائی چھوٹے تھے۔ راحیلہ گھر والوں کی پسند تھی۔ علی نے گھر والوں کو اختیار دے رکھا تھا۔ راحیلہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی معقول صورت لڑکی تھی۔ پسرور شہر میں میکہ تھا۔ دونوں میاں بیوی کے مابین اچھی انڈراسٹینڈنگ رہی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے حد خوش تھے۔ ایک چیز جس کا دونوں کو ہمیشہ دکھ رہتا کہ وہ خود سے کہیں آ جا نہ سکتے۔ گھر میں انتہائی سخت رویہ رہتا۔ راحیلہ کے ہمراہ اس کے برعکس علی اس کا ہمیشہ خیال رکھتا اور ہر طرح کی سہولت دیتا۔
اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ خدا نے دونوں کو اپنی نعمت سے نوازا۔ بیٹا اپنی ماں کی فوٹو کاپی تھا۔ علی بہت خوش تھا۔ اس کے والدین بھی کچھ حد تک خوش ہوئے مگر نہ جانے ان کا روکھا پن کیوں ختم نہ ہو پا رہا تھا۔
وقت گزرتا رہا۔ پروفیسر علی صبح ڈیوٹی پر چلے جاتے۔ شام کو آتے سارا دن ساس بہو کی تو تو کار چلتی رہتی۔ راحیلہ بہت کچھ برداشت کرتی مگر کبھی اس نے اپنی ساس کو برا نہ کہا۔ یہاں تک کہ وہ علی کو بھی کچھ نہ بتاتی جب کبھی بات حد سے بڑھ جاتی اور راحیلہ کی طبیعت خراب ہوتی تو علی سمجھ جاتا کہ گڑبڑ ہوئی ہے۔

☆......☆

موسم بدلے سال بدلے حالات بدلے مگر راحیلہ کی ساس کا رویہ نہ بدلا۔ راحیلہ کے میکے والے بہت اچھے لوگ تھے۔ کبھی کبھار سال بعد ہی کوئی ایک فرد آتا۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ اور واپس چلے جاتے۔ ان لوگوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ بات اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ان کی بیٹی پر ذہنی ظلم ستم کی بھرمار ہو چکی ہے۔
کبھی کبھار جب سے علی اور راحیلہ پسرور جاتے تو وہ دن راحیلہ کے لیے بہت فریش ہوتا مگر اپنے گھر آ کر وہ دوبارہ ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتی۔
پھر خدا نے ان کو اپنی رحمت سے نوازکر ان کی فیملی کو مکمل کر دیا۔
بیٹی کی پیدائش پر علی نے بہت زیادہ خوشی

سنائی۔ اپنے تمام کولیگز کو مٹھائی بھجوائی مگر شاید خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی ننھی پری صرف دو ماہ کی تھی کہ راحیلہ نے واش روم میں گھس کر تیزاب پی لیا۔ تیزاب کی زیادہ مقدار اندر جانے کی وجہ سے اور پھر دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کافی ٹائم گزر گیا تو راحیلہ جان کی بازی ہار گئی۔

پروفیسر علی کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی چونکہ وہ ساری صورتِ حال سے آگاہ تھا اس لیے خاموش تھا۔

اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر روزانہ ڈیوٹی پر آتا کیونکہ اس کی ماں اور بہنیں اس کے بچوں کو سنبھالنے کو تیار نہ تھیں۔ علی قلعہ احمد آباد سے پسرور آتا بچوں کو اپنے سسرال چھوڑتا اور پھر ڈیوٹی پر چلا جاتا۔

جیسے جیسے فہمیدہ میڈم کہانی سنا رہی تھیں۔ شہلا حسن ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر اپنی مووی دیکھ رہی تھی جہاں وہ علی کو اپنے بچوں کے ہمراہ آتا دیکھتی۔

☆......☆

ننھی پری دس ماہ کی ہوئی تو وہ اپنی خالہ تنزیلہ کے ساتھ بہت اٹیچ تھی علی کے ساس سسر بہت شریف لوگ تھے۔ انہیں علی کی تنہائی اور بچوں کی جدائی کا احساس تھا۔ انہیں پتا تھا کہ علی کی زندگی میں جو بھی لڑکی آئے گی۔ وہ علی کے بچوں کی ماں نہ بن سکے گی۔ اس لیے ایک روز انہوں نے علی سے بات کرنے کا سوچا۔

اور پھر انہوں نے علی سے کہا کہ ''وہ تنزیلہ سے نکاح کر لے۔''

''اس طرح بچوں کو ماں بھی مل جائے گی اور تمہاری راحیلہ کی کمی بھی پوری ہو جائے گی۔'' علی کو ایک شاک سا لگا۔ اس کا ذہن اس بات کے لیے رضامند نہ تھا پھر بھی اس نے کچھ ٹائم سوچنے کو لیا۔

یہ تو اسے پتا تھا کہ اس کے ماں باپ اس بات کے لیے کبھی نہیں مانیں گے مگر اس نے اب وقت سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ اب اسے زندہ رہنا ہے۔ ادھر جب تنزیلہ کو اپنے والدین کی طرف سے حکم ملا تو اس نے بہت احتجاج کیا مگر آخر اسے ہاں کرنا پڑی۔

☆......☆

پھر تنزیلہ کے ساتھ علی کا نکاح ہو گیا مگر علی کی قسمت میں شاید سکون نہ تھا۔ تنزیلہ جو دونوں بچوں کو انتہا کا پیار کرتی تھی۔ شادی کے بعد اس کا رویہ سوتیلی ماں سے بھی زیادہ برا نکلا۔

علی کو کچھ سکون نہ تھا۔ خاموش طبع علی پہلے سے زیادہ چپ رہنے لگ گیا اور پھر صرف تین ماہ بعد ہی تنزیلہ نے خلع کا دعویٰ دائر کر دیا۔

تنزیلہ کو ماں باپ نے بہت سمجھایا مگر شاید وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ پانچ ماہ سمجھانے کے باوجود جب وہ نہ سمجھی تو مجبوراً طلاق ہو گئی۔

علی ایک بار پھر تنہا ہو گیا۔

آج اس کے دونوں بچے اسکول پڑھ رہے ہیں۔ پسرور سٹی میں اس نے ایک چھوٹا سا گھر لے رکھا ہے۔ ایک اماں جی ہیں جو گھر کا کام کرتی ہیں۔

☆......☆

شہلا حسن نے جیسے ہی پوری کہانی سنی وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اور پھر وہ وہاں سے سیدھی اپنے گھر آ گئی۔ ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر وہ اپنے کمرے میں قید ہو گئی اور پھر ایک روز جب حسن اور رابعہ اس سے ایک رشتہ کے متعلق بات کرنے کے لیے آئے تو اس نے اپنا فیصلہ ان کو سنا دیا۔

حسن علی اپنے سمجھدار انسان تھے دونوں نے بیٹی کے جذبات کو سمجھتے ہوئے فیصلہ پروفیسر علی سے ملنے تک موقوف کر دیا۔

میڈم فہمیدہ کے تھرو علی اور حسن سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر علی ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار تو نہ تھے مگر شہلا نے فہمیدہ میڈم کو اس طرح سمجھایا تھا کہ فہمیدہ علی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

اور پھر حسن اور علی کی ملاقات مثبت ثابت ہوئی۔

آج شہلا علی انتہائی خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دونوں بچوں کے بعد ایک مزید بیٹا اور بیٹی خدا نے عطا کی مگر شہلا اپنے بچوں سے زیادہ بڑے بچوں کا خیال رکھتی۔ پروفیسر علی بہت خوش رہنے لگے تھے۔ اور سب انہوں نے اپنا کالج کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کی پرنسپل شہلا علی ہوں گی۔

☆☆☆

آٹھویں بہترین بیتی

# ہم کہ ٹھہرے اجنبی



فیصل ندیم بھٹی

اُس نوجوان کا قصہ غم، جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کو جہنم کر دیا تھا

آج میں سرگودھا سے کراچی جانے کے لیے گاڑی کے انتظار میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھا ہوں کہ اچانک میں نے سامنے سے خالد اور عروج کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ان کو دیکھتے ہی دل بوجھل ہو گیا مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرے حواس میرا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔

میرا نام ندیم ہے۔ سرگودھا کے نواحی گاؤں میں پیدا ہوا۔ میرے والد صاحب ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے ساتھ کپڑے کا کاروبار بھی تھا۔ میرے والد کا نام امام دین تھا جو کہ گاؤں کی معزز شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی شرافت اپنی مثال آپ تھی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ بچپن سے ہی میری ہر خواہش کو فوراً پورا کیا جاتا تھا۔ گھر میں میرے امی ابو اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ جب میں پانچ سال کی عمر میں تھا تو مجھے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گاؤں میں ہی قاری صاحب کے پاس مدرسہ میں داخل کرایا گیا اور ساتھ ہی اسکول میں بھی داخل کرایا گیا۔ جب میں پانچویں جماعت میں تھا تو میں نے قرآن پاک کی تعلیم مکمل کر لی پھر تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

گاؤں کے مڈل اسکول میں آٹھویں تک تعلیم حاصل کی پھر شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ میرے چچا گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک دن جب اسکول سے واپسی میں گھر آیا تو گھر میں چچا اور چچی گھر میں آئے بیٹھے تھے۔ میں ان سے ملا انہوں نے اپنے بیٹے سے میری بہن کا رشتہ مانگا جو کہ والد صاحب اور والدہ نے بخوشی قبول کر لیا۔ پھر جب میں ایف ایس سی کر رہا تھا تو میری بہن شانزے کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بہت سارا جہیز بنایا گیا اور آخر کار شادی کی تاریخ طے ہو گئی تمام رشتہ داروں کو شادی میں شریک ہونے کے لیے دعوت نامے ارسال کیے گئے۔

میری خالہ فرحت جو کہ ملتان میں رہتی تھیں ان کو بھی دعوت نامہ پہنچا دیا۔ امی نے خالہ کو کہا کہ آپ نے شادی سے تین دن پہلے آنا ہے۔ پھر آخر کار وہ دن آ گیا جس دن خالہ کو آنا تھا۔

وہ جمعرات کا دن تھا۔ خالہ نے امی کو ٹیلی فون کر کے بتایا کہ ہم آج ریل گاڑی میں بیٹھیں گے۔ ہمارے ٹکٹ کنفرم ہو چکے ہیں اور شام 6 بجے سرگودھا ریلوے اسٹیشن پر پہنچیں گے۔

امی نے ابو کو کہا کہ ندیم کی خالہ فرحت شام کو سرگودھا پہنچ رہے ہیں۔ ابو نے ڈرائیور کو کہا کہ تیار رہنا شام کو



مہمانوں کو لینے جانا ہے۔ ہم 5 بجے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر امی کے ساتھ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ شام 6 بجے ریل گاڑی آ کر رکی۔ تمام مسافر اتر رہے تھے۔

خالہ پانچ سالوں کے بعد ہمارے گھر آ رہی تھیں۔ امی نے خالہ کو دیکھا اور مجھے کہا کہ وہ دیکھو سامنے تمہاری خالہ آ گئی ہیں۔ میں اٹھ کر دیکھنے لگا خالہ کے ساتھ ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ عروج اب جوان ہو چکی تھی۔ دوپٹے سے باہر کو اڑتی ہوئی سیاہ زلفیں، کھلتے نقوش گلابی کپڑوں میں ملبوس جیسے کسی فلم کی کوئی ہیروئن ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر خالہ کو سلام کیا اور خالہ کے گلے ملا۔ عروج نے مجھے سلام کیا۔ میں نے خالہ سے ان کا بیگ لے لیا۔

آج پہلی بار میں نے عروج کو عالم شباب میں دیکھا تھا۔ اب تو عروج حسن کی ملکہ تھی۔ ہم سب گھر آ گئے۔

گھر میں خالہ اور عروج کا شاندار استقبال کیا گیا۔ سب خالہ اور عروج سے مل رہے تھے۔ اگلی رات مہندی تھی۔ گھر کو برقی قمقموں سے سجایا گیا۔ گویا گھر میں ہر طرف رونق ہی رونق تھی۔ میں نے عروج سے بات چیت کی تو اس نے بتایا کہ وہ فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی ہے۔ میں چپکے چپکے عروج کو دیکھتا رہا۔

مہندی والی رات عروج نے پیلے رنگ کا سوٹ زیب تن کیا۔ جس میں وہ پری لگ رہی تھی۔ میری نظریں تو صرف عروج کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ آخر کار وہ ہال میں آئی اور شازیہ کو مہندی لگائی گئی۔

رخصتی کا دن آ گیا۔ دھوم دھام کے ساتھ شازیہ کی رخصتی ہو گئی۔ شادی کے دوسرے دن ہم شازیہ کے گھر اس کو لینے کے لیے گئے۔

دو دن گزرنے کے بعد ہم خالہ کو ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آئے۔ میں نے ٹکٹیں خریدیں اور خالہ اور عروج کو ریل گاڑی میں بٹھا دیا۔ گاڑی دھیرے دھیرے اپنے سفر کی طرف روانہ ہو گئی۔ کھڑکی سے عروج نے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کیا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ جب تک ریل گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی

دیکھتا ہی گیا۔ میری کیفیت میں بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔

☆......☆

خالد میرے بچپن کا بہت گہرا دوست تھا۔ ہم ایک ہی محلے میں پلے بڑھے اور کھیلے تھے۔ روزانہ ایک ساتھ اسکول جانا اور اسکول میں بھی ہم جماعت تھے۔ جب اسکول سے چھٹی ہوتی تو ہم اکٹھے کرکٹ کھیلتے۔ میٹرک تک ہم نے بہت ہی انجوائے کیا۔ پھر ایف ایس سی میں بھی بہت انجوائے کیا۔

میں شازیہ کی شادی کے بعد پریشان رہنے لگا تھا۔ ایک دن خالد نے پوچھا۔ ''ندیم کیا بات ہے تم آج کل بہت اداس ہو۔''

خالد میرا جگری دوست تھا میں نے اسے بتایا کہ ''خالہ کی بیٹی عروج جو شادی پر آئی تھی۔ تو نے دیکھی تھی ناں؟'' خالد نے کہا۔

''ہاں دیکھی تھی۔''

''میں تو بس دن رات اسی کے خیالوں میں ہی کھویا رہتا ہوں۔ بہت اچھی لگی ہے میں تو بہت پیار کرنے لگا ہوں اس سے اور میں تو سوچ لیا ہے کہ میں شادی بھی عروج کے ساتھ ہی کروں گا۔''

خیر وقت پر لگا کر گزر گیا تھا۔ دو سال ہوگئے نہ ہی خالہ ہمارے گھر آئیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی خالہ کے گھر جا سکا۔

دو سال کے بعد میں ایف ایس سی کرنے کے بعد فارغ تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ میں نے خالہ کے گھر جانا ہے تو امی نے ابو سے اجازت لے کر مجھے ملتان جانے کی اجازت دے دی۔

میں ملتان پہنچ گیا۔ خالہ کے گھر پہنچا تو میرا بھرپور استقبال کیا گیا۔ دو سال کے بعد آج عروج کو دیکھا تھا۔ اب تو عروج کے حسن میں اور بھی نکھار آ گیا تھا۔ خوب صورت گوری چٹی، لمبی زلفیں۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ عروج سے اپنی محبت کا اظہار کروں بس کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کروں۔

آخر کار ایک دن میں نے کاغذ کا سہارا لے کر عروج کو خط لکھ ڈالا۔

''عروج کاغذ کے سہارے آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں کہ جب سے میں نے شازیہ کی شادی پر آپ کو دیکھا ہے مجھے تو بس آپ سے محبت ہوگئی۔ میرے خیالوں اور خوابوں میں صرف آپ ہی نظر آتی ہو۔ آپ بہت خوب صورت ہیں میری زندگی بھی بس آپ۔''

اگلے دن میں موقع پا کر کاغذ عروج کو پکڑا دیا اور اسی دن دوپہر کو کھانا کھا کر وہاں سے میں گھر آ گیا۔ جب میں واپس اپنے گھر آیا تو میری طبیعت میں اداسی ہی اداسی تھی کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کچھ دن گزرنے کے بعد ایک دن عروج نے اپنی امی کے موبائل سے میرے نمبر پر فون کیا۔ اچانک عروج کی آواز سن کر دل خوشی سے جھومنے لگا۔ عروج نے گھر والوں کے حال پوچھے۔ اس نے کہا۔ ''ندیم مجھے بھی تم بہت اچھے لگتے ہو۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔'' پھر تو اکثر موبائل پر باتیں ہونے لگیں۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں کیے۔

وقت گزرتا گیا میں ایم ایس سی کرنے کے بعد اپنے ہی شہر میں بطور لیکچرار بھرتی ہوگیا۔ سب ہی بہت خوش تھے۔ پھر میرے گھر والوں کو میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی۔ میری امی کو میری پسند کا پتا تھا۔ امی نے مجھے کہا کہ ''ندیم اب ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' اور پوچھا کہ ''اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ۔''

میں خاموش رہا پھر امی نے بتایا کہ ''ہم اگلے مہینے ملتان جا رہے ہیں۔ تمہارے لیے عروج کا رشتہ مانگنے کے لیے۔'' میں تو یہ سب سن کر بہت خوش ہوگیا۔

دو دن بعد امی اور ابو واپس گھر آ گئے۔ میں امی کے پاس آ کر بیٹھا تو ان کے پاؤں دبانے لگ گیا۔ امی نے بتایا کہ ''عروج کے ساتھ تمہارے رشتے کی بات پکی ہوگئی ہے۔''

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی جو کہ عروج کے ساتھ شادی تھی اس محبت کے بارے میں، میں خالد کو بہت کچھ بتایا ہوا تھا۔ کیونکہ خالد کے اور ہمارے گھر کے درمیان بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہم ایک دوسرے کے گھر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ خالد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد بس زندگی کے ایام بسر کر رہا تھا۔ خالد کا والد نیک انسان تھا اور اس کی والدہ بھی نیک خاتون تھیں۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ انتظار کرتے کرتے آخر کار امی ابو کے مشورے سے میری شادی کی تاریخ ہوگئی۔ شادی میں شرکت کے لیے تمام رشتے داروں اور دوست

احباب کو کارڈ تقسیم کر دیے گئے۔ خالد میری شادی کے انتظامات میں پیش پیش تھا۔ خالد نے مہندی کی رات کو انتظامات بہت زبردست کیے۔ پھر بارات کا دن آ گیا تھا رشتہ داروں اور دوستوں نے شرکت کر کے خوشی کو دوبالا کر دیا۔ پھر آخر کار وہ رات آ گئی جس کا بہت برسوں سے میں نے انتظار کیا تھا۔

جب میں حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو عروج سرخ جوڑے میں ملبوس زیورات سے لدی ہوئی بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے جا کر عروج کو سلام کیا اور گھونگھٹ کو اوپر کر کے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی عروج کے ہاتھ کی انگلی میں پہنائی۔ حور سے کم نہیں تھی عروج۔

اگلے دن ولیمے کی تقریب میں کافی رشتہ داروں نے شرکت کی۔ شام کو کافی مہمان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ رات کو خالد میرے گھر آیا میں خالد کو لے کر عروج کے پاس گیا اور خالد کا عروج سے تعارف کروایا کہ یہ خالد ہے میرے بچپن کا دوست۔ خالد نے عروج کو منہ دکھائی میں پہلی بار ہزار روپے کا نوٹ دیا جو کہ عروج نے شرماتے ہوئے پکڑ لیا۔

شادی کے ایک ہفتے بعد میں عروج کو لے کر مری کے لیے روانہ ہو گیا۔ ہم نے خوب انجوائے کیا۔

خالد جب بھی ہمارے گھر آتا عروج کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیتی۔ اکثر ہم مل کر چائے پیتے تھے۔ دن بدن عروج کے ساتھ میری محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ عروج جو بھی مجھ سے فرمائش کرتی میں اسے فوراً پورا کرتا تھا۔

☆......☆

شادی کو ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک دن کالج کے ایک دوست کی شادی میں گیا۔ وہاں پر دوستوں کے ساتھ انجوائے کیا۔ وہاں پر دوستوں نے شراب پینا شروع کر دی مجھے بھی کہا گیا لیکن میں نے بہت منع کیا۔ آخر کار میں نے شراب پی لی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شراب پی تھی۔ بس مجھے بھی شراب پینے سے شیطان نے بہکا دیا۔ شراب پی کر میرے ہوش و حواس اڑ گئے میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ رات گئے مجھے دوست گھر کے دروازے تک چھوڑ گئے۔ میں بڑی مشکل سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کمرے میں پہنچا۔ جہاں پر عروج میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ بہت ہی غصے میں بولی کہ اتنی دیر لگا دی میں نے کتنی بار آپ کو فون کیا۔ آپ نے اٹھایا ہی نہیں میں مزید جذباتی ہو گیا۔ شراب کا نشہ مجھ پر غالب تھا۔ مجھے عروج نے کہا کہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم شراب پی کے آئے ہو۔ وہ زور زور سے بولنے

گئی۔ میں نے تھپڑ عروج کے گال پر دے مارا اور کہا۔ ''ذلیل! جاؤ یہاں سے۔'' عروج نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں تم کو طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔''

میری اونچی آواز سن کر امی ابو بھی جاگ گئے۔ عروج دوڑ کر امی کے ساتھ جا کر لپٹ گئی اور رونے لگ گئی۔ میں نشے میں دھت تھا۔ اگلے دن جب مجھے ہوش آیا امی ابو نے بہت ڈانٹا میں نے عروج کا پوچھا تو پتا چلا کہ عروج اپنی امی کے گھر چلی گئی ہے۔ میں اپنے کیے پر بہت نادم تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا سب کچھ اجڑ چکا ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی کاش میں شراب نہ پیتا اور آج یہ نوبت نہ آتی۔ میں ہر وقت پریشان رہتا۔ جب خالد کو اس بات کا پتا چلا تو بہت افسردہ ہوا اور سمجھایا اور حوصلہ دیا۔ کچھ دن بعد خود کو زندگی میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

ایک دن کالج سے چھٹی تھی۔ میں امی کے پاس جا کر بیٹھا۔ میں نے امی سے معافی مانگی۔

امی نے کہا۔ ''اب میں کیا کر سکتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا۔''

آخر کار امی نے کہا۔ ''آپ خالہ کے گھر جاؤ کہ ندیم سے کیے پر شرمندہ ہے اور دوبارہ عروج سے نکاح کرنے کے لیے رضامند ہے۔ ماں تو ماں ہوتی ہے اولاد کی خوشی کی خاطر کچھ بھی کر جاتی ہے۔ امی کچھ دن بعد ملتان خالہ کے گھر گئی اور کہا کہ ''ندیم نے جذبات میں آ کر یہ غلط فیصلہ کیا ہے لیکن اب بھی عروج سے محبت کرتا ہے اب سارا دارومدار عروج پر تھا۔''

آخر کار عروج بھی مان گئی کیونکہ عروج کو بھی ندیم سے محبت تھی۔ محبت کے جوش میں آ کر عروج نے حامی بھر لی۔ مولوی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ عروج کا نکاح کسی اور کے ساتھ ہوگا پھر وہ اسے طلاق دے گا پھر دوبارہ ندیم اور عروج کا نکاح ہو سکتا ہے۔

آخر کار یہ معاملہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا کہ کس کے ساتھ عروج کا نکاح کیا جائے۔ عروج کے ایک کزن کا نام آیا لیکن عروج نہ مانی۔ سوچ و بچار کے بعد امی نے خالد کا نام لیا کہ تیرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم راز ہے۔ پہلے بھی کئی مشکل وقت میں خالد نے تیرا ساتھ دیا تھا۔ کئی بار تیرے کام آ چکا تھا۔

میں نے خالد سے بات کی کہ ''خالد تم کو ایک قربانی دینا ہوگی میرے لیے۔''

خالد گھبرا گیا۔ میں نے خالد کو بتایا کہ ''دوبارہ عروج سے نکاح کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے پہلے حلالہ ضروری ہے۔ کسی اور سے نکاح، ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عروج کا نکاح خالد کے ساتھ کیا جائے۔ پھر کچھ دن بعد تم طلاق دینا پھر میں عروج کے ساتھ نکاح کر لوں گا۔''

خالد مان گیا۔ آخر کار وہ منحوس دن آ گیا جس دن خالد اور عروج کا نکاح ہوا دو دن گزرنے کے بعد میں خالد کے گھر گیا اور کہا کہ یہ اب طلاق دے عروج کو۔ طلاق کے کاغذات تیار کروائیں لیکن پتا چلا کہ خالد عروج کو لے کر کراچی چلا گیا ہے۔

میں نے خالد کو فون کیا تو اس کا نمبر بند جا رہا تھا اور عروج کا موبائل بھی بند تھا۔ میری زندگی میں یہ ایک اور دھچکا تھا کہ اتنے گہرے دوست پر اعتبار کیا لیکن قسمت کا لکھا تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ دو ماہ بعد مجھے خالد نے فون کیا اور کہا کہ ''میں کراچی میں ہوں اور عروج کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہا ہوں میں نے جب پہلی بار عروج کو دیکھا تھا تو مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ بس خدا کو ایسے ہی منظور تھا کہ عروج مجھے مل گئی۔ میں اپنے کیے پر بہت نادم ہوں۔''

ایک سال کے بعد امی اس فانی دنیا کو چھوڑ کر چلی گئیں پھر چھ ماہ بعد ابو کو بھی ہارٹ اٹیک ہوا ایک بہن جو رہ گئی تھی اس کی اپنے کزن کے ساتھ شادی کر دی تھی۔ اب گھر میں تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا ایک نوکر تھا جو مجھے کھانا تیار کر دیتا تھا اور زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ بس دوست نے کیا دغا دیا میرے اندر جینے کی ہمت کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس واقعے کے سات سال بعد مجھے محکمے کی طرف سے کراچی یونیورسٹی میں ایک انویسٹی گیشن کے لیے بھیجا گیا میں کراچی جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھا تھا کہ اچانک میرے سامنے خالد اور عروج دو بچوں کے ساتھ آتے دکھائی دیے۔ آج وہی پلیٹ فارم ہے وہی عروج ہے لیکن میرے ساتھ نہیں ہے اور میں اپنی عروج پر کوئی حق نہیں رکھتا۔

☆☆☆

ناول

کاوش صدیقی

# خانقاہ

قسط نمبر: 06

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستان، عجب تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

دروازے پر دستک ہوئی۔ ''مومی دیکھو دروازے پر کون ہے؟'' اماں نے کہا۔ ''لائٹ نہ ہو تو بندہ دروازے ہی پیٹتا رہ جائے۔!''





''جی دیکھتی ہوں۔!'' ''مومی دوپٹہ سر پر درست کرتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ ''کون ہے۔؟'' اس نے دروازے پر جاکے پوچھا اور آئی سا کٹ سے باہر دیکھا۔

''جی میں قدیر۔۔!'' باہر سے آواز آئی۔

مومی نے دروازہ کھول دیا۔'' آیئے اندر آجایئے۔ اسلام علیکم۔۔!'' مومی نے دروازہ کھولا اور لپک کر ایک طرف ہو گئی۔ قدیر ہاتھوں میں دو تین پیکٹ پکڑے اندر آ گیا۔

''اماں۔۔۔!'' مومی نے بلند آواز سے کہا۔''قدیر آئے ہیں۔''

''اچھا۔۔!'' اماں نے جواب دیا۔ اور قدیر پر نظر پڑتے ہی بولیں۔'' آؤ بیٹا۔ یہاں بیٹھو۔۔!'' انہوں نے تخت کے سامنے پڑی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔

''السلام علیکم!۔''

''جیتے رہو اللہ پاک حفاظت رکھے۔'' انہوں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''تمہاری امی کیسی ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تم کیسے ہو، پریس کیسا چل رہا ہے۔؟''

''امی کو بخار تھا کئی دن سے۔ اس لئے گھر سے باہر نکلنا ہی نہیں ہوا۔ پریس ٹھیک چل رہا ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔'' قدیر نے تمام صورت حال اماں کے گوش گذار کر دی۔

''مومی چائے لیکر آؤ۔۔'' اماں نے بلند آواز سے کہا۔

''جی لا رہی ہوں اماں۔'' مومی چائے لیکر آئی تو اس کے پیچھے نرگس بھی تھی۔ نرگس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ جس میں پکوڑے، پاپڑ اور چٹنی تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور پلٹنے لگی۔

''بیٹھو۔۔!'' اماں نے کہا۔ اور قدیر کی طرف اشارہ کرکے بولیں۔'' یہ قدیر ہے۔ تنزیل کے بچپن کا دوست، یہ سب ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے سب ہی میرے بچوں جیسے ہیں۔ اور یہ نرگس ہے گاؤں سے آئی ہے۔ ہوسٹل میں، میں نے رہنے نہیں دیا۔ اب ہمارے پاس ہی رہ کر ماسٹرز کرے گی۔''

قدیر نے سر کے اشارے سے سلام کیا، نرگس نے بھی جواب دیا۔ پھر سب چائے پینے لگے۔

''پکوڑے تو بہت مزے کے بنے ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔

''نرگس نے بنائے ہیں۔ ماش کی دال کے، بہت مزے دار ہیں۔ کیوں نا اماں؟'' مومی نے بتایا۔

''ہاں۔۔!'' اماں نے پیار سے نرگس کو دیکھا۔''لڑکی کا سلیقہ، اس کی نرمی، اس کے ہاتھوں میں تناسب ہی ذائقہ پیدا کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو مشرق میں لڑکی کا تعارف یہی ہے۔!''

نرگس کی شہابی رنگت، اماں کی تعریف پر سرخ ہوگئی۔''اماں میں تو بس یونہی بے تکا سا بنا لیتی ہوں۔!'' اس نے کہا۔

''یہ میں دو کتابیں لایا تھا تنزیل کے لئے، کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی سوچا مل آؤں۔!'' قدیر نے پوچھا۔''کدھر ہے وہ۔؟''

''تنزیل ذرا کسی کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔'' اماں نے بتایا۔

''اچھا۔۔!'' قدیر نے کہا۔'' مجھے نہ بتایا، نہ ملا۔۔!''

''فون اس کے پاس ہے۔ فون پر خیریت پوچھ لینا۔'' اماں نے اسے سمجھایا۔

''جی بہتر ہے۔!'' قدیر نے کہا۔'' مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے دوبارہ پریس جانا ہے۔!''

''میں تمہاری امی کو دیکھنے آؤں گی دو ایک دن میں۔'' اماں نے کہا۔'' میری طرف سے سلام بھی کہہ دینا اور طبیعت بھی پوچھ لینا۔۔!''

''جی بہت اچھا۔!'' قدیر نے بڑی سعادت مندی سے حامی بھری اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

''میں برتن سمیٹ لوں۔'' موی نے کہا اور چائے کے خالی کپ ٹرے میں رکھنے لگی۔ نرگس بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں برتن اٹھا کر کچن میں آ گئیں۔ موی برتن دھونے لگی۔ نرگس کچن ٹیبل کے ساتھ پڑی چیئر پر بیٹھ گئی۔ اور اس کو غور سے دیکھنے لگی۔

''خیریت تو ہے۔ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہیں۔؟'' موی نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''پتا ہے میں کیا سوچ رہی ہوں۔ بس ایک خیال سا آیا ہے۔ کہیں آپ برا نہ مان جائیں۔'' نرگس نے بغور موی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں برا کیوں مانوں گی بھلا آپ کی بات کا؟'' موی مسکرائی۔ ''آپ بلا کھٹک کہیے۔!''

''ابھی جو قدیر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے نا تو آپ سے بات کی، اور نہ ہی ایک بار بھی آپ کی طرف دیکھا۔ حالانکہ انہوں نے مجھے سلام بھی کیا۔ پکوڑوں کی تعریف بھی کی لیکن آپ کی طرف دیکھا بھی نہیں کیوں۔؟'' نرگس نے اپنا مشاہدہ بیان کیا۔

''اب۔۔ اب میں۔۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔؟'' موی اس کے گہرے مشاہدے سے گھبرا گئی۔

''ایسا تو آدمی جب ہی کرتا ہے جب وہ کسی وجہ سے ناراض ہو یا پھر کوئی خوف ہو۔؟'' نرگس نے کہا۔

''خوف۔۔ کیسا خوف۔۔۔؟'' موی نے بے اختیار کہا۔

''راز کھل جانے کا۔!'' نرگس نے کہا۔

''کون سا راز۔۔؟'' موی کا لہجہ سرسرانے لگا۔ وہ یوں اسٹول پر بیٹھ گئی جیسے بے پناہ تھک گئی ہو۔

''پیار کا راز۔۔!'' نرگس نے جیسے اس کی سماعت میں دھماکا کر دیا۔ اور موی یوں ڈھے گئی جیسے بتاشہ پانی میں بیٹھ جاتا ہے۔

''یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ اُن سے کچھ نہیں کہا۔!'' موی نے آہستگی سے کہا۔

''وہ تو راز اپنے اندر چھپائے بیٹھے ہیں۔ جب ہی دُور، دُور ہیں۔ شائد اماں کے رعب نے، آپ کے بھائی کی دوستی کا ناطہ انہیں آگے بڑھنے سے، کہنے سے روکتا ہو۔!''

''معلوم نہیں۔!'' موی نے انگلیاں چٹخائیں۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتی، کوئی آپ کو اچھا لگے۔ یا آپ کسی کو اچھے لگیں۔ دونوں معاملات میں اپنا بس کہاں چلتا ہے۔ کوئی کوئی بات تو بغیر کہے ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی تعلق بِنا اپنی مرضی کے دُوسرں سے خود بخود جڑ جاتا ہے۔ پھر کیا کریں۔؟'' موی دھیرے سے بولی۔ ''اس میں میری کیا خطا ہے؟ مگر آپ بہت تیز ہیں۔''

''ہم تو دیہاتی لوگ ہیں۔ بیج ڈال کر چھ، چھ مہینے بڑی خاموشی سے انتظار کرتے ہیں۔ فصل پھوٹنے کا۔ آسمان پر بادل دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ برسنے والے ہیں یا ترسانے والے۔ بس شہر والے ہماری سادگی پر ہمیں پینڈو بھی کہتے ہیں اور جنگلی بھی۔ مگر ہمارے انتظار اور مشاہدے کی برابری نہیں کر سکتے۔'' نرگس نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ موی کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''کیوں گھبرا رہی ہیں آپ۔۔؟'' نرگس نے اٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پتا نہیں موی کو کیا ہوا۔ وہ ایک دم اس سے لپٹ کر سسک پڑی۔ نرگس بڑے پیار سے اس کو خود سے چپکائے رہی۔

وہ اکیلی تھی۔ یہ بھی اکیلی تھی۔ جب دو تنہا مل جائیں تو پھر ذات میں میلے آباد ہو جاتے ہیں۔ بندہ ہم راز ہو جائے تو بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ محبت کے راز کے کھل جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ محبت کو سند مل جاتی ہے۔ اپنی ذات کا جواز مل جاتا ہے۔ جذبے تصدیق سے، پذیرائی سے جوان ہوتے ہیں۔ اور بدن کی عمارت پر اپنا پھریرا لہرا دیتے ہیں۔

☆☆☆

''گریز قُرب کی خواہش کا اظہار ہے۔تنہائی کو ختم کر کے دوئی کی آرزو ہے۔جب ہم شعوری کوشش کرتے ہیں کسی حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی، کسی جذبے، کسی تعلق کی گہرائی سے خوف کھا کے بھاگتے ہیں۔تو پھر وہ پوری شدتوں سے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔موجودہ دور ذہنی تناؤ کا ہے۔ایک اُلجھی ہوئی کیفیت جس کو لوگ ڈپریشن کا نام دیتے ہیں۔ پھر اسی ڈپریشن کے زیر اثر بھوک مر جاتی ہے۔السر ہو جاتا ہے۔نیند اڑ جاتی ہے۔تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ذہن کی گرفت ٹوٹنے لگتی ہے۔کوئی خود سے باتیں کرنے لگتا ہے۔کوئی کسی فرضی مخلوق کے زیر اثر چلا جاتا ہے۔فضاؤں میں گھورنے لگتا ہے۔میرے عزیزو۔۔!'' قادری سرکار گفتگو کرتے ہوئے ذرا رُکے اور لوگوں کی طرف دیکھا۔

لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ان کی گفتگو اتنی سادہ، دل نشین اور فرد کی دنیا سے اتنی جڑی ہوئی ہوتی تھی کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ قادری سرکار صرف اسی کے مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں۔اسی کو حل بتا رہے ہیں۔سب کی نگاہیں، سب کی سماعتیں، سب کے حواس ان ہی سے منسلک تھے۔

''میرے عزیزو!'' انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔''حالانکہ اس سارے معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مسائل سے، پریشانی سے، ذمہ داری سے، اپنے جذبوں سے فرار حاصل کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔اب آپ کا سوال یہ سامنے آئے گا۔کہ اس کا حل کیا ہے؟۔تو عزیزو! اس کا حل بہت سادہ ہے۔محبت، بھروسہ، تسلیم و رضا۔''

''آپ کی اپنے اہل خانہ، بیوی بچوں سے، والدین سے، بہن بھائیوں سے محبت ایسی مضبوط بنیادوں پر ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنا مخلص۔بے لوث، وفادار سمجھیں، اس سے آپ کو بھروسہ حاصل ہوگا۔طاقتور سچی بے ریا محبت، بھروسے کا احساس ہوتی ہے۔اب آپ کو محبت اور بھروسے کی توانائی حاصل ہوگئی، تو آپ اپنے مسئلے کو پوری شدتوں کے ساتھ اس سے جڑے حقائق کے ساتھ تسلیم کر لیجئے۔قرض ہے، محبت ہے، ادھار ہے، ناراضگی ہے، رشتوں کا مسئلہ ہے۔کاروبار کے خسارے ہیں۔دولت کے نقصانات ہیں، جو بھی ہے اس کو تسلیم کر لیجئے۔اب آپ کو تین چیزیں میسر آ گئیں۔اول محبت کہ آپ سب سے محبت کرتے ہیں۔اور آپ کی محبت اور خلوص کے باعث، وہ سب آپ پر بھروسہ کرتے ہیں۔تو پھر آپ کے ساتھ چلیں گے۔پھر مسئلہ سامنے آ گیا۔اس کو جان لیا، تسلیم کر لیا۔اس کی شدت اور کیفیت کا ادراک کر لیا تو مسئلہ تو رہا، مگر بوجھ نہ رہا۔اب چوتھا بنیادی مرحلہ۔رضا کا۔یہ مسئلہ ہماری حماقتوں، شرارتوں، ضرورتوں، ناعاقبت اندیشی، لالچ، طمع، خوف جس سے پیدا ہوا ہو۔مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم کو، اب اس صورت حال کو، رب کی رضا جان کر، خود کو امتحان اور آزمائش کے لئے تیار کر لینا چاہیے۔اے میرے رب ہر دکھ، ہر پریشانی، ہماری کوتاہی کے باعث ہمارے لئے آزمائش کا سبب بنتی ہے۔ہر خیر و شر تیرے اختیار میں ہے۔ہم اپنی تمام کوششیں، ہمتیں اس مسئلے سے نکلنے کے لئے صرف کریں گے۔ہم ہر اچھے، برے میں تیرے فیصلے کو، تیرے اختیار کو، تیری مصلحتوں کو تسلیم کریں گے۔اور اس سے نمٹنے کی کوشش کریں گے۔الٰہی! اپنے فضل سے ہمیں کامیابی عطا فرما۔۔!''

''آمین۔۔آمین۔ثم آمین۔۔۔!''۔ان کی گفتگو، آخری لفظ، خطاب نا رہے، تقریر نہ رہے، وعظ نہ رہے دُعا میں ڈھل گئے۔بے ساختہ مریدوں، عقیدت مندوں کے دلوں سے آواز کی صورت، طلب کی صورت آمین نکلی۔اے میرے رب! قبول فرما۔اے میرے رب! قبول فرما۔'' قادری سرکار سر جھکا کے خاموش ہو گئے۔

مگر ہر شخص سوچ رہا تھا کہ اس کو اس کی پریشانی کا حل مل گیا ہے۔واقعتاً ڈپریشن ہوتا ہی ہے مسئلے سے فرار ہونے کے باعث۔خود کشی کرنا، بچوں کو قتل کر دینا، نہر میں چھلانگ لگا دینا۔غیرت کے نام پر قتل و غارت، بزنس کے نقصان پر بھاگ جانا یا منہ چھپا لینا، یہ سب کم ہمتی کے باعث ہے، اور کم ہمتی، اکیلے پن سے، گھبرانے سے پیدا ہوتی ہے۔

کئی مرید اور عقیدت مند قادری سرکار کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر، ان کے گھٹنے چھو کر ان سے رخصت کی اجازت طلب کر رہے تھے۔کئی لوگ جو ان کے تخت کے پاس قریب کھسک آئے تھے۔اپنے ذاتی معاملات میں ان سے مشورے اور راہنمائی کے طالب تھے۔

اچانک کسی نے قدیر کا کندھا ہلایا۔ ''سنیئے۔۔!''

''جی۔۔۔!'' قدیر ایک دم چونکا۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا۔

''آپ تنزیل میاں کے دوست ہیں۔ قدیر بھائی۔؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں مگر آپ۔۔!'' قدیر نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟۔''

''قادری سرکار آپ کو بلا رہے ہیں آپ اندر تشریف لے چلئے۔۔۔ میں ندیم ہوں سرکار کا خادم'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے مڑ گیا۔

قدیر اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ قدیر کو ندیم نے ایک سادہ سے فرنیچر سے آراستہ کمرے میں بٹھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک اور خادم نمودار ہوا۔ اس نے چائے کی ٹرے اس کے آگے رکھی۔ جس میں بھاپ اڑاتی چائے اور کچھ بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

''سرکار ابھی تشریف لاتے ہیں۔ جب تک آپ چائے پیجیے۔'' خادم نے آہستگی سے کہا۔ اور سر کو خم دیکر رخصت ہو گیا۔ قدیر نے ایک بات محسوس کی کہ یہاں سب بہت نرم لہجے، میٹھے انداز اور دھیرے بات کرتے تھے۔ خانقاہ کے ماحول میں ایک سکون، ایک متحرک سکون کی کیفیت ہوتی تھی۔ ایسا سکون، جس میں بدنظمی کے بجائے ترتیب اور توازن پایا جائے۔ ورنہ بعض اوقات سکون نیم دلی بھی پیدا کرتا ہے۔

اچانک کمرے کا پردہ ہلا، باہر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ اور دوسرے ہی لمحے قادری سرکار دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ قدیر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو۔۔ بیٹا بیٹھو۔!'' انہوں نے شفقت سے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

''تنزیل میاں! بالکل خیریت سے ہیں۔ وہاں ضمنی الیکشن ہو رہا ہے۔ وہ خادم حسین کی انتخابی مہم کی نگرانی کریں گے۔!''

قادری سرکار نے بنا تمہید کہا۔ ''اگر آپ بھی جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ ہم آپ کے لئے گاڑی کا بندوبست کروا دیتے ہیں۔!''

''جی میرا خیال ہے کہ وہ اکیلا ہوگا۔'' قدیر نے کہا۔ ''کبھی وہ گھر سے اتنی دور، اور تنہا نہیں رہا۔ کہیں گھبرا نہ جائے۔'' قدیر کے انداز میں بے حد فکرمندی تھی۔

''تنہائی کا دھیان رکھنا بہت اچھی بات ہے۔'' قادری سرکار نے کہا۔

''جی۔۔!'' قدیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی تائید کی۔ وہ مسکرا دیئے۔

''تم بہت اچھے لڑکے ہو، بہت محنتی، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے۔!'' انہوں نے کہا۔

قدیر کو حیرت ہوئی۔ قادری سرکار اس کے متعلق کیا جانتے ہیں اور ایسا کیا ہونے والا ہے کہ جس کے لئے وہ اس کو حفاظت کی دعا دے رہے ہیں۔

''ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت طلب کرتے رہنا چاہیے۔'' وہ بولے۔ ''کریم آقا خوش ہوتا ہے کہ اس کا بندہ ہر وقت اس سے بخشش طلب کرتا ہے۔ وہ ایسا دینے والا ہے کہ نہ مانگنے پر خفا ہوتا ہے۔''

اچانک قدیر کو جیسے کوئی خیال آیا۔ ''مانگنا کیوں ضروری ہے؟۔ وہ تو ہماری ہر ضرورت، ہر خواہش سے آگاہ ہے۔ عالم الغیب ہے پھر کیوں چاہتا ہے کہ بندہ اپنی انا توڑ کر اس کے آگے جھک جائے۔ آخر یہ انانیت بھی تو اسی قادر مطلق کی عطا ہے۔!'' قدیر نے اپنا خیال سوال کی صورت میں ان کے آگے رکھ دیا۔

''ہمارے لئے جذبے بہت ضروری ہیں۔ قدیر میاں۔!'' قادری سرکار نے بہت دھیمے سے، اطمینان سے اس کے سوال کا جواب دینا شروع کیا۔ ''جذبات ہی ہمیں مخلوق میں افضل بناتے ہیں۔ کوئی ہمیں اچانک اچھا لگنے لگتا ہے۔ مگر ہم

چپ رہتے ہیں۔ راز دل میں چھپائے رہتے ہیں۔ اور اس طلب میں ہوتے ہیں کہ ہمارے جذبات کی پذیرائی ہو، پھر ہمیں کوئی سراہنے والا مل جاتا ہے۔ ہمیں جونہی اظہار کا اذن ملتا ہے ہم خود کو انتہائی کامیاب و کامران سمجھنے لگتے ہیں۔!''

''جی۔۔۔!'' قدیر کچھ یوں لگا کہ جیسے وہ قادری سرکار کے آگے پرت در پرت کھل رہا ہے۔

''بات ساری اپنائیت اور چاہت کی ہے۔ خدا کی یہ مصلحت ہے کہ ہم اس سے مانگیں۔ کہیں، بار بار کہیں۔ اسے اچھا لگتا ہے کہ اس کی تخلیق بار بار اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اُسے پیار آتا ہے۔ اُس ماں کی طرح، جس کا بچہ اس کی قمیض کا دامن پکڑے، کبھی اس کا آنچل تھام کے، کبھی اس کے گھٹنوں سے لپٹ کر، ماں۔ ماں کہتے ہوئے ننھے ننھے قدموں سے اس کے پیچھے آگے ہو رہا ہو۔ ماں اپنی مصروفیات میں اس کو جھڑک رہی ہے۔ ڈانٹ رہی ہے۔ کبھی جھنجھلاہٹ میں ایک آدھ چپت بھی رسید کر رہی ہے۔ مگر بچہ ہے کہ دو چار منٹ کے لئے رکتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ سے وہی معاملہ شروع کر دیتا ہے۔'' قادری سرکار کے لفظ جیسے منظر کشی کر رہے تھے۔

''کیا دیکھا ہے کبھی یہ منظر۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی بالکل۔۔!'' قدیر نے فوراً کہا۔ ''آپ کی بات سے مجھے اپنی بہن کی دو سالہ بیٹی یاد آ گئی، بالکل یہی منظر ہوتا ہے۔''

''تو پھر قدیر میاں۔! خدا ہمیں پیار کی، محبت کی، اظہار کی تربیت دے رہا ہوتا ہے۔''

قادری سرکار نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ''بندے کے اندر گہرائی و گیرائی دونوں ہی طلب کرنے، انکار ہونے سے آتی ہیں۔ طلب اس ملمع کو اتار پھینکتی ہے جس کا تعلق عزازیل کی کٹھ حجتی سے تھا۔ اور عطا میں انکار یا دیری سے صبر حاصل ہوتا ہے۔ اور صبر سے ترک کی منزلیں ملتی ہیں۔''

آج قدیر کو پہلی بار احساس ہوا کہ اقبال کے اس شعر کا اصل مفہوم کیا ہے۔ صحبتِ پیر روم سے، مُجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم نکتہ رس، ایک کلیم سربکف۔

اس سے پہلے اس کے پاس آنے والے کتنے ہی لوگوں نے علیت، فلسفے، مغرب کی تحقیق، انسانی سائیکالوجی پر جو کچھ کہا۔ جو تجزیے کیے۔ وہ کتنے بودے اور معمولی تھے۔ بے روح الفاظوں کے گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے۔ علم تو یہاں ہے۔ ٹھہراؤ، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔ جب تک علم کو رضائے الٰہی کی بنیاد پر استوار نہ کیا جائے۔ بھٹکنے کی صد فیصد گنجائش رہتی ہے۔ صرف خدا کی رضا ہی انسان کو عالم بناتی ہے۔ جو کہ علم کا حقیقی منبع ہے۔ پاکیزہ، دلکش سچا اور تحیر آمیز۔ منبع اگر پاکیزہ ہو، تو پھر پانی کی لہریں جہاں تک جائیں گی۔ پاکیزگی ہمراہ ہوگی۔

قادری سرکار کے نرم لہجے کی پھوار سے، ان کے لفظوں سے معنی و مفہوم کا ایک دریا تھا۔ جو سبک خرامی سے اس کو اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''پھر اللہ کو پسند ہے۔ دینا، عطا کرنا۔ دنیا کے حفظِ مراتب کو دیکھ لو۔ باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اولاد کچھ مانگے۔ ماں کی آرزو ہوتی ہے کہ بچے کچھ بولیں۔ عاشق کی آرزو ہوتی ہے کہ محبوب کچھ کہے اور وہ پورا کرنے کے لئے جان لڑا دے۔ شاعر کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اشعار پر کوئی سر دُھنے۔ لکھاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے لفظوں کی داد دے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ ہر کوئی اپنا اظہار چاہتا ہے۔ وہ مالک ہے۔ مختار ہے۔ تخلیق کار ہے۔ منصف ہے۔ عادل ہے۔ کریم ہے۔ احسان کرنے والا ہے۔ پھر ایسے کریم آقا کے آگے جھولی پھیلانا، اس سے طلب کرنا، اس کی خوشنودی کا باعث ہے۔ وہ تو ایسا محبوب، ایسا دلبر، ایسا پیارا ہے۔ جو کہ خود کہہ رہا ہے۔ آؤ مجھ میں سما جاؤ۔ مجھے مانگ لو۔ مجھے محسوس کر لو۔!''

قدیر کے اوپر ہر لفظ ایک نئے مفہوم سے وارد ہو رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ صحبت کتنی ضروری ہے۔ لفظ فقط تشریح ہی کے نہیں، بلکہ جذبے کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ جب تک لفظوں کے مفہوم میں، جذبے کی نرم و گرم آنچ نہ ہو۔ دل نہیں پگھلتے۔

''آپ مجھے بدل دیں گے۔!'' قدیر کو اپنا آپ اجنبی لگنے لگا۔
''بدل دیں گے یا خود کو دریافت کرنے لگو گے۔؟'' ان کا سوال بے حد سادہ مگر پُر کار تھا۔
''معلوم نہیں۔۔!'' قدیر نے گردن جھٹکی۔ ''بہت سارے معاملے روشن ہوئے ہیں۔''
''معاملے تو پہلے بھی تھے۔۔!'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تو جواب دی، سمجھنا اب شروع کیا۔''
''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔!'' وہ بولا اور پوچھا۔ ''کیا مجھے اجازت ہے۔؟''
''بالکل۔۔!'' وہ مسکرائے۔ ''محبت اور معافی، تعلق اور ٹھہراؤ دونوں میں جبر نہیں۔!''
''کیا میں تنزیل کے پاس جاؤں۔؟'' اس نے سوال کیا۔
''اگر مصروفیت نہ ہو تو چلے جاؤ، زندگی کے کچھ رنگ، کچھ پہلو خبر کی صورت اخبار میں دیکھنے اور پڑھنے کے بجائے خود اس کا حصہ بن جاؤ۔۔!'' انہوں نے کہا۔
''ہاں مجھے یاد آیا۔'' قدیر نے پوچھا۔ ''اگر گستاخی نہ سمجھیں تو عرض کروں۔۔!''
''کہو۔۔!'' قادری سرکار نے اجازت دے دی۔
''آپ کی پیش گوئی ہے کہ اس ضمنی الیکشن سے موجود سیٹ اپ متاثر ہو جائے گا۔!'' قدیر نے پوچھا۔
''قادری سرکار نے اسے دیکھا اور کہا۔ ''حادثہ ایک پل میں نہیں ہوتا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔ جب بھی کوئی نظام خلق خدا کی بھلائی نہ کر پائے گا۔ ملکی مفادات کو پس پشت ڈالا جائے گا۔ مملکت خداداد میں اسلام کے حقیقی اغراض و مقاصد سے انحراف کیا جائے گا۔ تو کوئی نہیں بچے گا۔ جب ظلم، ناانصافی، برداشت سے باہر ہو جائے تو قدرت کا اپنا تخلیق کردہ نظام انصاف حرکت میں آجاتا ہے۔ پھر کوئی بھی کمزور لمحہ، کوئی بھی فیصلہ، کوئی بھی ابتداء پورے نظام کو نابود کر دیتی ہے۔ یہ مکافات عمل ہے یا نوشتہ دیوار۔ اب اس سے فرار ناممکن ہے۔!''
وہ بولے اور پھر خاموش ہو گئے۔ ان کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔
قدیر کو ایسا لگا کہ وہ جیسے قضا و قدر کے احکامات سن رہے ہوں۔ اس وقت ان کے چہرے پر کچھ انوکھا تاثر تھا کہ قدیر کچھ محسوس نہ کر سکا۔ سوائے اس کے کہ وہ اس لمحے انہیں تنہا چھوڑ دے۔ وہ آہستہ قدموں سے پلٹ آیا۔
قدیر خانقاہ اس لئے آیا تھا کہ جب تنزیل سے اس کی فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے پوچھا کہ کیا وہ بھی آجائے۔ مگر تنزیل نے جواب دیا کہ قادری سرکار کی اجازت کے بغیر اس کا آنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے وہ قادری سرکار سے اجازت لے، پھر آئے۔ وہ اسی لئے آیا تھا مگر یہاں آکر اب اس کو معلوم ہوا کہ لوگ کیوں ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان کے اندر معنی و مفہوم کے ایسے دریا بہتے ہیں کہ پیاسے جوق در جوق ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ اور پھر جو ایک بار اس چشمے سے ایک گھونٹ بھی پی لے۔ پھر اس کو کسی اور رہٹ کا پانی اچھا نہیں لگتا۔ قدیر نے باہر نکلتے ہوئے تنزیل کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

''پولیس آئی ہے۔۔!'' غلام حسین نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیوں۔۔؟''
''گھبرانے کی کیا بات ہے۔'' خادم حسین نے کہا۔ ''چل کر دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ اٹھا اور اس نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم لوگوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔
''جی تھانیدار کہو۔ کیا بات ہے۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔
''ہم لوگ ملنے آئے ہیں آپ سے۔۔!'' تھانیدار نے کہا۔ ''کل کے واقعے کے بعد سخت آرڈر آئے ہیں کہ کوئی جلسہ، جلوس بغیر اجازت نہ کیا جائے اور سکیورٹی کے لئے پورا بندوبست کیا جائے۔ آپ لوگ بھی انتخاب میں کھڑے ہو، جلسے، جلوس کے لئے، نفری کے لئے درخواست دے دینا۔ کتنے پولنگ اسٹیشن، کتنے کیمپ لگاؤ گے جی۔۔!'' اس نے پتلا

سابید ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے سوال کیا۔

''اچھا۔۔؟''اس کی طویل بات کے جواب میں خادم حسین نے صرف اتنا جواب دیا۔''ہم تھانے آکر آپ کو بتا دیں گے۔!''

''ٹھیک ہے۔!'' وہ مایوسی سے بولا۔''ادھر کوئی ٹینٹ شمینٹ، بینر شینر، کھانے پینے کا پروگرام نظر نہیں آرہا۔ خیر تو ہے۔ کہیں پیسے سیٹے لیکر بیٹھنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟'' وہ ہنسا۔ ایک معنی خیز ہنسی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ہم تمہیں سمجھ گئے بچو۔!

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔!'' خادم حسین نے کہا۔''لیکن اِدھر کی کوئی بات تم سے چھپی بھی ہے۔؟'' خادم حسین کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

''آپ تو جی ناراض ہو گئے۔ ہمیں کیا پتا کل آپ بھی اسمبلی کے ممبر بن جاؤ۔ ہم آپ کا خیال رکھیں گے۔ پھر آپ ہمارا خیال رکھنا۔'' اس نے بات بنائی۔ اور اچک کر جیپ میں جا بیٹھا۔''چل بھئی شیدے۔۔!'' اس نے پتلا سا بید جیپ کے اسٹیرنگ پر مارا۔ اونگھتا ہوا ڈرائیور سپاہی چونک گیا۔ اور تیزی سے جیپ آگے بڑھا لے گیا۔ اس کے پیچھے پولیس کی بقیہ گاڑیاں بھی دھول اُڑاتی چلی گئیں۔

ہم واپس کمرے میں آگئے۔ اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

''تو یہ بتایئے۔ اب آپ لوگ کیا حکمت عملی اختیار کریں گے۔؟''

''آپ پریشان نہ ہوں خلیفہ جی۔!'' حافظ معراج دین نے کہا۔''اب آپ دیکھئے گا کیا ہوتا ہے۔ مرشد کی دعائیں ساتھ ہوں تو سوہنا رب بھی مہربان ہو جاتا ہے۔ انشاءاللہ اب تو اپنا بچہ ہی جیتے گا۔ آپ بس یوں کیجئے کہ یہ خط ہمیں دے دیں۔ کتنے ہیں جی۔؟''

''دس ہزار چھپے ہیں۔ اگر کم ہیں تو اور منگوا لوں۔؟'' میں نے تعداد بتاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جی ٹھیک ہیں۔ اس حلقے میں چھوٹی بڑی ملا کر اٹھارہ مساجد ہیں۔ ان میں تقسیم کریں گے۔ اس سے پہلے تمام امام صاحبان اس موضوع پر تقریر کریں گے۔ آپ دیکھئے گا جی کہ ہوتا ہے کیا۔؟'' حافظ صاحب کے اندر جیسے نیا جوش، بے پناہ جذبہ بھر گیا۔

''اور کیا۔۔!'' میاں سلمان نے کہا۔''یہ ایسی کمپئین ہو گی کہ جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔''

''ہم سب اس کے لئے جان لڑا دیں گے۔ پہلی بار تو مرشد کا حکم آیا ہے۔'' محمد حنیف صحرائی نے کہا۔

بلاشبہ۔۔ میں نے سوچا۔ ایک ایسی الیکشن کمپئین کہ جس میں نہ کوئی کیمپ، نہ کوئی جلسہ، نہ کوئی خطاب، نہ خرچا۔ جو دلوں کو فتح کر لے۔ وہی فاتح زمانہ۔ بہت بچپن کا پڑھا ہوا شعر پتا نہیں کیسے ذہن کے نہاں خانوں سے اچھل کر ذہن کے شعوری حصے میں آ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ خلیفہ جی۔؟'' انہوں نے مجھے مستقل ہی خلیفہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ حافظ سلمان میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا شان بے نیازی ہے کہ بے وسیلہ لوگوں کو محبت اور پیار کا وسیلہ عطا کر دیتا ہے، اور صاحب زر و مال کو اپنے تمام کر و فر کے ساتھ ایسی جگہ نشانہ بنا دیتا ہے۔ جہاں سب اپنے ہوتے ہیں۔ مگر بے بس ہوتے ہیں۔''

''یہ اسی بے نیاز کا کرشمہ ہے۔ جو چاہے تو ممولے کو لڑا دے شاہ باز سے۔۔!'' حنیف صحرائی نے گنگنا کے کہا۔

''آپ لوگوں کو میں نے خط سننے کے بعد گہری فکر میں مبتلا دیکھا تھا۔۔!'' میں نے سوال کیا۔

حافظ سلمان نے میرا سوال سن کر ذرا پہلو بدلا اور پھر کہا۔''خط کے مندرجات میں جو حوالے ہیں ان سے کوئی ذی شعور انکار کر ہی نہیں سکتا۔ ہمارے سامنے ایک سوال، ایک خوف ایک لمحے کے لئے نمودار ہوا تھا۔ کہ ہم جس کے لئے یہ

سب کچھ کر رہے ہیں۔ کیا وہ ان معاملات کے دوران ترغیب، لالچ، خوف، عدم اعتمادی کا شکار تو نہیں ہو جائے گا۔ لیکن ابھی جو رویہ اس نے پولیس کے ساتھ رکھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ سرکار کا انتخاب غلط نہیں ہے اور پھر وہ تو جوہری کی نگاہ رکھتے ہیں۔"

"حافظ جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔!" میاں سلمان نے کہا۔ حنیف صحرائی نے بھی سر ہلا کے تائید کی۔

خادم حسین اٹھا اور ان تینوں کے آگے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "یہ سر حاضر ہے۔ یہ جسم حاضر ہے۔ اگر اپنے ارادے سے پھر جاؤں۔ اگر نیت کا کھوٹا پاؤ، تو اللہ کی قسم مجھے اپنے ہاتھوں سے مار کے پھینک دینا۔ کسی مردار جانور کی طرح۔ غدار اور ننگ قوم قرار دیکر میری لاش پر تھوکنا۔ پیشاب کرنا۔ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں مٹی بھی نہ دینا۔ میرا مرنا، جینا سب آپ کے ہی کے لئے ہے۔ یہ میرا قول ہے آپ کو۔۔۔" خادم حسین سخت جذباتی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ چہرہ لال بھبھوکا انگار ہو رہا تھا۔ نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ گندمی رنگت والی لمبی گردن کی نسیں تنی ہوئی تھیں۔ اور بدن میں ایسا کھچاؤ محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ستار کی مانند، ذرا سا چھیڑو گے تو آواز نکل پڑے گی۔۔۔!

آدمی بھی ستار ہی ہوتا ہے۔ ذرا سا انگلیوں کو حرکت دو، ٹونٹیاں کسو تو تار جھنجھنا جاتے ہیں اور آواز چیخ کر نکلتی ہے۔ ارر اررااں۔۔۔ ترررااں رارااں۔۔۔ ارااں۔۔۔ پھر کہیں جا کر سر ترتیب میں آتے ہیں۔ راگ تخلیق پاتا ہے۔

"ارے بیٹے ہو تم ہمارے۔!" حافظ سلمان نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ "بھلا ہم تمہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ پھر بچے ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ لمحے بھر کو خیال آ گیا۔ مگر دیکھو بھروسہ تو تم ہی پر ہے۔!"

"اور کیا۔۔۔!" حنیف صحرائی نے اس کی پشت پر تھپکی دی۔ "ہمیں تم پر فخر ہے۔!"

"سوہنے رب کا شکر ہے۔!" غلام حسین نے بے اختیار اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔ "وہ کتنے سوہنے دل والے یاروں سے ملا دیتا ہے۔"

"یہ سب قادری سرکار کے نظر کرم کا فیضان ہے۔!" حنیف صحرائی نے عقیدت سے کہا۔ "جب وہ کوئی بات کہتے ہیں۔ کوئی حکم دیتے ہیں تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت والی بات ہوتی ہے۔۔!"

میں خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔ سب سچے اور کھرے لوگ تھے۔ اپنی بات کو کہنے والے، اپنے باطن کو باہر لا کر بلاکم وکاست بیان کرنے والے۔ مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

"کیا حساب کتاب کر رہے ہو۔!" زینت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

پیر ستارہ شناس جو الماری کے اندر منہ دیئے نجانے کیا کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اس بری طرح چونکا اور بدک کے پیچھے ہٹا کہ اس کا سر الماری کے پٹ سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اور بے ساختہ ایک کراہ اس کے منہ سے نکل گئی۔

"کیا مصیبت کی طرح نازل ہوتی ہو۔!" پیر ستارہ شناس نے غصے میں کہا۔ "کمرے میں دستک دے کر داخل نہیں ہو سکتی ہو کیا۔؟"

"ارے میں تمہاری بیوی ہوں کہ ملازمہ کہ باقاعدہ اجازت لیکر اندر داخل ہوا کروں۔ تم کونسا کسی کو دم کر رہے تھے۔" زینت نے اسے کرارا سا جواب دیا اور معنی خیز ہنسی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"تم کبھی نہیں سدھرو گی۔۔۔!" پیر ستارہ شناس نے قدرے جھینپ کر کہا۔ "اب میں ایسا بھی نہیں ہوں۔!"

"اب اگر ایسا دم بھی کرو گے نا تو دم نکال دوں گی۔!" اس نے بڑے ٹھسے سے کہا اور بیڈ پر ہچک کر بیٹھی پورا بیڈ لرز کر رہ گیا۔ "اور ذرا یہ بتاؤ کہ تم میری الماری میں گھسے کیا کر رہے تھے۔؟" اس کا لہجہ مشکوک سا ہو گیا۔

"میں ذرا اپنے پیسے گن رہا تھا۔!" پیر ستارہ شناس نے کہا۔ "اور یاد رکھو کہ یہ ہماری مشترکہ الماری ہے۔!"

"خیر دی تو میرے باپ نے تھی۔ اب تمہارے پاس تھا کیا۔؟ وہی ایک ٹین کا صندوق جس کو اب بھی تمہاری اماں

نے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ شروع شروع میں تو میں سمجھتی تھی کہ شائد تمہاری اماں نے انڈین کلچر کے زیر اثر، تمہارے ابا کا کریا کرم کروا کے اس کی راکھ کو صندوق میں حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔''

''کیا بکواس ہے۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس بھڑک اٹھا۔''یہ تم ہر معاملے میں اماں اور پھر مرحوم ابا کو کیوں بیچ میں لے آتی ہو۔ ہر معاملہ کھینچ تان کرا بایا پھراماں پر ہی جا رُکتا ہے۔''

''تمہاری اماں جو ہر وقت تمہارے بیس سال پہلے مرے ہوئے ابا کا ذکر خیر کرتی رہتی ہیں تو تمہیں برا نہیں لگتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ابا مرنے کے بعد بھوت بن کر تمہاری اماں کو چمٹ گئے ہیں۔ اور وہ عذاب بن کر ہم پر مسلط ہو گئی ہیں۔ ستر کے پیٹے میں ہیں۔ مگر اطوار سترہ برس کے، ابھی تک آنکھوں میں کاجل پھیکا نہیں ہونے دیتی ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یقین نہ آئے تو جا کر اندر دیکھ لو۔ نارنجی رنگ کا جوڑا پہنے بیٹھی ہیں۔ پوچھا۔ اماں آج یہ ہار سنگھار کس لئے۔ شرما کے کہنے لگیں۔ آج تمہارے ابا یاد آرہے ہیں۔ رات ہی خواب میں دیکھا۔ بڑے اداس، اداس تھے۔ کہہ رہے تھے۔ زبیدہ تمہاری یاد کی آگ میں جل رہا ہوں۔ دل و بدن میں آگ سی لگی ہے۔ دیکھو تپش سے میرا رنگ کیسا سرخ ہو رہا ہے۔ جوان بچی کے سامنے ایسے بول رہی تھیں۔ سچ میری تو جان ہی جل کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ اماں وہ آپ کی یاد میں نہیں جل رہے تھے۔ بلکہ جہنم کے فرشتے آگ کے سرخ سرخ شعلوں سے ان کو جلا کر عذاب دے رہے تھے۔ اور وہ خواب نہیں تھا۔ سچ تھا۔ لائیو ٹرانسمیشن فرام جہنم۔ اونلی فار یو۔ آپ کا اگلا اپی سوڈ۔۔۔''

''الو کی پٹھی! میری ماں کے پیچھے ہی پڑی رہتی ہے۔!'' پیر ستارہ شناس نے اپنا منقش کھسہ کھینچ کر اس کو مارا۔ زینت نے بڑی صفائی سے فضا میں ہاتھ بلند کر کے پکڑ لیا۔

''تم بھی بڈھے ہو گئے ہو۔!'' اس نے پیر ستارہ شناس کا کھسہ اس کو گود میں پھینک دیا۔''ذرا سی دیر میں بلڈ پریشر ہائی کر لیتے ہو۔!''

''بڈھا کہاں ہوا ہوں۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔''یہ سب شوگر کے مسائل ہیں۔ مگر اب تو دوا کھا رہا ہوں۔ شوگر کنٹرول میں ہے۔ اور اعصاب بھی۔!''

''اونہہ۔۔۔!'' زینت نے منہ بنایا۔''اُسی منڈی بہاؤالدین والے حکیم کی باتوں میں آکر الٹا سیدھا کچھ نہ کھا لینا۔ دو مقدمے چل رہے ہیں اس کے اوپر، اُسی کے مریضوں کے۔ طاقت کی دوائی کھانے کے چکر میں گردوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب ڈائیلاسس پر ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا۔۔!'' پیر ستارہ شناس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''اس کی بیوی نے بتایا تھا۔!'' زینت نے مسکرا کے کہا۔''ایک دن میں نے اس جعلی حکیم سے کہا کہ ذرا ایک منٹ کے لئے فون دیجئے گا۔ وہ کم بخت جانے کیا سمجھا۔ فون مجھے پکڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ بھابھی آپ کے لئے، ساری عمر کے لئے فون حاضر ہے۔ ایک منٹ کے لئے کیا؟ میں نے کہا روزانہ پانچ سو روپے کا کارڈ لوڈ کرواتی ہوں۔ میرا سارا میکہ دوبئی میں ہے۔ اس میں تو ٹوٹل چالیس روپے کا بیلنس ہے۔ بری طرح کھسیا کے رہ گیا۔''

''اس کمینے کی یہ جرأت۔'' پیر ستارہ شناس پھر بھڑکا۔

''ارے رہنے دو یہ ڈرامے کی بہادری۔۔!'' زینت ہاتھ نچا کر بولی۔''پیٹ کی بھوک، اور نیت کی خرابی منہ پر لکھی ہوتی ہے۔ یہ ہم عورتیں ہی ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو خود سے باندھ کر رکھتی ہیں۔ عہد وفا کی نظر نہ آنے والی زنجیروں سے۔ جو مرد کی بے وفائی اور موت دونوں سے نہیں ٹوٹتی ہیں۔ سنا نہیں۔ عورت رُکے تو رُکے اپنے آپ سے۔۔ نہ رُکے تو نہ رُکے باپ سے۔!''

پیر ستارہ شناس منہ پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''حکیم کی بیوی بڑی بھلی عورت ہے۔ میں نے بات کی تو رونے لگی۔ وہی بے تکا حال، پوری دنیا کا علاج کرتا ہے اور خود بھائی کا لڑکا لیکر پال رہا ہے۔ کہنے لگی! بہن کیا تم بھی میرا گھر خراب کرو گی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا کیا۔ تم سمجھتی ہو کہ تم نے گھر بنا لیا؟ یا دو اجنبی ایک مکان میں رشتوں کی مجبوری نبھا رہے ہیں۔ اور ویسے بھی تمہارے میاں میں ہے کیا۔؟ جو میں اس کو پھانسوں گی۔ اگر ایسا خوف ہے تو میں اپنے میاں کا نمبر ایس ایم ایس کر دیتی ہوں۔ تم بھی جواباً میرے میاں پر ڈورے ڈال لینا۔ مگر نتیجہ نہ نکلنے کا۔ تیرا موٹا میاں ہاتھی کی طرح ایک جگہ کھڑا جھولتا رہتا ہے۔ اور میرا مرغ کی طرح پر پھیلا کر دو چار قدم ہی دوڑتا ہے۔ پوچھنے لگی۔ بہن تم کیوں جڑی ہوئی اس کے ساتھ۔ میں نے کہا۔ جس بیماری میں تم مبتلا ہو یہی میرا مرض بھی ہے۔ مجھے اس کم بخت سے محبت ہے۔ اور تمہیں اس کمینے کی چاہ۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہاں یاد آیا۔ ''اللہ ملائی جوڑی۔۔۔ ایک اندھا ایک کوڑھی۔!'' زینت ہنسی۔

پیر ستارہ شناس اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہنسنے لگا۔

''خدا کی قسم تم آج تک نہیں بدلیں۔ بالکل ویسی کی ویسی ہو۔ جیسے پہلے تھیں۔ شعلہ سا۔ پٹاخہ جیسی۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''تمہاری گفتگو ہی تو مجھے لے ڈوبی۔'' وہ بولا۔ ''کیسی کیسی باتیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم شہری لڑکی نے مجھ جیسے معمولی پڑھے لکھے پینڈو کے لئے کتنی بڑی قربانی دی۔''

''ارے چھوڑو جی۔!'' زینت محجوب سی ہو گئی۔ ''نجانے کیا بات تھی کہ بس۔۔۔ شائد اسی کو تو کہتے ہیں قسمت کا ملنا، جوڑوں کا بننا۔۔۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ چائے پیو گے بناؤں۔!''

''ارے چائے وائے چھوڑو۔ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔؟''

''ہاں کہو۔!'' زینت اس کے قریب کھسک آئی۔

پیر ستارہ شناس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تم جانتی ہونا میری برسوں کی آرزو کو، جس کے لئے میں نجانے کب سے ترس رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ وہ اب پوری ہو گئی ہے۔۔۔!''

☆☆☆

''ہاں میں جانتی ہوں۔!'' زینت نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا۔ کیسے ہوا؟۔''

''مجھے ڈھیری مل گئی ہے۔!'' وہ ہیجان آمیز لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں شوق، جذبہ، لالچ جیسا امتزاج تھا۔ جب ہم اکیلے میں، یا کسی اپنے آپ پر عیاں شخص کے سامنے اپنے خواب پورا ہونے کا بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ تو باہر کے چھلکے کو توڑ کر اپنے اندر سے باہر نکل آتے ہیں۔ چیختے ہوئے، ٹھنکتے ہوئے بچوں کی طرح۔ سارا ملمع اتر جاتا ہے۔ ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا کے مصداق''۔

''ڈھیری۔؟'' زینت نے حیرت آمیز سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''کونسی ڈھیری۔۔۔ یہ کیا ہوتی ہے۔۔۔؟''

''ارے تجھے ہر بات کھول، کھول کے سمجھانے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں'' وہ چڑ گیا۔ ''اتنے برس ہو گئے مگر کچھ ہمارے دھندے کو جان کر نہ دیا۔''

''مجھے تمہارے کاموں سے کیا۔ اچھا کرو، برا کرو۔ اپنی قبر میں خود ہی جاؤ گے۔ میرا کیا؟''

''اچھا۔ یہ سب جو کماتا ہوں۔ تو کیا سوچ کر کھا لیتی ہے من من بھر اناج، یہ زرق برق کپڑے، یہ بچے اور ان کے خرچ۔'' وہ بری طرح بھنا گیا۔ ''قبر میں جاؤ گے۔''

''دیکھو میاں جی۔!'' زینت نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''شادی تم نے مجھ سے اپنی مرضی سے کی۔ بچے اپنی مرضی سے پیدا کروائے۔ جب ذمہ داریاں لی ہیں تو پورا تو خود ہی کرنا تھا۔ ہمارے اوپر کیا احسان جتاتے ہو؟۔ یہ جو پیری مریدی کا رعب ہے نا یہ گھر سے باہر جھاڑنا۔ ہم سے دین کی باتیں اگر کرو گے، تو پھر سنو گے بھی دین کی باتیں۔'' اس کا انداز خاصا مضحکہ اڑانے والا تھا۔ ہر لفظ کہہ رہا تھا کہ وہ پیر ستارہ شناس کی ہر رگ سے اچھی طرح واقف ہے۔

''تم نے مجھے کہاں الجھا دیا۔کوئی خوشی کی بات کرو تو اس میں بھی کھنڈت ڈال دیتی ہو۔!'' وہ دفعتاً صلح جو ہو گیا۔
''اتنی جلدی ناراض نہ ہوا کرو۔!''
''تم بھی پاجامے میں رہا کرو۔!'' زینت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
''اچھا بابا معاف کرو۔!'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔
''تم ڈھیری کا کہہ رہے تھے۔'' زینت نے بات ختم کرتے ہوئے اسے یاد دلایا۔
''اصل میں ہمارے ہاں ڈھیری سے مراد ایسی قبر ہوتی ہے۔جس میں مردہ تو ہوتا ہے مگر کون ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا۔بعض لوگ خود ہی بے نام قبروں کو معتبر بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔جن کی نہ کوئی تاریخ ہوتی ہے۔نہ کوئی حقیقی سلسلہ، یا صاحب علم و کرامت شخصیت ،بس مفروضوں پر عمارت کھڑی کر کے کرامات گھڑلی جاتی ہیں۔جبکہ مزار شریف، دربار وہ ہوتے ہیں جو کہ باقاعدہ سلسلوں سے جڑے ہوتے ہیں۔جن میں صاحب مزار معروف شخصیت ہوتے ہیں۔جیسے حضرت داتا گنج بخشؒ۔حضرت لعل شہباز قلندر سیہون شریف والے۔تین ہٹی والے بابا نور شاہ شہید۔کلفٹن والے غازی بابا۔یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگیاں تبلیغ دین کے لئے وقف ہوگئیں اور پھر جب انہوں نے پردہ فرمایا تو ان کے مزارات مرجع خلائق ہو گئے۔'' پیر ستارہ شناس نے تفصیل سے بتایا۔پھر ذرا رک کے بولا۔''یہ تو میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔دراصل مجھے درگاہ حضرت میاں مل گئی ہے۔''
''وہ درگاہ۔!'' مارے حیرت کے زینت کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔
''ہاں ہاں وہی درگاہ۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔
''تمہیں کیسے مل گئی۔!'' زینت نے پوچھا۔''وہ تو بہت بڑی ہے درگاہ ہے۔ہر وقت زائرین کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔نذرانے، چندے، چادریں، دیگیں کیا، کیا نہیں ہوتا وہاں۔؟''
''ہاں۔!'' پیر ستارہ شناس کی آنکھوں میں بے پناہ روشنی تھی۔''کیا کیا نہیں ہوتا وہاں۔رحمتیں برکتیں، روپیہ پیسہ، رعب، دبدبہ۔بس ایک یہی تو کمی تھی۔''
''چھوڑو جی۔تم میں کیا کمی ہے بھلا۔؟'' زینت کا لہجہ محبت سے بھرا تھا۔
''زینت سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں۔کوئی دینی خاندان نہیں، ہم لوگ تو دو سو برس پہلے مسلمان بھی نہیں تھے۔پتا نہیں کس نیک بخت شخص نے ہمارے پرکھوں کو کلمہ پڑھا کے مسلمان کیا۔اللہ اس کی قبر ٹھنڈی رکھے۔ہماری ساری مسلمانی ختنے اور کلمے تک ہی محدود رہ گئی ہے۔سچی پوچھو تو دین تو سراسر خیر ہے۔بھلائی ہے۔معصومیت ہے۔پیار ہے۔ہم نے تو اس کو اپنی خواہشات کی گندگی میں لتھیڑ دیا ہے۔خدا اور بندے کے بیچ راستہ روک کر بیٹھ گئے ہیں۔بندے ہمیں خدا سے قریب سمجھتے ہیں۔ہمیں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ہمارے لئے سرو قد کھڑے رہتے ہیں۔مگر ہم کیا ہیں۔؟ گندے گھناؤنے۔!'' پیر ستارہ شناس کا لہجہ تاسف سے بھرپور تھا۔بعض اوقات اندر کا سچ باہر آنے لگتا ہے۔خواہ یہ کیفیت وقتی ہی کیوں نہ ہو۔!
''یہ درگاہ کیسے ملی۔؟'' زینت نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔
''پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے ذریعے۔'' پیر ستارہ شناس نے بتایا۔''اس کے ذریعے محکمے سے ہمیں ٹھیکہ مل جائے گا۔''
''مگر ٹھیکہ تو سالانہ ہوگا۔بس صرف ایک سال کے لئے۔؟'' زینت نے سوال کیا۔
''ارے نہیں نیک بخت۔!'' پیر ستارہ شناس نے اسے سمجھایا۔''بس ایک بار سرکاری طور پر ٹھیکہ مل جائے تو پھر سجادہ نشینی بھی مل جائے گی۔سجادہ نشینی کی ذمہ داری تو خود پیر جہانگیر شاہ نے اٹھالی ہے۔!''
''وہ تو جی بڑے سید ہیں۔'' زینت نے عقیدت سے کہا۔''سید تو بادشاہ ہیں ہمارے پیارے۔ہماری نجات۔!''
پیر ستارہ شناس نے بے ساختہ ایک قہقہہ مارا اور ہنسنے لگا۔ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ارے تمہیں کیا ہوا؟ پاگل ہو گئے ہو کیا۔؟'' زینت نے الجھ کر پوچھا۔

''میں تمہاری عقیدت پر ہنس رہا ہوں۔!''

''بری بات ہے۔!'' زینت نے اسے جھڑکا۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے۔!''

''میں تمہاری عقیدت پر نہیں، بلکہ جہانگیر شاہ سے عقیدت کی بات پر ہنس رہا ہوں۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ وہ ہمیں اپنا بنا رہے ہیں۔ عنقریب ہم بھی گدا سے شاہ ہو جائیں گے۔!''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔؟''

''وہ ہمیں شجرہ بنا کر دے رہے ہیں۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا ''ہم بھی کچھ سے کچھ ہو جائیں گے باضابطہ طور پر۔''

''توبہ کرو جی توبہ۔'' زینت نے گھبرا کے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔!''

''جب انہیں نہیں آتی تو ہمیں کیا آئے گی۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''قبضہ گروپ جب کروڑوں کی پراپرٹی کو ہزاروں میں فروخت کرتا ہے۔ تو اس کو کچھ نہ کچھ آ رہا ہوتا ہے۔ بلکہ سارا کا سارا۔ اس لئے کہ اس کا کچھ اس میں لگا ہی نہیں ہوتا۔ زینت بیگم جو نام و نسب بیچتے ہیں۔ وہ اصل میں خود بے اصل ہوتے ہیں۔''

''توبہ کیوں بادشاہوں پر شک کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔'' زینت نے کہا۔ اس کا رواں رواں سیدوں کی محبت میں، آلِ رسول کی چاہت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''دین و دنیا ان ہی کے دم سے ہے۔!''

''سچ کہہ رہی ہو۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''ہماری نجات آلِ رسولؐ سے ہے۔ خالی خولی سیدوں سے نہیں۔ سید تو اب ریڈی میڈ بن رہے ہیں۔''

''بس کفر بکے جاتے ہو چپ کرو۔!'' زینت نے گھبرا کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

پیر ستارہ شناس چپ ہو گیا۔ اس نے سیدوں کو دیکھا ہے۔ کیا بتاتا اس کو؟ سادہ اور محبت سے بھری عورت کو۔ سید تو وہ ہوتے ہیں کہ جن کے روئیں روئیں سے خوشبوئیں آتی ہیں۔ جن کے چہرے پر نور ہوتا ہے۔ آنکھوں میں ایک نرالی جوت۔ جو کچھ نہ کہیں۔ کچھ نہ بولیں۔ صرف اپنے وجود کی برکت سے ہی ماحول بدل دیں۔ اور اگر دعا دیں تو زندگی کو سنوار دیں۔ ایک ایسے ہی سید ملے تھے اسے۔ آج وہ جو بھی کچھ تھا انہی سید کی برکت سے تھا۔ وہ تو تقسیم کی لہر بہر ہوتے ہیں۔ سوکھے کو سیراب کر دیتے ہیں۔ اور پھر خدا بھی کتنا پیار کرتا ہے ان سے۔ اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت جو ہیں۔ خود ہی تخلیق کیا۔ خود ہی سجایا، بنایا۔ اور پھر خود ہی عاشق ہو گیا۔ جن کا رب آپ عاشق ہو۔ تو اِن کا کیا کہنا۔ پھر ان کی ذریت کے درجات کا کیا کہنا۔ سچے اور کھرے لوگ ان ہی سے تو ڈھلتے ہیں۔ پھر ان کی تربیت سے ذرہ آفتاب، کرن مہتاب ہو جاتے ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہو۔!''۔ زینت نے اسے ٹہوکا دیا۔

پیر ستارہ شناس چونک گیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو۔؟''

''میں پوچھ رہی ہوں۔ کہاں کھو گئے۔ ابھی سے سجادہ نشینی کی لذت میں گم ہو گئے۔'' زینت ہنسی۔ ''مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ ٹھیکہ ملے گا کیسے؟ اور خرچا وغیرہ کہاں سے ہو گا۔؟''

''پچاس ساٹھ لاکھ کا خرچا ہے۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''پچاس، ساٹھ لاکھ کا خرچا۔!'' زینت یوں اچھلی۔ مانو اُس کو بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔ ''اتنے پیسے ہم کہاں سے لائیں گے۔؟'' اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

''کیوں اس میں مشکل کیا ہے۔؟'' پیر ستارہ شناس نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔ ''اللہ میاں کے لئے سبب پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم کہاں کے ایسے خاص کہ وہ ہم پر ایسا کرم کرے۔ ہم گناہگار پاجی لوگ۔!''

''اچھا پہلے کیوں نا بتایا۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔''بلاوجہ تمہارے ساتھ ہوں۔کہیں اللہ ناراض ہوا تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائیں گے۔''

''پیر جی میں نے ،ہم گناہگار، پاجی لوگ کہا ہے۔جمع کے صیغے میں۔'' زینت چیخ کر بولی۔''دھوکے باز، مکار، فریبی کی سزا تو کہیں زیادہ ہوتی ہے اور وہ فقط تو۔تنہا تو۔'' زینت بھلا کب پیچھے رہنے والی تھی۔

پیر ستارہ شناس ہنسنے لگا۔''ارے باولی ہوئی ہے کیا۔اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔اس نے ایسا سبب بنایا کہ سبحان اللہ۔!''

''اچھا تو کافی معرکے سر کیئے ہیں تم نے آجکل۔!'' زینت نے کہا۔''اب بتاؤ گے یا یونہی اشتیاق بڑھا بڑھا کر جان نکال لو گے۔؟''

''کافی عرصے سے درگاہ کی تلاش میں تھا۔'' پیر ستارہ شناس نے بتانا شروع کیا۔''پیر جہانگیر شاہ کے علاوہ یہ ممکن نہیں تھا۔مگر وہ بغیر پیسے کے بغیر پلہ بھی نہیں پکڑاتے ،ٹال دیتے ہیں۔ابھی پچھلے دنوں ایک مرید کا ایک کام اللہ نے ایسے بنا دیا کہ وہ بے پناہ خوش ہو گیا۔اس نے پانچ لاکھ روپے دیئے۔سچی جانو! تو میں نے پہلی بار کسی مرید سے اتنا بڑا اندرانہ وصول کیا۔میں نے سوچا یہ تو ادھر ادھر خرچے ہو جائیں گے۔کیوں نہ ان سے کوئی مستقل باعزت ٹھکانہ ڈھونڈھ لوں۔وہ پیسے لیکر سیدھا پیر جہانگیر کے پاس چلا گیا۔پھر وہاں تو معجزہ ہی ہو گیا۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔

''کیا معجزہ۔!'' زینت سے لمحاتی صبر بھی نہ ہو سکا۔''بتاؤ بھی۔!''

''بتا تو رہا ہو بابا، سانس تو لینے دیا کرو۔!'' وہ مصنوعی غصے سے بولا۔''وہاں ملک ریاض بیٹھا ہوا تھا۔بڑا مشہور صنعت کار ہے۔نیا نیا سیاست میں داخل ہوا ہے۔میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ہم تو چہرے ہی پڑھتے ہیں نا۔'' وہ ہنسا۔پھر بات کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے بولا۔''وہاں بیٹھے بیٹھے تعارف ہو گیا۔مجھے کہنے لگا کہ اگر سچ مچ پیر ہیں تو کوئی فوری کرامت دکھائیں کہ میں مان جاؤں۔!''

میں نے پوچھا۔''کیا چاہتے ہیں۔؟''

کہنے لگا۔''پیر جہانگیر شاہ ہمدانی مان جائیں۔جو کہہ رہا ہوں وہ کر دیں تو آپ کو مان جاؤں گا۔!''

میں نے پوچھا۔''اگر یہ ہو گیا تو کیا کرو گے۔؟''

وہ بولا۔''پھر دیکھئے گا کہ میں آپ کے لئے کیا کرتا ہوں۔؟''

میں نے اسی لمحے ایک تعویز لکھا اس کی ماں کے نام کے ساتھ اور کہا کہ اس کو کس کے مٹھی میں دبا لے الٹے ہاتھ کی، جب تک جہانگیر شاہ مانے نہیں اس کو خوب بھینچ کر رکھنا۔وہ تعویز لیکر اندر چلا گیا۔واپس آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔کہنے لگا۔''میں جلدی میں ہوں یہ میرا کارڈ ہے لے لیں۔اس پر میرے گھر کا پتا لکھا ہے۔میں گھر پر کسی سے نہیں ملتا مگر آپ رات میں آئیں کھانے پر باتیں کریں گے۔!''

''واہ۔!تمہارا تعویز پیر جہانگیر شاہ ہمدانی پر چل گیا۔؟'' زینت نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں پڑھ لکھ کر جاہلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔''سارا انسانی نفسیات کا کھیل ہے۔!''

''کیا مطلب۔؟'' زینت نے پوچھا۔

''ارے بھلی لوکئے۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔''پیر جہانگیر شاہ ہمدانی ان لوگوں میں سے ہیں۔جو کسی کو مفت میں اپنا بخار بھی نہ دیں۔ملک ریاض جیسا ارب پتی صنعت کار بندہ، جب پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے پاس آئے گا تو وہ پھر خالی ہاتھ تو نہ آئے گا۔اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا لفافہ تھا۔مجھے اس میں پانچ ہزار کے نوٹوں کی جھلک نظر آ گئی تھی۔کروڑ سے کم تو نہیں ہونگے۔بعد میں اس نے بتایا بھی کہ اس نے پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کو دو کروڑ روپے کی نذر دی ہے۔!''

''دو کروڑ روپے کی نذر۔!'' زینت کی آنکھیں پھٹ پڑنے کو ہو گئیں۔''اس کے سامنے تمہارے پانچ لاکھ کی کیا

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اوقات ہوگی۔؟“

”وہی جو دو کروڑ کی ہوتی ہے زینت بیگم۔نوٹ کی مالیت یکساں ہوتی ہے۔پانچ ہزار کی ڈھیری میں دس کا نوٹ دس کا ہی ہوتا ہے۔نوروپے کا نہیں ہو جاتا۔“

”صحیح کہہ رہے ہو۔“ زینت نے آہستگی سے کہا۔

”شام کو میں ملک ریاض کی کوٹھی پہنچا۔وہ بڑے تپاک سے ملا۔بنا تمہید بولا۔پیر جی! اگر میرا ایک کام کر دو تو جو کہو گے کروں گا۔مگر شرط یہ ہے کہ کل دن کے بارہ بجے سے پہلے ہو جائے۔“

میں نے کہا۔”پہلے بتایئے پھر کچھ جواب دوں گا۔!“

وہ بولا۔”رائما کو جانتے ہو۔!“

میں نے کہا۔”کون نہیں جانتا اس پری چہرہ، غارت گر ایمان کو، کیا ہوا اس کو، اس پر جن آتے ہیں یا بھوت۔اب کوئی نہیں، ہم آئیں گے۔“

وہ بولا۔”ہم نہیں میں آؤں گا۔اگر وہ میرے ساتھ ہفتے بھر کے یو کے ٹرپ کو مان جائے تو میں تمہیں مان جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔”جو صبح مانا تھا وہ بھول گئے۔“

”صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔میں تو صبح بھی نہیں بھولا تھا۔اب شام بھی نہیں بھولا۔“ وہ ہنسا۔کہنے لگا۔”بڑی تیز و طرار ہے قابو میں نہیں آتی۔کہتی ہے میں ایسی ویسی نہیں۔باعزت ہوں۔ایسی ہی شرم والی ہے تو گھر میں بیٹھے، اسکرین پر کاہے کو جلوے دکھاتی ہے۔“

میں نے کہا۔”دل جلانا چھوڑ دو! تمہارا یہ کام تو چٹکیوں میں ہو جائے گا۔مگر بیچ میں اس نامہ بر کو کیا ملے گا۔؟“

کہنے لگا۔”کیا چاہتے ہو۔؟“

میں نے بتایا۔”مجھے درگاہ حضرت میاں کے لئے ایک کروڑ روپے چاہیے ہیں۔تم میرا کام کرو، میں تمہارا کام کروں گا۔“

وہ بولا۔”اگر نہ ہوا تو۔؟“

میں نے کہا۔”گردن اتار لینا۔مگر میری ایک شرط ہے نقد مال لوں گا۔فون تو وہ آج ہی کر دے گی۔اس کا پتا دو، اس کے لئے کوئی تحفہ شحفہ ہے تو مجھے دو، اپنی گاڑی میں کوچۂ جاناں کی طرف بھیجو۔جو دراصل جائے ملامت ہے۔مگر سمجھ داروں کے لئے۔عاشقوں اور پاگلوں کے لئے جائے خرچ۔“

وہ ہنسا اور اٹھا۔دراز سے ایک ڈبہ نکالا۔اور بولا۔”یہ ہیروں کا ایک سیٹ ہے۔اس کی سالگرہ پر دینے کے لئے لایا تھا۔اگر وہ ساتھ چلنے پر راضی ہو جاتی۔“

میں نے کہا۔”لاؤ میں راضی کر دیتا ہوں۔مگر میرے پیسے۔؟“

وہ بولا۔”یہ بھی لو!“ اس نے ایک دراز کھولی۔اس میں سے پانچ ہزار کے نوٹوں کی دس گڈیاں نکال کے مجھے دیں۔اور کہا”جاؤ۔!“ اس کے ساتھ ہی بیل بجا کر ایک نحس صورت آدمی کو بلایا۔اور بولا۔”اس کی منحنی قد و قامت پر نہ جانا۔اس کا نشانہ بڑا اچھا ہے۔پرندے کو ایک گولی سے چھیدتا ہے۔تم تو اس کے ساتھ ہی ہو گے۔فراڈ کرو گے تو پھر یاد رکھنا۔کھوپڑی میں تازہ ہوا کے لئے سوراخ ہو جائے گا۔خواہ تمہیں آکسیجن کی ضرورت بھی نہ رہے۔ویسے بھی پیر جی! مردے آکسیجن لیتے ہیں کیا۔؟“

میں نے کہا۔”ملک مجھے ان چیزوں سے نہ ڈراؤ۔ہم بے ایمانی پر آجائیں تو یہی پیسہ تم روزانہ صبح و شام حاضر ہو کر ہمیں نذر میں پیش کرو۔مگر ہم لات مارتے ہیں اس پر۔بلایا تم نے تھا۔ہم بغیر بلائے نہیں جاتے۔کام تم نے دیکھ لیا۔اب کام کراؤ گے تو پیسے پورے ہوں گے ورنہ یہ طمنچہ اور یہ چمچہ دونوں ہی جہنم رسید کر دوں گا گھر بیٹھے بیٹھے۔ایسی مٹی پڑھ کر

پھونکوں گا کہ لاکھ کا خاک ہو جائے گا۔ ساری عمر کے لئے کوڑھی ہو جاؤ گے۔ پیروں سے الجھ لینا، مگر عاملوں کے منہ نہ لگنا۔ پیر تو بس دعا کرتے ہیں۔ ہم عمل کرتے ہیں۔ دل میں بھی آگ لگاتے ہیں اور پانی میں بھی۔ تم جیسے نوکری کرتے ہیں ہماری۔" میں نے اس کے ہار کے ڈبے پر تھوکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ملک ریاض سے پہلے اس کا موت کا ہرکارہ میرے قدموں میں گر پڑا۔ کہنے لگا۔ "پیر جی غصہ تھوک دیں۔ صاحب کو مذاق کی عادت ہے۔ معاف کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "مذاق تو ہم برداشت کر لیتے ہیں مگر توہین نہیں۔ اس میں سراسر توہین ہے ہماری۔"

ملک ریاض نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور بولا "یار پیر جی تم سے دل مل گیا ہے۔ اس لئے ذرا مذاق کر لیا۔ تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ چلو غصہ تھوک دو۔"

میں نے کہا۔ "چلو غصہ تھوکا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے بیش قیمت قالین پر تھوکا۔ اور کنکھیوں سے اس کو دیکھا۔ اس نے برا تو منایا مگر بولا نہیں ڈر گیا تھا۔

"وہ تم سے ڈر گیا تھا۔؟" زینت نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔!" پیر ستارہ شناس نے کہا۔ "غلط کام کرنے والا ہر بندہ ڈرتا ہے۔ یہ ارب پتی سیدھے سبھاؤ نہیں بنتے۔ کچلتے ہوئے، پیستے ہوئے، طاقتور، روڈ رولر کی طرح آگے بڑھتے ہیں، کام نکالنے کے لئے۔ طاقت کو منوانے کیلئے، لوگوں کو مار دینا ان کو مسئلہ نہیں ہوتا۔ مسلسل کام، ضمیر کی کچک اور خوف سے اعصابی دباؤ میں آ جاتے ہیں۔ اور پھر کوئی ان سے مرعوب نہ ہو تو یہ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ وہ تو ملک ریاض کی وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ وہاں تو بولنا ہی بہادری تھی زینت بیگم۔ سارا کھیل اعصاب کا ہوتا ہے۔ جس کے اعصاب مضبوط ہوتے ہیں وہ جیت لیتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔؟" زینت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اور اس کی طرف دیکھا۔

"پھر ہوا یوں کہ میں رائما کے گھر پہنچا۔ وہ مجھے پہلے سے جانتی ہے۔ وہ ہے نا اخبار نویس ابراہیم نوید۔ اس نے ملوایا تھا ایک بار مجھ سے۔ پانچ سات برس پہلے کی بات ہے۔ پھر اس کی فلم کا مسئلہ تھا۔ پھر اس کے ایک امریکی عشق کا مسئلہ تھا۔ بیچ میں ہم دو چار بار ملے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہو گئی۔ چائے پی کر میں نے پوچھا کہ وہ ملک ریاض سے کیوں ناراض ہے۔ وہ بولی۔

"میں کیوں ناراض رہنے لگی۔ مگر آدمی وہ گھٹیا ہے۔ دینے کے بعد چیزیں گنتا ہے۔ مجھے رخشی نے بتایا ہے۔" اس نے ایک اور مشہور و معروف ماڈل کا نام لیا۔ "پھر ایسے گھٹیا آدمی سے دوستی کا کیا فائدہ؟۔ کیوں پیر جی!"

مگر میں نے اس کو فائدے بتائے اور یہ بھی بتایا کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔

وہ بولی "وہ اتنا الو ہے۔؟"

میں نے کہا "وہ اس سے بڑا الو ہے۔ مگر مشرق میں ہے۔ اس لئے بے پاس ہے۔ اگر مغرب میں ہوتا تو عقل و دانش کا نشان ہوتا۔ چلو میری مانو اس کو فون کر دو۔ یہ ہیروں کا ہار رکھ لو۔ یہ فرہاد جیولرز والوں کا ہے۔ ان کی معمولی چیزوں کی ابتداء بھی پانچ لاکھ سے ہوتی ہے۔ کم از کم یہ سیٹ چالیس پچاس لاکھ کا تو ہو گا۔ چلو اس سے رابطہ کر دیا آدمی گھٹیا، خسیس اور کمینہ ہے تو کیا ہوا۔ چیزیں تو گھٹیا نہیں؟۔"

"ٹھیک کہتے ہیں پیر جی!۔" وہ بولی اور اپنے بلیک بیری پر اس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولی۔ "ذرا جلاؤں۔ ستاؤں؟"

میں نے کہا۔ "جو چاہے تمہارا حسن کرشمہ ساز کرے۔"

وہ بولی۔ "ہم ناز و ادا کی کھاتے ہیں۔ آپ باتیں بناتے ہیں اور حالِ دل اگلوا لیتے ہیں۔"

''ہیلو۔۔!'' دوسری طرف سے سلسلہ بحال ہوتے ہی وہ بولی۔۔''یہ کیا کیا آپ نے۔کس کو بھیج دیا پتا نہیں انہوں نے کیا کیا، میرے دل میں ایک آگ سی جل اٹھی ہے۔'' وہ ہنسی دوسری طرف سے کوئی بات سن کر۔

''نہیں جی! ہم تو پیر جی کے تابع ہیں۔ وہ تو کہیں ہم گٹر میں چھلانگ لگا دیں جی۔!'' اس نے جان بوجھ کر دریا یا آگ کے بجائے گٹر کا لفظ استعمال کیا۔ دوسری طرف سے قہقہہ آیا۔ رائمہ نے اسپیکر آن کر دیا۔

''تو۔۔کب چل رہی ہو میرے ساتھ۔؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تو کئی ہفتے لگیں گے۔''

''کیوں۔؟'' وہ بے تاب ہو گیا۔

''اصل میں آپ کو تو پتا ہی ہے۔ آجکل فلم تو بند ہو گئی ہے۔صرف انڈسٹری چل رہی ہے۔ چاروں طرف مندا ہے۔ اچھے دنوں میں ایک کوٹھی کا سودا کیا تھا ڈھائی کروڑ میں۔ ایک کروڑ دے دیا تھا اب ڈیڑھ کروڑ کے لئے ذلیل ہوتی پھر رہی ہوں۔ غنی صاحب سے کہا تو انہوں نے حامی بھر لی۔ مگر اب پندرہ دن سے ملک سے باہر ہیں۔'' اس نے ایک مشہور انڈسٹریلسٹ کا نام لیا۔

''جہنم میں ڈالو اس کو۔'' ملک ریاض نے کہا۔

''چلیں جہنم میں ڈال دیا۔ مگر کوٹھی کہاں ڈالوں۔؟''

''ارے ہم کیا مر گئے ہیں۔ میں تمہیں ابھی چیک بھجوا دیتا ہوں ڈیڑھ کروڑ کا۔۔''

''لو جی! ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔ پھر ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں گے۔ مگر کھائیں گے کیا؟۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ گھومنے چلی جاؤں۔ یہ پیسہ کوٹھی میں لگا دوں تو پھر پیٹ کی دوزخ کس سے بھروں۔ کمرشلز سے تو بجلی کا بل بھی نہیں نکلتا۔''

''اچھا۔!'' ملک ریاض نے کہا۔

''چھوڑیں ملک جی! یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ ہم غریبوں کو کون منہ لگاتا ہے۔'' رائمہ نے بیک وقت دوطرفہ حملہ کیا۔ ایک طرف اس کو اپنے مہنگے ہونے کا احساس دلایا۔ دوسری طرف اس کی انا پر چوٹ لگائی۔ وار کارگر رہا۔

وہ بولا۔''پریشان نہ ہو۔ بس ابھی کچھ کرتا ہوں۔''

تھوڑی دیر میں اس کا ایک ملازم دو چیک لے آیا۔ ایک ڈیڑھ کروڑ کا۔ ایک، ایک کروڑ کا۔ وہ مسکرائی۔'' دیکھا پیر جی! ہم لوگ کیسی قیامت اٹھاتے ہیں۔ ستم ڈھاتے ہیں دلوں پر، بندہ کہیں کا نہ رہے۔''

''مگر اس وجۂ قیامت، سبب ستم کو تو نہ بھولو۔ بیٹھے بٹھائے تین کروڑ کا فائدہ دلا دیا۔''

''تین کا یا ڈھائی کا۔!'' وہ بولی۔

''وہ ہار بھول گئی ہو کیا۔!'' میں نے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔''اب تم ہمیں کیا نذر کرو گی!'' میں نے پوچھا۔

''ملک ریاض کو نچوڑا نہیں؟'' وہ ہنسی اور بولی۔'' پیر، وکیل اور طوائف جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کا کچھ نہیں رہتا۔''

میں نے جواب دیا۔''صحیح کہتی ہو مگر اپنے الائنس کے ہر رکن کا خیال رکھنا چاہیے۔''

میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا۔''بہت خوب پیر جی! اچھا الائنس بنایا۔ اگر یہ الائنس ووٹ مانگنے جائے تو کیا ووٹ نہیں ملے گا؟۔''

میں نے کہا۔''ووٹ تو نہیں! البتہ ناکام عاشقوں، مقدمہ ہارنیوالے موکلوں اور ہمارے مریدوں کی آہیں معہ جوتے پھٹکار ہمیں لے ڈوبیں گی۔''

وہ بولی۔''میں ایک انکشاف کر رہی ہوں۔ جب تک معاشرہ ہم حقیقتوں کو قبول نہیں کرے گا۔ چوری چھپے خون دیتا

رہے گا۔ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''
میں نے کہا۔'' جو جیسے چل رہا ہے اس کو ویسا ہی چلنے دو۔ طوفان کے بعد جب گرد و غبار بیٹھتا ہے۔ تو چیزیں آہستہ آہستہ اپنے مقام پر خود ہی آ جاتی ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت بلاوجہ مشقت میں پڑنے کی، اس قوم کو مہذب بنانے کی!۔''
دفعتاً زینت کے حلق سے قہقہے کا فوارہ چھوٹ گیا۔
''کیا ہوا۔؟'' پیر ستارہ شناس نے پوچھا۔
''میں یہ سوچ سوچ کر ہنس رہی ہوں کہ تم جیسے لوگ ہماری قوم کو مہذب بنانے کا بیڑہ اٹھائیں گے؟۔''
''حالات اپنے تو بہتر بنانے کا بیڑہ اٹھائیں گے اور بنانا بھی شروع کر دیا۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔'' ذرا الماری میں سر ڈال کر تو دیکھو۔!''
''وہاں کیا ہے۔؟'' زینت نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔
''اوکھلی میں سر ڈالتے ہی موسلوں کی بھار نہیں ہونے کی۔ نہ ہی اندر سانپ بچھو ہیں جو تمہیں ڈس لیں گے۔''
''ارے میں ڈرتی نہیں ہو جو تم ساز ہر سہہ لئے اس کو سانپ بچھو کیا کہیں۔؟'' وہ ہنسی اور اٹھ کر الماری کے خانے کے اندر جھانکا۔ پھر اسے کچھ نظر نہیں آیا تو پھر کپڑے ہٹا کر اندر دیکھا۔
''یہ۔۔۔یہ۔۔۔!'' وہ جیسے چیخی۔
''آہستہ بولو۔۔۔ کیوں چیخ و پکار کر رہی ہو۔؟'' پیر ستارہ شناس نے اسے ہلکی آواز میں ڈانٹا۔
''یہ۔۔۔یہ۔۔۔سب جو تم کہہ رہے تھے واقعی سچ تھا۔؟'' زینت نوٹوں کی گڈیوں کو سلیقے سے سجا دیکھ کر بولی۔
''الو کی پٹھی۔!'' پیر ستارہ شناس کو سخت تاسف ہوا۔'' تو کیا میں اتنی دیر سے بکواس کر رہا تھا۔ ہذیان بک رہا تھا۔ کیا سمجھا تم نے۔؟''
زینت بس اندر ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈیوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ پیر ستارہ شناس بھی کچھ نہ بولا تھا۔ جب وہ نوٹوں کی گڈیوں کو لیکر گھر آیا تھا تو اس پر بھی شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ قسمت اس پر مہربان ہو رہی تھی۔ ابھی تو اس نے اس چیک کے متعلق نہیں بتایا تھا جو ملک ریاض نے اسے دیا تھا پچاس لاکھ کا چیک۔ وہ زینت کو آہستہ آہستہ بتانا چاہتا تھا تا کہ زینت ہر بات کو برداشت کرتی جائے۔

☆☆☆

ساری حویلی بھری ہوئی تھی۔ دور، دور سے وزیر، مشیر، سیاستدان، صنعت کار، دوست، ملنے والے تعزیت کے لئے آ رہے تھے اور سب ہی بے حد دکھ سے ان کے اس غم میں شریک ہو رہے تھے۔ موت انسان کو چوکنا کر دیتی ہے۔ بدل دیتی ہے۔ تعلق، محبت، رشتے، اعتبار، ہر چیز بدل دیتی ہے۔ خود بدلنے والے انسان کو بھی یقین نہیں آتا کہ وہ کیوں بدل رہا ہے۔ مگر جن حقیقتوں کے باعث وہ بدلتا ہے۔ وہ اتنی اٹل ہوتی ہیں کہ انہیں جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔
شاہ ہارون گیلانی بھائی کی موت کے چند ہی گھنٹوں کے بعد بدل گئے تھے۔ اور اس لمحے سے تو وہ بالکل ہی بدل گئے تھے جب انہوں نے اظہر صدیقی کے ساتھ ڈیل کی تھی۔ طاقت، اختیار کی سب سے اعلیٰ ترین صورت عہدہ ہے۔ اور عہدہ بھی وہ حرف آخر کہ جس کے بعد کوئی حد و حساب نہ رہے۔ ان کی نظر میں پچاس کروڑ ایسے ہی تھے جیسے کہ پچاس لاکھ۔ انہیں ہر ماہ پیسہ کہاں سے، کیا کیا، کتنا آتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ پاکستان میں ان کی کئی معروف غیر ملکی برانڈز کی چین میں سرمایہ کاری تھی۔ جو ہر ماہ اتنے انڈے بچے دیتی تھی کہ منافع ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ پھر پاکستان سے باہر دوبئی اور سعودی عرب میں انہوں نے سرمایہ کاری کی تھی۔ جرمنی میں ان کی بہت جائیداد تھی۔ اور سب کرائے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس طرح امریکا میں انہوں نے کرایہ داری میں ہی سرمایہ کاری کی تھی۔ وہ بنکوں کی نیلام ہونے والی سفید پوش لوگوں کی پراپرٹی خرید لیتے تھے جو انہیں سنبھالنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ پھر ان عمارتوں کو مناسب سرمایہ کاری کر کے ہوٹل یا پھر ہوسٹلز میں

تبدیل کر دیتے تھے۔ یوں چند سالوں میں بلڈنگ اصل لوٹا دیتی تھی اور وہ نفع میں بلڈنگ کے مالک بھی رہتے تھے۔ ماہانہ کہیں سے پونڈز، کہیں سے یورو، کہیں سے درہم، کہیں سے ریال اور کہیں سے ڈالر آ رہے تھے۔ اور یہ رقم بھی شاہ ہارون گیلانی کے پاکستان اکاؤنٹس کے بجائے سوئس بنکوں میں، یا امریکی بنکوں میں جمع ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے ایک ایسی سرمایہ کاری بھی کی تھی۔ جس کا خاص خاص لوگوں کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا۔ انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں ایک فرم قائم کی تھی۔ جس کے زیر انتظام وہ ایک بنک کو ڈیل کرتے تھے۔ سوئس میں یہ بنک اچھے درجے میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں پاکستان کے نامور صنعت کاروں، اعلیٰ افسران اور زمین داروں کے اکاؤنٹس تھے۔ انکے ان اکاؤنٹس کو لینے کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ سوئٹزرلینڈ سے ایک نمائندہ خاتون ٹورسٹ بن کر آتی وہ خاموشی سے ان کو کچھ نام فراہم کر دیتے۔ وہ ان لوگوں سے مل لیتی اور اکاؤنٹس مل جاتے۔ پاکستانی اشرافیہ گوری چمڑی سے ویسے ہی مرعوب ہے۔ جب وہ رازداری سے انہیں بتاتی کہ وہ کون ہے اور ان کے اکاؤنٹس ہولڈرز میں کیسی کیسی شخصیات شامل ہیں تو وہ اعتماد کر لیتے۔ ہر ماہ خاموشی سے اربوں روپیہ ڈالر میں تبدیل ہو کر بیرون ملک غائب ہو جاتا۔ ارباب اختیار کبھی اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ پاکستان میں کھلی مارکیٹ میں کثرت سے ڈالر خریدنے والے لوگ کون ہیں۔ اور کیوں خرید رہے ہیں۔ وہ اس لئے بھی توجہ نہیں دیتے تھے کہ وہ خود اس ریکٹ کا حصہ تھے۔ بڑے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے سرخیل اس معاملے میں شامل تھے۔

دولت چاروں طرف سے آ رہی تھی اور بھنور کی طرح شاہ ہارون گیلانی کے گرداب میں ڈوب رہی تھی۔ شاہ ہارون گیلانی اب وزارت عظمیٰ کے امیدوار تھے۔ ان کی پارٹی میں شامل ہونے کے پہلے ہی دن سے خواہش تھی کہ وہ اس دوڑ میں نمبرون ہو نگے۔ لیکن کمال کا ضبط رکھتے تھے۔ کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی، کئی بار سیاسی معاملات میں اتار چڑھاؤ آیا۔ پارٹی پر شدید برا وقت بھی آیا۔ مگر ان کی طرف سے یہ بات کبھی سامنے نہیں آئی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پارٹی سربراہ سے انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ خدمت کے لئے ہیں۔ اگر وہ کہیں گے تو وہ پبلک الیکشن تو کیا پارٹی الیکشن میں بھی حصہ نہیں لیں گے۔ انہیں صرف اپنے لوگوں سے پیار ہے۔ اس حکمت عملی نے انہیں پارٹی ورکرز میں بہت احترام دیا تھا۔ تقریباً پچیس برسوں میں کوئی پارٹی رکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شاہ ہارون گیلانی کو کسی بڑے سے بڑے عہدے کا معمولی سا بھی لالچ ہے۔ مگر ان کی دولت، ان کا مقام، علاقے میں ان کی اہمیت، ان کے خاندان کی سیاسی قوت ایسی تھی کہ وہ کبھی بھی نظر انداز کیئے نہ جا سکتے تھے۔ وہ اپنی خواہش دوسروں کے ذریعے اتنے سہل طریقے سے منظر عام پر لاتے کہ ہر شخص اس خواہش کو اپنی خواہش جان کر پورا کرنے پر کمربستہ ہو جاتا۔

اور اب تو عوامی ہمدردی کا ایک سیلاب ان کے لئے اُمڈ رہا تھا۔ انہوں نے اس ملک کی خاطر اپنے بھائی کی جان قربان کی تھی۔ اپنا سگا بھتیجا، اپنا ہونے والا داماد داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور پھر ملک کا سب سے بڑا نیوز چینل آئندہ وزیراعظم کے طور پر ان کو پیش کر رہا تھا۔ تمام تجزیئے، تمام تبصرے غیر محسوس طور پر ان کی شخصیت کو اُبھار رہے تھے۔ ان کی پارٹی کے سربراہ کا انہیں کئی بار فون آ چکا تھا۔ وہ ان سے تعزیت کے لئے آنا چاہتے تھے مگر وہ سیکورٹی کا بہانہ بنا کر انہیں روک رہے تھے۔ وزیراعظم کا فون انہیں آیا وہ بھی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔

''نہیں سر!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ آپ کی جان ہم سب سے زیادہ قیمتی ہے دہشت گردوں، تخریب کاروں، خودکش حملہ آوروں کا کیا پتہ کہاں سے نمودار ہو جائیں۔ اندھی گولی کھانے والے کا نام تو جانتی ہے مگر چلانے والے کو کب ظاہر کرتی ہے۔ میری جان آپ پر قربان۔''

انہوں نے بے پناہ تسلی اور دلاسوں کے ساتھ انہیں آنے سے روک دیا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔ لیکن میں حالات ٹھیک ہوتے ہی آنا چاہوں گا۔'' وزیراعظم نے کہا۔

''بالکل سر! یہ آپ کا گھر، آپ کا ہی علاقہ ہے۔ بھلا میری جرأت کہ میں آپ کے استقبال سے انکاری ہوں۔'' ان

کے لہجے میں مر جانے والا خلوص جھلک رہا تھا۔ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وزیر اعظم نے فاتحانہ انداز میں پارٹی سربراہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہے تھے۔ آپ نے سنا ہارون گیلانی کے انداز میں کس قدر نرمی، انکساری اور جانثاری موجود تھی۔ آج تک ان کی طرف سے کبھی کسی عہدے کا مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ کیا یہ ان کی وفاداری اور لاغرضی کا ثبوت نہیں۔۔؟''

''بات تو ٹھیک ہے! لیکن جو کچھ میڈیا کہہ رہا ہے اس کا پس منظر ضرور کچھ نہ کچھ ہے۔'' پارٹی سربراہ نے جواب دیا۔ ہماری انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق گذشتہ ایک ہفتے سے ہارون گیلانی کی کسی میڈیا پرسن، اینکر پرسن، یا میڈیا اونر سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ گذشتہ ایک ہفتے میں ان کی کوئی نئی میڈیا بریفنگ بھی سامنے نہیں آئی ہے۔ میڈیا یونہی چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا رہا ہے۔''

''مانا کہ تم بڑے اچھے سیاسی کارکن رہے ہو۔ لیکن ابھی سیاست کے جوڑ توڑ سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ میڈیا کوئی بھی اینگل بلاوجہ تبدیل نہیں کرتا۔ بہرحال تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ سردار حیات اللہ بھی سخت ناراض ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بے پر کی کون اڑا رہا ہے۔ کیا پارٹی پر ہماری گرفت ختم ہوتی جا رہی ہے۔'' پارٹی سربراہ نے بڑے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور سامنے میز پر اپنے پاؤں پھیلا دیئے۔

شاہ ہارون گیلانی نے اپنے میڈیا ایڈوائزر کی طرف غور سے دیکھا۔ مسکرائے اور پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں، میں پارٹی سربراہ اور وزیر اعظم کو یہاں آنے سے کیوں روک رہا ہوں۔۔؟''

''سیکورٹی کی وجہ سے۔!'' اس نے جواب دیا۔

''سیکورٹی کا کیا مطلب ہے۔؟''

''ان کی حفاظت کا معاملہ۔''

''اور وہ رک گئے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ''جو اپنی سیکورٹی کا بہت زیادہ خیال کرے اور حفاظتی اقدامات کو سب سے اولیت دے وہ کون ہوتا ہے۔؟''

''کمال کر دیا سر۔!'' احمد اورنگ زیب اٹھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''جو صرف حفاظتی اقدامات پر غور کرتا رہے۔ اس کا ایمان تو کمزور ہوتا ہی ہے۔ عرف عام میں اس کو ڈرپوک بھی کہتے ہیں۔ آپ نے اپنی حکمت عملی سے پارٹی سربراہ اور وزیر اعظم کو اخلاقی اعتبار سے بدتر ثابت کر دیا۔''

''اور یہ بات کس کو بتانی چاہیے۔!'' شاہ ہارون گیلانی کو اپنا یہ بچہ بہت پسند تھا۔

ان کی بات کی تہہ تک اتر کر، سمجھ کر ان سے آگے کے معاملات کو سنبھالنے والا۔ شاہ ہارون گیلانی صرف لائن دیتے تھے۔ باقی کام وہ خود سنبھال لیتا تھا۔ ذہین اور فطین احمد اورنگ زیب اٹھا اور ٹہلتا ہوا حویلی کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔ جہاں کام کرنے والوں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ خالی پڑا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا۔ سم بدلی اور اظہر صدیقی کے نمبر پش کرنے لگا۔

☆☆☆

''ہیلو۔۔ اسلام علیکم۔!'' احمد اورنگ زیب نے سلسلہ ملتے ہی کہا۔

''وعلیکم السلام۔!'' اظہر صدیقی نے ایک لحظے میں اسکی آواز پہچان لی۔ ''کہو کیا خبر ہے۔؟''

''پارٹی سربراہ اور وزیر اعظم صاحب سیکورٹی کے مسائل کے باعث تعزیت کے لئے نہیں آ پا رہے ہیں۔ اپنے اس ساتھی اور پارٹی راہ نما کے پاس، جو ان کے لئے فنانس کا انتظام بھی کرتا ہے۔ اور جس کے بھائی نے اپنی جان کی قربانی بھی دی ہے۔ ہم بے خوف و خطر علاقے میں موجود ہیں۔ لوگوں سے مل رہے ہیں۔ ملاقاتیں چل رہی ہیں۔ لوگ آ جا رہے ہیں۔ مگر ہماری اعلیٰ قیادت بزدلوں کی طرح اپنے مرکز سے باہر نہیں نکل رہی ہے۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔!'' اظہر صدیقی نے کہا۔''بہت اچھی لائن ہے۔ آج ہی سے دیکھ لینا۔ لائیو پروگرامز کا انداز ہی بدل جائے گا۔''

''شکریہ۔۔!'' احمد اورنگ زیب نے بہت خلوص سے کہا اور فون بند کر دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ اکثر اس جگہ کو فون کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ حد سے زیادہ محتاط تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس پارٹی کا ایک خوف زدہ چہرہ سامنے آ رہا تھا۔ لوگوں کو ایک بے خوف، مخلص رہنما کی ضرورت تھی۔ اور وہ انہیں سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی۔ ایسا شخص جس نے کبھی کسی عہدے کی آرزو ہی نہ کی تھی۔

☆☆☆

عبداللہ شاہ گیلانی کو آج پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ سچ مچ تنہا ہو گیا ہے۔ اتنا اکیلا، اداس، اور بے آسرا تو اس نے اس وقت بھی خود کو محسوس نہ کیا تھا۔ جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی، مگر حقیقت میں وہ باپ سے بہت قریب تھا اور اسی قربت نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اور آج وہ مضبوط سہارا بھی نہیں رہا تھا کہ جس سے وہ اپنا حالِ دل کہہ سکتا۔ دونوں بہنیں آ گئی تھیں۔ ان کے بچے تھے، شوہر تھے مگر صرف ایک شاہ سکندر گیلانی کے نا ہونے سے سب خالی، بے روح لگ رہا تھا۔

اس کے اندر کی دنیا تہس نہس ہو گئی تھی۔ اعتبار ٹوٹ گیا تھا۔ اعتبار کا پل صراط کتنا نازک، کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اس کو آج معلوم ہو رہا تھا۔ رشتے بے وفا کیسے ہوتے ہیں۔؟ خون پانی کیسے ہوتا ہے۔؟ اس کو اب معلوم ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں جب اس کو اس مکروہ، کرب ناک، شرم ناک حقیقت کا انکشاف ہوا تو وہ جیسے سن سا رہ گیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ کاش اس کو پاپا کا فون ملا ہی نہ ہوتا۔ مگر ہمارے کاش سے، ہمارے خوف و اندیشے سے، حقائق نہیں بدلتے۔ مگر جب اس نے حقائق کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ چیزوں کو ایک ایک کر کے پرکھا۔ تو پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ شاہ کو شہ مات دینے کا۔ رنج کا خوگر ہو تو مٹ جاتا ہے رنج۔ سیاسی خاندان کے خون میں رچی سیاست خود بخود یوں تیر کر اوپر آ گئی جیسے ضرورت پڑنے پر شارک سانس لینے سطح سمندر پر ابھر آتی ہے۔ سب سے پہلے مجھے خود کو مرتب کرنا چاہئے۔ اپنے ٹکڑے جوڑنے چاہئیں۔ اس نے اپنی زندگی کا پہلا اور تنہا مضبوط فیصلہ کیا۔ پھر اس کی مشکلیں آسان ہونے لگیں۔ شاہ سکندر گیلانی کے دفن کے ٹھیک دوسرے دن اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ تمام بدلے لینے کا۔ احتساب کرنے کا۔ مگر اس کے باوجود وہ بے سکون تھا۔ مجھے تھوڑا سا سکون چاہیے۔ وہ مجھے اس ماحول سے باہر ہی مل سکتا ہے۔ اس نے سوچا اور پھر ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ فرحان یعقوب سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست سے جو اس کے ساتھ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹا تھا۔

وہ باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ بالا آ گیا۔

''چھوٹے سرکار کہاں جا رہے ہیں۔؟'' اس نے آتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں ذرا شہر جا رہا تھا۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''اکیلے ہی جا رہے ہیں ان حالات میں۔!'' بالے نے تشویش ظاہر کی۔

''اب تو اکیلے ہی ہیں۔۔!''

''اللہ نہ کرے کہ جی آپ اکیلے ہوں۔ ہم سب ہیں آپ کے جانثار، آپ کے خادم، آپ کے غلام۔۔!''

''اچھا۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی مسکرایا۔ ایک زخم آلود مسکراہٹ۔

''آپ بیٹھیں۔۔۔ میں چلاتا ہوں گاڑی۔!'' بالے نے ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ شاہ نے چابی اسے پکڑا دی۔ اس نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا۔ عبداللہ شاہ بیٹھ گیا۔ وہ دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ ان کا رخ شہر کی طرف تھا۔

''کسی سے ملنے جا رہے ہیں یا یونہی گھومیں پھریں گے۔!'' بالے نے سرسری انداز میں پوچھا۔
''فرحان یعقوب کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ آیا تھا میرے ساتھ ہی واپس، اس کا فون آیا تھا۔ وہ آنا چاہ رہا تھا۔ پر میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا ذرا باہر نکل کے خود مل آؤں۔!'' عبداللہ شاہ نے بتایا۔
''آپ بہت نرم دل ہو۔ بہت پیارے۔!'' بالے نے کہا۔ ''بہت چھوٹے تھے آپ تب بھی آپ سارے بچوں میں الگ تھے۔ نرم سے، دھیمے سے، کبھی لڑائی نہیں، غصہ نہیں۔!''
''تمہیں یاد ہے میرا بچپن۔!'' عبداللہ شاہ کی دلچسپی عود کر آئی۔ اسے اچھا لگا کہ کوئی پاپا کے علاوہ بھی اسکے بچپن کا گواہ ہے۔
''کیوں نہیں یاد ہوتا جی۔!'' بالا پہلی بار ہنسا ''آپ تو اتنے پیارے سے، موہنے سے تھے کہ بے ساختہ آپ پر پیار آ جاتا تھا۔ بڑے شاہ جی بس آپ کے ساتھ بچہ بنے رہتے تھے۔ سارے بچوں میں آپ سب سے مختلف تھے۔ پھر جب ایک بار آپ سیڑھیوں سے پھسل گئے تھے۔ تو اس وقت میں اور بڑے شاہ جی آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ میرے لاکھ کہنے کے باوجود بڑے شاہ جی نے آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی گود سے نہیں اتارا تھا۔ وہ تو دیوانے تھے آپ کے۔'' بالے کی آنکھوں میں بچپن کے مناظر گھومنے لگے۔
عبداللہ شاہ گیلانی کا حلق نمکین ہو گیا۔
''جب آپ پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ تب وہ آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ بہت دیر تک آپ کے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ آپ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔!''
''تمہیں کیوں اچھا لگتا تھا۔؟'' عبداللہ شاہ نے پوچھا۔
''مجھے تو جی اپنے ماں، باپ نہیں یاد۔ ہوش سنبھالا تو آپ ہی لوگوں کو، بڑے شاہ جی کو، شاہ جی کو ہی اپنا سب کچھ پایا۔ تعلیم بھی آپ ہی لوگوں کے سکول سے پائی۔ پر بندے کے دل میں پیاس تو ہوتی ہے نا جی۔ پیار کی۔'' بالے نے کہا۔
آدمی اندر سے کتنا دکھی، کتنا اکیلا، اور کس قدر طلب گار ہے۔ عبداللہ شاہ نے سوچا۔
''کس طرف جانا ہے جی۔!'' اس نے چونک کر دیکھا۔ بالا ڈیفنس کے مین بلیوارڈ پر کھڑا تھا۔
اس نے اسٹریٹ نمبر اور گھر کا نمبر بتایا۔ بالا نے اسی طرف اسٹیرنگ موڑ دیا۔ چند ہی منٹوں میں وہ فرحان یعقوب کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ ابھی اس نے کار کا اطلاعی ہارن ہی دیا تھا کہ بڑے گیٹ کے ساتھ چھوٹا گیٹ کھلا اور اس میں سے فرحان یعقوب باہر نکلا ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' فرحان یعقوب نے کہا اور اس سے گلے ملا۔ عبداللہ شاہ کو بہت اچھا لگا۔ اس کی گرمجوشی۔ اس کا تپاک۔
''گاڑی اندر لے آؤ۔!'' اس نے بالے کو اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں گن مین نے آ کر بڑا گیٹ کھول دیا۔ بالا گاڑی وسیع پورچ میں لے گیا اور فرحان یعقوب، عبداللہ شاہ گیلانی کا ہاتھ پکڑے پکڑے اس کو اندرونی حصے کی جانب لے گیا۔
وہ سیدھے ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ جہاں کھانے کی وسیع و عریض میز چنی ہوئی تھی۔ ''آؤ بیٹھو۔!'' فرحان یعقوب نے ایک کرسی آگے کی۔ وہ بیٹھ گیا۔ فرحان یعقوب اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''چلو شروع کرو۔۔۔!''
''اتنا سارا اہتمام۔؟'' عبداللہ شاہ حیران تھا۔ ''یہ تو درجنوں افراد کے لئے بنوا لیا۔!''
''اصل میں ہم لوگ وہاں اتنے عرصے اکٹھا رہے۔ ہمیشہ تم نے میرا خیال رکھا۔ مجھے تو تمہاری کوئی پسند معلوم ہی نہیں کہ تم کیا کھاتے ہو؟ کیا پیتے ہو؟ کیا پسند کرتے ہو؟ اس لئے میں نے کہا، کئی چیزیں بنا دوان میں سے کوئی نا کوئی چیز تو تمہیں پسند آئے گی۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔
اس نے اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے متعلق۔ بڑے شاہ جی کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ یہ بھی دلداری کا، دل دہی کا ایک انداز ہوتا ہے کہ دوسرے کو آپ کے تمام دکھوں کا اندازہ ہو۔ لیکن صرف عمل سے، ورنہ

بار بار دکھوں کا پرساد دیتے رہنے سے، زخموں پر کبھی کھرنڈ نہیں آتا۔ لوگ بڑی محبت سے دکھ بانٹتے ہوئے بھی دکھوں کو دہراتے رہتے ہیں۔

''اتنا خیال رکھ رہے ہو میرا۔؟'' عبداللہ شاہ مسکرایا۔

محبت کا بدلہ، محبت کے سوا کیا ہے۔؟ تم نے وہاں ہوسٹل میں، پڑھنے کے دوران میرا کیسا کیسا ساتھ دیا۔ دیارِ غیر میں تو لوگ اپنوں کو بھول جاتے ہیں۔ تم نے تو سچ مچ دوستی کا حق نبھایا۔'' فرحان یعقوب نے دھیمے سے کہا۔

''یار میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' عبداللہ شاہ کو عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ تو بس ہر ایک کے کام آنے کی پر خلوص کوشش کرتا تھا۔ اس نے بعض معاملات میں فرحان یعقوب کو سپورٹ کیا تھا۔

''تم بہت بدل گئے ہو۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ اور ونگز کا ایک پیس منہ میں ڈالا۔

''ہاں جب نیناں نے مجھ سے بے وفائی کی تو میں بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ عورت پر بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ شراب بھی شروع کر دی تھی۔ ان دنوں ہی، تو تم نے مجھے سنبھالا تھا۔ میرے دکھوں کو سمجھا تھا۔ پھر ایک دن مجھے ایک پیر کا نمبر ملا۔ میں نے سوچا نیناں کو اس کی بے وفائی کی کڑی سے کڑی سزا ملے۔ وہ پاگل ہو جائے، دیوانی ہو جائے، کتے کی طرح میرے پیچھے دم ہلاتی رہے۔ میں نے سنا تھا کہ پیروں کے پاس ایسے عملیات ہوتے ہیں۔ جو کسی کا کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس عملیاتی طاقتیں ہوتی ہیں۔ جنہیں موکل کہتے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا اور اپنی حالت سنائی۔ یار میں لگاتار آدھے گھنٹے بولتا رہا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی میری بات نہیں کاٹی۔ اطمینان سے تحمل سے میری بات سنتے رہے۔ پھر آخر میں بولے۔

''بیٹے آپ کو ایک مشورہ دوں۔؟''

''جی۔۔!'' میں بے تاب تھا۔ کسی بھی صورت انتقام لینے کو۔

''لالچ ترک کر دیجئے۔'' انہوں نے سکون سے کہا۔

''کیا۔۔۔؟ سچ پوچھو تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرے ہزاروں ڈالر کھا گئی۔ حالانکہ میں نے اسے انگلی بھی نہیں لگائی۔ ورنہ یہاں تو دس ڈالر میں مل جاتی ہیں۔!''

''جب ہی تو کہہ رہے ہیں بیٹے کہ لالچ ترک کر دیں۔ آپ کو ناکامی کا صدمہ ہے۔ ہزاروں ڈالر کا صدمہ ہے۔ اس کے بدن کو نہ برتنے کا صدمہ ہے۔ اس میں محبت کہاں ہے؟ محبت تو بے ریا، بے مطلب ہوتی ہے۔ کسی سے کچھ حاصل کرنے کا نام محبت نہیں ہوتا۔ تجارت ہوتا ہے۔! جس محبت میں وفا کی ذرا بھی طلب ہو تو وہ محبت نہیں رہتی، لالچ بن جاتی ہے۔ لالچ ترک کر دیں سکون آ جائے گا۔'' فرحان یعقوب خاموش ہو گیا۔

عبداللہ شاہ حیرت سے چپ تھا مے اس کی گفتگو سنتا رہا۔

وہ پھر بولا۔ ''یار اس وقت تو میں نے غصے میں فون بند کر دیا اور پھر۔۔۔!اور پھر آہستہ آہستہ مجھے ان کی بات کی سچائی کا احساس ہونے لگا۔ واقعی میری محبت پاکیزہ تو نہ تھی۔ سچ مچ اس میں لالچ تھا۔ نیناں بہت خوبصورت تھی۔ میرے سارے دوست رشک کرتے تھے۔ یار اتنی خوبصورت لڑکی تیرے ساتھ ہے اور میں اس کو ہمیشہ ہی شو کرواتا تھا کہ مجھے تمہارے بدن کی طلب نہیں۔ مگر میں اندر سے، خوابوں میں جو کچھ چاہتا تھا۔ وہ وہی تھا۔ جو ہر نوجوان سوچتا تھا۔ مگر میں اس پر اپنی بے نیازی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ میری محبت واقعتاً لالچ ہی تھی اور مجھے انہوں نے جذبات کا احترام سکھایا۔ احساسات کی تفہیم کرنا سکھائی۔ وہ تمام پیروں سے بہت مختلف ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی شفیق باپ، خیال رکھنے والا باپ، بھروسہ دینے والی ماں ہوں۔ یار بعض لوگوں سے کس قدر رشتے جڑ جاتے ہیں۔!''

وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پھر چونک کر بولا۔ ''ارے میں نے تو تمہیں اپنی باتوں میں الجھا لیا۔ کچھ کھاؤ تو سہی۔!''

''کھا تو رہا ہوں۔۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ اور چائے کا کپ اپنی طرف سرکایا۔

''تو پھر تم نے ان سے رابطہ تو رکھا ہوگا۔؟''

''ہاں بالکل۔ پاکستان آ کر سب سے پہلے ان ہی سے ملا۔ بہت اچھا لگا۔ انہوں نے اتنے غیر محسوس طریقے سے مجھے بدل دیا کہ خود بھی حیرت ہوتی ہے۔!''

''وہ تو مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔ وہ لاابالی، غصہ ور، چلبلا فرحان یعقوب جو پل میں تولہ، پل میں ماشہ ہو جاتا تھا۔ بدل گیا ہے۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔

''یار تم بھی ان سے ملو۔ میں وہاں جاؤں گا تمہیں لیکر تمہیں اچھا لگے گا۔!'' فرحان یعقوب نے کہا۔

''کب جاؤ گے۔۔؟''

''تھوڑی دیر میں، ان کا درس شروع ہونے والا ہے۔'' فرحان یعقوب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔'' آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں درس دیتے۔ مگر یار اس میں بھی دریا کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ دیکھنا کیسے کیسے لوگ ان کے سامنے سر تسلیم خم کیے دیتے ہیں۔!'' فرحان یعقوب پُر جوش ہو گیا۔

عبداللہ شاہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ پھر اٹھ کر فرحان یعقوب کے کمرے میں آ گئے۔ ڈھیر ساری گفتگو۔ پرانی باتیں۔

☆☆☆

''دوستو! زندگی بہت پیاری بہت مختصر ہے۔ اس کو ہم اپنی منصوبہ بندی سے، اپنی خواہشات سے، اپنے مفادات سے مشکل اور پے چیدہ بنا لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی، جیسے کوئی خوش ذائقہ شربت کو بڑھانے کے چکر میں مسلسل اس میں پانی کا اضافہ کرتا جائے۔ اور یاد رکھئے! طلب کو، آرزو کو خالص رکھئے۔ بے طمع آدمی سکون میں رہتا ہے۔ لالچ انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ حرص اور ہوس انسان کو رشتوں سے، تعلق سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انسان کے پیٹ کے گڑھے کو قبر کا گڑھا ہی بھرتا ہے۔ پیسے بچے دیتے ہیں۔ پہلے انسان اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ پھر یہ بڑھتے ہیں اور انسان پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان قدریں ترک کر دیتا ہے۔ احکاماتِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ مال کی طلب اور حرص نے تمہیں غفلت میں مبتلا کر دیا۔ تم نے اپنے دینی فرائض اور اخلاقی اوصاف کو تباہ کر دیا۔ یہاں تک کہ تم قبر رسیدہ ہو گئے۔ اور پھر وہ بدن جس کو بڑے پیار سے، لوگوں کا حق مار مار کر پروان چڑھایا، سب سے پہلے یہی پیٹ پھٹے گا۔ جسے تم نے ہر رشتے کو کچل کر، ہر تعلق کو بھسم کر کے بھرا۔ اور پھر معلوم ہوگا کہ اللہ کا وعدہ کیسا ہوتا ہے۔ اور یہ تمہیں معلوم ہو کر رہے گا۔ جس کو نظر انداز کر کے، جھٹلا کے، تم نے شرف انسانیت کی توہین کی۔ کیوں کہ ہمارے احکامات، ہماری تعلیمات، ہمارے بندے کی سعی کو تم نے نہ مانا۔ بلکہ اپنے طرزِ عمل سے جھٹلا دیا۔ اور علم رکھنے کے باوجود تم نے اپنے آپ کو ضائع کر دیا اور اب تم ضرور دوزخ میں جاؤ گے۔ اس دوزخ کا حصہ بنو گے۔ جس کو تم نے جاننے کے باوجود نظر انداز کیا۔ اور اب تم سے ان تمام نعمتوں کا حساب لیا جائے گا۔ جو تم کو ہم نے دیں۔'' ان کے لہجے میں بے پناہ جلال تھا۔ وہ جلال جو رب اپنے بندوں کو اس وقت عطا کرتا ہے۔ جب ان سے اپنی مخلوق کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ تمام لوگ، مریدین، عقیدت مند ساکت ان کی تقریر سن رہے تھے۔

''دوستو! توبہ کر لو۔ اس مالک حقیقی کے حضور! جو دلوں کے حال کو، اس کی کجی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم بے یار و مددگار تختہ غسل پر پڑے اپنے بدن پر پانی پڑنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ہماری بیوی ہمیں رو رہی ہو۔ ہمارے بچے بلک رہے ہوں۔ ہمارے پیارے ہماری جدائی میں جگر خراش آہیں بلند کر رہے ہوں۔ اور ہم تاسف اور پچھتاوے سے انتظار کر رہے ہوں۔ خواہش کر رہے ہوں۔ مزید مہلت، جو نہ ملی ہے اور نہ ہی ملے گی۔ یا اللہ! ہماری توبہ کو قبول فرما۔ ہماری حرص، ہوس کو دور فرما۔ ہماری کجی کو سیدھا کر۔ ہماری زندگی اور طرزِ عمل کی اصلاح کر۔ ہمیں معاف

کر دے۔ ہم گناہگار، خطا کار ہیں۔ پھر بھی تیری رحمت کے طلبگار، تجھ سے معافی کے خواہستگار ہیں، ہمیں معاف فرما۔!''

فرحان یعقوب، عبداللہ شاہ گیلانی لوگوں کے ہجوم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گفتگو جو آخر میں نجانے کیسے دعا کے قالب میں ڈھل جاتی تھی۔ آج لوگوں کو رُلا رہی تھی۔ عبداللہ شاہ گیلانی کو تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے قادری سرکار صرف اس سے ہی مخاطب ہیں۔ گزشتہ چند دنوں میں جو کچھ ہوا تھا۔ اس سب کا خلاصہ انہوں نے اپنے مختصر خطاب میں کر دیا تھا۔

''ارے عبداللہ تم رو رہے ہو۔!'' دفعتاً فرحان یعقوب نے اسے چونکا دیا۔

عبداللہ شاہ کا ہاتھ بے ساختہ اپنی آنکھوں سے جا لگا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے پر، رخساروں پر بے تحاشا نمی تھی

''اور تم۔۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے فرحان یعقوب سے کہا۔ ''تم اپنی حالت دیکھو۔۔۔!''

فرحان یعقوب نے ایک جذب کے عالم میں آنکھیں میچیں۔ کئی آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک گئے۔ ''سب ہی رو رہے ہیں۔ ایک میں اور تم کیا۔!'' عبداللہ شاہ نے ادھر ادھر دیکھا۔

رو تو سب ہی رہے تھے۔ کئی لوگوں کے سسکیوں سے بدن ہل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں ہر طرف سے آ رہی تھیں۔ کسی کے تصور میں ہولناک، تاریک قبر کا منظر تھا۔ تو کوئی اپنے آپ کو سڑی ہوئی لاش کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔ کسی کو اپنا پیٹ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور کوئی اپنی بے نور آنکھوں کو بہتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ کسی کو محسوس ہو رہا تھا کہ دوزخ کے فرشتے اس کو کھینچ رہے ہیں۔ تو کسی کو محسوس ہو رہا تھا کہ تختہ غسل پر اس کو نیم و بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دیا جا رہا ہے۔

اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ اچانک کسی طرف سے معافی کی گردان شروع ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کے سارے لوگوں کی زبان سے ذکر جاری ہو گیا۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ ہر کوئی زور۔ زور سے بول رہا تھا۔ سر ہل رہے تھے۔ بدن لرز رہے تھے۔ اچانک کئی لوگ وجد میں آ گئے۔ کئی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھوم جھوم کر ایک ہی تکرار کرنے لگے۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ ہر شخص زبان سے، دل کی گہرائیوں سے۔ بدن کی حرکت اور زبان کے لفظوں کے تال میل میں بہہ رہا تھا۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔!

اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ کی گردان پھیل کر ساری خانقاہ کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ اللہ معافی۔۔ فضا گونج رہی تھی۔ ایک عجیب سا رنگ پوری محفل پر چھا رہا تھا۔ اچانک جیسے عبداللہ شاہ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ لوگ ایک بہت بڑے گنبد میں بند ہوں۔ جس میں سے نور کی لہریں نکل کر عرش کو جا رہی ہوں۔ جیسے بجلیاں کوندتی ہوئی آسمان سے زمین تک اور اس خانقاہ کے ہر شخص کو اپنے دائرے میں لے رہی ہوں۔ پھر اچانک جیسے عبداللہ شاہ گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے ہر شے بے وزن ہو رہی ہے۔ اس کا وجود غبارے کی طرح بلند ہو رہا ہو۔ پھر وہ بلند، بلند۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ کشش ثقل کے ٹوٹنے کا احساس۔ بے وزن جیسے کاغذ۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی اور بے وزنی۔۔۔ قوت صفر۔۔۔ سماعت صفر۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ پھر دفعتاً انتہائی تیز چکا چوند روشنی۔ پھر ہر شے جیسے تحت الثریٰ میں گر رہی ہو۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔

☆☆☆

''عبداللہ۔۔۔ عبداللہ۔'' کوئی عبداللہ شاہ کو آوازیں دے رہا تھا۔ عبداللہ شاہ کو اچانک اپنے اوپر بارش کے قطرے گرنے کا احساس ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لیکر آنکھیں کھول دیں۔ فرحان یعقوب اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس تھا۔ جس سے پانی لیکر وہ اس پر چھینٹیں مار رہا تھا۔

''ٹھیک ہو نا۔۔۔؟'' وہ اسے آنکھیں کھولتا، کسمساتا دیکھ کر بولا۔

''ہاں۔۔۔!''عبداللہ شاہ کہنیاں ٹیک کے اٹھ بیٹھا۔اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔کئی لوگ اسی طرح بے حال پڑے تھے۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سب کو چکر آ گئے ہوں۔''مجھے کیا ہوا تھا۔۔؟''

''وہی جو یہاں سب کو ہوتا ہے۔''فرحان یعقوب مسکرایا۔''بے خود، کیف آور مستی، جب اپنا بھی ہوش نہ رہتا ہو۔۔!''

کئی خادم بے حال لوگوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔کچھ لوگوں کا سر سہلا رہے تھے۔کچھ لوگوں کو سہارا دیکر باہر لے جا رہے تھے۔جہاں غالباً ان کی گاڑیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔ان میں سے ایک خادم ٹرے میں جگ اور گلاس لے آیا۔

''شربت لیجئے گا۔؟''اس نے ادب سے پوچھا اور بیٹھ گیا۔

''ہاں۔۔۔!''فرحان یعقوب نے گردن ہلائی۔خادم نے شیشے کے شفاف گلاسوں میں جگ سے شربت انڈیلا اور انہیں پیش کر کے جگ اور ٹرے وہیں رکھ کر چلا گیا۔

ٹھنڈا، میٹھا خوش ذائقہ شربت نے پہلے ہی گھونٹ سے ان کے اندر توانائی کی کیفیت پیدا کر دی۔چند لمحوں پہلے کی تھکن جیسے غائب ہونے لگی۔عبداللہ شاہ نے چند ہی گھونٹوں میں گلاس خالی کر دیا اور دوسرا گلاس بھر لیا۔اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگا۔

''کیا محسوس ہوا تھا۔۔؟''فرحان یعقوب نے اس کی حالت بحال دیکھ کر سوال کیا۔

''پتا نہیں۔۔۔!''عبداللہ شاہ نے کہا۔''جو وہ آج باتیں کر رہے تھے۔مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی اور کی نہیں، میری داستان بیان کر رہے ہوں۔ایک ایک لفظ میرے اوپر منطبق ہو رہا تھا۔!''

''ان کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔!''فرحان یعقوب نے انتہائی عقیدت آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا تم مجھے ان سے ملوا سکتے ہو۔؟''عبداللہ شاہ نے سوال کیا۔

''دیکھتا ہوں۔۔!''فرحان یعقوب نے کہا۔''خطاب و دعا کے بعد اکثر لوگ ان سے اپنے ذاتی معاملات میں مشورہ لینے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔اگر رش نہ ہوا تو پھر ملاقات کوئی مسئلہ نہیں۔!''وہ کہتا ہوا اٹھ گیا اور تیزی سے چلتا ہوا ایک طرف غائب ہو گیا۔

عبداللہ شاہ شربت کی ننھی ننھی چسکیاں لیتے ہوئے اس کا انتظار کرتا رہا۔تقریباً پندرہ بیس منٹوں کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ بے حد پرجوش ہو رہا تھا۔''آج چند ہی لوگ تھے ورنہ بے تحاشہ لوگ ہوتے ہیں۔دو تین لوگوں کے بعد ہی باری آ جائے گی آؤ چلیں۔''

عبداللہ شاہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی معیت میں چلنے لگا۔تھوڑی ہی دیر میں وہ خانقاہ کے اندرونی ہال میں پہنچ گئے۔جہاں قادری سرکار ایک تخت پر بیٹھے تھے اور ان کے پاس دو تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔وہ بھی جا کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔تھوڑی ہی دیر میں وہ افراد قادری سرکار سے اجازت لیکر اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر رخصت ہو گئے۔

انتہائی ادب سے سلام کرنے اور دست بوسی کے بعد فرحان یعقوب نے کہا۔''سرکار میرے دوست آپ سے شرف ملاقات کے آرزو مند تھے۔میں انہیں لے آیا ہوں۔!''

''آیئے تشریف رکھئے۔!''قادری سرکار نے مسکرا کے انہیں دیکھا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔

عبداللہ شاہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔''سرکار یہ کیا تھا۔؟میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔؟''

''آہستہ آہستہ شعور کے دروازے کھلتے ہیں۔''قادری سرکار مسکرائے۔''ایسی بھی کیا جلدی ہے کیا سارے دروازے بند ہو گئے۔؟''

''معلوم نہیں لیکن اعتبار کے دروازے بند ہو گئے۔یقین رخصت ہو گیا۔''عبداللہ شاہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دکھ پندار ٹوٹنے کا ہوتا ہے۔!'' وہ دھیمے سے لہجے سے بولے۔''بہت نازک، بہت باریک۔''

''آپ کو معلوم ہے۔!'' عبداللہ شاہ جیسے بے بس سا ہو گیا۔''آپ سب جانتے ہیں۔!''

''یقیناً اللہ جتنا چاہتا ہے۔اپنے بندے کو بتاتا ہے۔یہ تو اس کی مرضی پر منحصر ہے۔!''

''حقیقتیں کیوں کھل جاتی ہیں۔؟''

''تاکہ سچ کا پتا لگ جائے۔'' قادری سرکار نے شفقت سے کہا۔''اکثر لوگ حقیقت کو ہی سچ سمجھتے ہیں۔مگر سچ تو حقیقت سے آگے کی چیز ہوتا ہے۔!''

''میں واپس جانا چاہتا ہوں۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔''اب مجھے یہاں کچھ نہیں اچھا لگ رہا۔!''

''نہیں۔۔۔!'' قادری سرکار نے دوٹوک انداز میں کہا۔''تمہیں واپس جانے کے لئے نہیں بلوایا گیا۔تمہیں ذمہ داری دینی ہے۔تمہیں بہت تیاریاں کرنی ہیں۔تم مستقبل ہو ہمارا، ہمارے وطن کا مستقبل، تم نوجوان ہی ہمارے لئے اثاثہ ہو، ہم تو بنیاد ہیں۔ہمیں کون جانے گا۔چہرہ تو تم لوگ ہو۔جذبے سے سرشار، توانائی سے بھرپور۔!''

''میں اہل کہاں۔؟'' عبداللہ شاہ نے کہا۔''میں تو خالی ہوں۔تنہا۔!''

''جو دکھ کی گٹھری ساتھ لیکر چلتے ہیں۔وہ خالی نہیں ہوتے۔راز طاقت بھی دیتا ہے۔سمجھنے سمجھنے کی بات ہے۔!''

فرحان یعقوب کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آرہی تھیں۔پہلی بار ملنے والے یوں گفتگو کر رہے تھے کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں۔بات تو وہ بھی سن رہا تھا مگر اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔وہ حیرت کے عالم میں کبھی قادری سرکار کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی عبداللہ شاہ کی طرف۔

''فرحان میاں پریشان ہو رہے ہیں۔'' دفعتاً قادری سرکار نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔

''جی نہیں۔۔۔ہاں جی۔۔۔!'' فرحان یعقوب گڑبڑا گیا۔

قادری سرکار نے مسکرا کے کہا۔''اجنبی تو وہ ہوتے ہیں جن کے مقاصد جدا ہوتے ہیں۔جن کی سمت مختلف اور خواہشیں متضاد ہوتی ہیں۔یہاں تو سب ایک ہیں، یکسو ہیں۔''

''سرکار میری سمجھ سے یہ رمز باہر ہیں۔!'' فرحان یعقوب نے کہا۔''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔!''

''بیٹھو اطمینان سے۔!'' قادری سرکار نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔''کچھ باتیں تفصیل طلب ہیں۔تمہارے لئے مختصراً بیان کرتا ہوں۔!''

فرحان یعقوب اور عبداللہ شاہ فرشی نشست پر بیٹھ گئے۔خادم نے ایک گاؤ تکیہ ان کی کمر سے ٹکایا۔انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''اسلامی تاریخ پر تھوڑا سا بھی غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام میں جو بھی لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ان تمام کا مقصد قتل و غارت گری نہیں تھا۔دوسروں کے وسائل پر قبضہ کرنا۔آزاد اقوام کو غلام بنانا۔ممالک کی جغرافیائی حدود کو پامال کرنا نہیں تھا۔بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسانیت کو اللہ کا، صانع حقیقی کا اصل پیغام پہنچایا جائے۔دولت کے ارتکاز کو روکا جائے اور دنیا کے میسر وسائل میں سے سب کو ضرورت کے مطابق حصہ دیا جائے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لڑی گئی تمام جنگوں میں صرف ۹۲۳ کفار قتل ہوئے اور ۱۲۵ مسلمان شہید ہوئے اور اس بات کو خصوصی طور پر مدنظر رکھو کہ دعوتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نا صرف قلب بدل دیئے۔نظریات بدل دیئے۔رہن سہن، رشتے ناطے بدل دیئے۔بلکہ دنیا کا جغرافیہ بدل دیا۔اور یہ تمام معاملات آج بھی جوں کے توں ہیں۔بے شمار مذاہب آئے۔لیکن وہ مخصوص جغرافیائی حدود، لسانی اور قومی وحدتوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔لیکن تبلیغِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو سکون، اطمینان، آزادی، غلامی سے نجات اور معاشی ترقی عطا کی۔!''

وہ ایک ایسے مفکر کی طرح گفتگو کر رہے تھے کہ جس کی نگاہوں کے سامنے تاریخ اسلام کھلی پڑی ہو۔اور وہ ان سب کا

تجزیہ کرتے چلے جا رہے ہوں۔ وہ مبہوت ان کی گفتگو سنتے رہے۔

''اس کے برعکس جنگ عظیم اول اور دوم دونوں کو لے لو، ان جنگوں میں کئی کروڑ لوگ ہلاک ہوئے۔ چھ کروڑ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ لاکھوں کے حساب سے جنگی قیدی بنائے گئے۔ چار کروڑ سے زائد لوگ غائب ہوئے۔ جن کا پتا نہیں چل سکا۔ لاکھوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بھوک، افلاس، صنعتی تباہی، ناجائز اولادیں، بے حرمتی، معذوری کیا کیا گن سکتے ہو۔! اس کے سوا کیا حاصل ہوا؟ یہ جنگیں کیوں لڑی گئیں۔؟ انسانیت کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا۔؟ کیا ملا۔؟ یورپ، ایشیاء، امریکا، افریقہ سب ہی متاثر ہوئے۔ لیکن اسلامی فتوحات کے برعکس خوشحالی، بے فکری، حقیقی آزادی کسی کے حصے میں نہ آئی۔ دنیا کمیونزم اور کیپٹل ازم کے خونی پنجوں میں جکڑی گئی۔ اور آج تک دنیا ان کے مکروہ اثرات سے چھٹکارہ نہ پا سکی۔''

قادری سرکار خاموش ہو گئے۔ ان کے لہجے میں بے پناہ تاسف تھا۔ دکھ تھا۔ ان لوگوں کے لئے جو ایسی تاریک راہوں میں مارے گئے کہ ان کو کسی راہ کے تعین کا اختیار تھا۔ اور نہ ہی ادراک۔

''پھر دنیا کے نقشے پر قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زیر قیادت مسلم ریاست وجود میں آئی۔ جس کو بدقسمتی سے شروع ہی میں مفاد پرستوں نے گھیر لیا۔ بے ضمیروں نے آزاد وطن کی حمیت کا سودا کر لیا۔ یوں ہم ایک کی غلامی سے چھوٹ کر دوسرے کی غلامی میں چلے گئے۔ فرق صرف یہ تھا۔ اس غلامی میں زنجیریں بہت طویل، اور کڑیاں چبھتی نہیں تھیں۔ اس لئے غلامی کا ادراک نہیں رہا۔ مگر آج وقت چلتے چلتے ہمیں وہاں لے آیا ہے۔ جہاں ہمارے لوگ بھوک، افلاس، بے انصافی بے سمتی کے اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ جہاں ان کے پاس سوائے اٹھ کھڑے ہونے کے کوئی راہ نہیں رہ گئی۔''

وہ ذرا ٹھہرے اور پھر گویا ہوئے۔

''اب ساری ذمہ داری تم لوگوں کی ہے۔ تم لوگ جو ہمارا مستقبل ہو۔ ہمارے آج سے جنم لیتا ہوا کل ہو۔ تمہیں اٹھنا ہے۔ عام لوگوں کے لئے۔ بے سہارا، بھوکے، ننگے، پسے ہوئے، کچلے ہوئے لوگوں کا سہارا بننا ہے۔ ورنہ اس قوم پر مسلط ہر طبقے کے سربرآوردہ لوگ شائیلاک کی صورت لوگوں کے زندہ بدن سے گوشت نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔!'' قادری سرکار کے لہجے میں بے پناہ حدت تھی۔ وہ جو لپٹ کی صورت اٹھتی ہے اور پورے ماحول کو خاکستر کر دیتی ہے۔

''ہم حاضر ہیں۔!'' دونوں جیسے بیک وقت بولے۔ اور اپنی ہی آواز کی گونج سے چونک گئے۔ ''ہمیں حکم دیجئے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ اس مملکت کے لئے۔ اپنے لوگوں کے لئے۔ ہم اپنے بدن کا ریشہ، ریشہ قربان کر دیں گے۔!''

''شاباش مجھے یہی امید تھی تم لوگوں سے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دو خادم اندر داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں دو ٹرے تھیں۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے دستر خوان بچھایا اور کھانا لگایا۔ مونگ کی دال کی کھچڑی، ایک پیالے میں بگھاری ہوئی پیاز۔ ایک میں چٹنی تھی۔ پورے کمرے میں کھانے کی مہک پھیل گئی۔

تیسرا خادم اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سلفچی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں پیتل کا چمکتا ہوا لوٹا۔ اس نے دو زانو ہو کر بڑے ادب سے پہلے قادری سرکار کے ہاتھ دھلائے۔ اس کے بعد فرحان یعقوب اور پھر عبداللہ شاہ کے۔

''آیئے کھانا کھا لیجئے۔'' قادری سرکار نے کہا۔

وہ دونوں بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ نہ فرحان یعقوب کو یاد تھا اور نہ ہی عبداللہ شاہ گیلانی کو، کہ کبھی اس سے پہلے انہوں نے مونگ کی کھچڑی بگھاری پیاز اور انار دانے کی چٹنی کے ساتھ کھائی ہے یا نہیں۔ لیکن دونوں کو جو ذائقہ، جو لذت محسوس ہوئی وہ اس سے قبل کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دانے دانے میں لذت کا احساس تھا۔

''شکر میں لذت اور قناعت میں عافیت ہوتی ہے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔

وہ ہر شخص کو جیسے پڑھ لیتے تھے۔

تمام کھانے کے دوران خدام ادب سے کھڑے رہے تھے۔ مبادا کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ قادری سرکار نے گلاس کی طرف دیکھا۔ ایک خادم نے تیزی کے ساتھ بڑھ کر پانی پیش کر دیا۔ انہوں نے تین گھونٹ میں پانی پیا۔ اور الحمد للہ پڑھی۔ ان دونوں نے بھی سیر ہو کر کھانا کھا لیا تھا۔ بے حد طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ گئے۔ خدام نے حسب معمول ہاتھ دھلائے۔ سفید تولئے پیش کئے۔ ایک خادم نے سونف، مصری اور بادام سے بھری طشتری آگے کی۔ جن میں سفید چمکتے ہوئے چمچے بھی رکھے ہوئے تھے۔ فرحان یعقوب نے چمچے سے دو تین بار سونف کو لوازمات سمیت ہتھیلی پر رکھا اور پھانک لیا۔

اچانک عبداللہ شاہ کی نظر برتن اٹھاتے ہوئے خادم پر پڑی۔ خادم نے قادری سرکار کی پلیٹ سے جو چند دانے چاول دال کے باقی رہ گئے تھے۔ انہیں بڑے احترام سے چن کر ہتھیلی پر رکھا اور وہ دانے اٹھا کر منہ میں رکھے۔ اور دوسرے خادم کو بھی دو، دانے دیئے۔ ایک اور خادم نے قادری سرکار کا گلاس اٹھایا اور اس میں جمع چند قطرے اپنے حلق میں ٹپکا لئے۔

عبداللہ شاہ عقیدت واحترام اور محبت کے اس نظارے پر ششدر رہ گیا۔

احترام، محبت ادب تو اس کے ہاں بھی بہت تھا۔ بڑے شاہ جی، شاہ ہارون گیلانی سب سے لوگ پیار کرتے تھے۔ عقیدت بھی رکھتے تھے۔ مگر یہ کیا معاملہ تھا۔ یہ تعلق، یہ محبت تو عقل سے ماورا تھی۔ ایسی محبت، عقیدت اور چاہت جب ہی میسر آتی ہے۔ جب کسی کی محبت آسمانوں سے دلوں میں ڈالی جائے اور یہ مقام اولیاء اللہ کو، اس کے ولیوں کو، اس کے پیاروں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟'' فرحان یعقوب نے اسے ٹہوکا دیا۔

''کچھ نہیں۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے جواب دیا۔'' جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بیان کا یارا نہیں۔!''

''ہاں۔۔۔!'' فرحان یعقوب نے آہستگی سے کہا۔'' یہاں آؤ تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہیں۔''

ابھی وہ لوگ چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے کہ خادم قہوہ لے آئے۔ خوشبودار قہوے کی مہک نے ماحول کو معطر کر دیا۔ انہوں نے قادری سرکار کے پاس بیٹھ کر ان کے ہمراہ قہوہ پیا۔ پہلا ہی گھونٹ سرشار ہونے والے ذائقے سے بھرپور تھا۔

''تم لوگ پاکستان ہو۔ ہم کاغذ ہیں اور تم تحریر۔ ہمارے سنہرے مستقبل کی تحریر۔'' قادری سرکار نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تم اپنے حلقے میں واپس جاؤ۔ وہاں تمہاری ضرورت ہے۔'' انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کو مخاطب کیا۔'' قدرت کے ہاتھوں بہت کچھ بدلنے والا ہے۔ جو لوگ دکھ کو ہمت اور راز کو طاقت بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے تئیں اپنا مستقبل طے کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ تیاریاں، ساری محنتیں قدرت ہم سے کسی اور کے لئے کروا رہی ہوتی ہے۔ ہم جس طمطراق سے، جس رعونت سے جگہ سنبھالنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ سیڑھیاں چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے قدم کے نیچے سے، مقدر کے طاقت ور اسپرنگ نے ہمارے حصے کی زمین کھینچ لی ہے اور ہم گمنامی کی عمیق گہرائیوں میں گرنے جا رہے ہیں۔!''

قادری سرکار بات مکمل کر کے خاموش ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے اس ساری گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اچانک عبداللہ شاہ گیلانی کے موبائل پر میسج کی مخصوص دھن گنگنائی۔ اس نے میسج پڑھا۔ بریکنگ نیوز تھی۔

''حکمران پارٹی کے اہم رکن سردار حیات اللہ نے پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ہے۔''

☆☆☆

پورے قصبے میں ایک گہما گہمی کا عالم ہو گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد لوگوں کو جونہی پتا چلا کہ میں قادری سرکار کا بھیجا ہوا خانقاہ سے آیا ہوں لوگوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ قادری سرکار کا بچہ، سرکار کا خادم الیکشن کی تیاریوں کے لئے آ گیا

ہے۔ سمجھو جیت تو ہوگئی۔ لوگوں کا یہی خیال تھا۔

''خلیفہ جی۔!'' ایک بوڑھی عورت نے بہت پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''اب تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔ جب اللہ والے حکومت میں آئیں گے تو دیکھنا کیسی کیسی برکتیں ہونگیں۔''

کہاں تک سوچتے تھے یہ سادہ لوح افراد۔ مجھے احساس ہوا۔ کچھ حقیقتیں، سچائیاں کائناتی ہوتی ہیں۔ بے ریا، طمع سے پاک لوگ جب وسائل کی تقسیم کے ذمے دار ہونگے تو پھر ہی بھوک، افلاس، بے انصافی کا خاتمہ ہوگا۔ رکھوالے ماں کی طرح ہونے چاہئیں جو کہ خود بھوکی رہ کر بچوں میں روٹی تقسیم کرتی ہے۔ ناکہ ناگن کی طرح کہ بھوک کے عالم میں اپنے ہی بچے نگل جائے۔

''اماں اب سر چھوڑ دبھی خلیفہ جی کا۔۔۔!'' کسی کی شریر آواز آئی۔

''ارے میں تو اس لئے سر چھوتی ہوں کہ ان بالوں پر مرشد نے ہاتھ پھیرا ہوگا!'' اماں نے کہا۔ اور دھیرے سے میرے سر سے ہاتھ ہٹالیا۔

اس کے انداز میں بے پناہ پیار تھا۔ عقیدت تھی۔

''یار یہ لوگ کتنا پیار کرتے ہیں قادری سرکار سے؟'' قدیر نے بے پناہ حیرت سے کہا۔ ''اتنی محبت، ایسی چاہت، اتنا اعتبار تو لوگ بادشاہوں کو بھی نہیں دیتے ہیں۔!'' قدیر آج صبح ہی پہنچا تھا اور یہ سب دیکھ کر بہت حیران بھی تھا اور خوش بھی۔

''میں بھی یہی سوچتا تھا کہ زندگی کیا ہے؟۔ عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ اور موت کیا ہے؟ ان ہی کا اجزاء کا پریشان ہونا۔ مگر یہ تو ایک طبعیاتی اور نامیاتی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ زندگی تو اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ خاک کے اس پتلے کے بھیتر دل میں جب آلائش دنیا، مکروہات اسباب نکال دیئے جاتے ہیں تو پھر زندگی کا شعور بیدار ہونا شروع ہوتا ہے۔ بے ریا۔ بے طمع۔ خالص، سچا سودا جو بیچنے والے، اور خریدنے والے دونوں ہی جان کی قیمت پر لیتے ہیں۔!'' میں نے کہا۔

''تم بہت تبدیل ہوگئے ہو۔!'' قدیر نے کہا۔ ''تمہاری باتوں میں گہرائی، اور طرز ادا میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔!''

''پتا نہیں۔۔۔!'' میں نے کہا۔ ''مجھے خود نہیں پتا لیکن اندر سے یوں لگتا ہے کہ خالی ہوگیا ہوں۔!''

''پتر خلیفہ جی۔۔۔! جب تک برتن خالی نہ کریں۔ رگڑ رگڑ کر مانجھا نہ جائے کثافت کیسے اترے گی۔؟'' غلام حسین نے بڑے پیار سے مداخلت کی۔ اور میرے گھٹنے کو تھپتھپایا۔

''چاچا جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے گہری سانس لیکر کہا۔ ''میں نکما، بے سیاس، بے توقیر، غرض کا بندہ۔۔!''

''نہیں پتر جی۔!'' غلام حسین پیار سے بولا۔ ''برتن کا اپنا وزن، اپنا معیار بھی تو ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں تو زنگ ہوتی ہیں جی۔۔۔ پر مرشد کی نگاہ کیمیا اثر سے یہ سب چمک جاتا ہے۔ خالص مصفا۔۔۔!''

اس کے انداز میں بے پناہ خلوص تھا۔ اجلا پن تھا۔ ''آپ میں کچھ ہے تو مرشد کرم فرمار ہے ہیں۔ سرکار تو جوہری ہیں۔ ان کی نگاہ سے کوئی ہیرا کیسے بچ سکتا ہے۔؟''

قدیر خاموش گفتگو سنتا رہا۔ غلام حسین کے انداز میں بہت کچھ تھا۔ اس کی گفتگو سادہ مگر اسرار سے بھری ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ غلام حسین بہت اونچی جگہ پر فائز ہے۔ بہت بلند مرتبہ ہے مگر اپنے آپ کو چھپائے رکھتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں قادری سرکار سے ضرور پوچھوں گا کہ غلام حسین کون ہے۔ کیا ہے۔ کیسا بھید بھرا آدمی ہے۔ اوپر سے سوکھا۔ اندر سے ہرا بھرا۔

''معمولی لوگوں کے متعلق کیا سوچنا، کیا جاننا۔؟'' غلام حسین نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''بیل جتنا بھی بھڑکیلا ہو اس کے لئے کھونٹا بہت۔ پھر کھونٹے کی طاقت تو بڑی ہوئی نا۔!'' وہ مسکرایا۔

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنس پڑا میرے ساتھ۔

''کیا ہوا۔؟'' قدیر نے کہا۔

''کچھ نہیں بیٹا جی۔۔۔!'' غلام حسین نے مسکرا کے کہا' 'اپنے خلیفہ جی، شہری آدمی ہیں۔ ہر چیز کے متعلق پوری طرح جانچ پرکھ کے پھر یقین کرتے ہیں۔ ہم لوگ سادہ۔ بس جس کے ہو گئے، سو ہو گئے۔ جو پیا من بھائے وہی سہاگن۔ تیری ایک نگاہ سے، سب عالم بے ساکھ ہوئے۔۔!'' غلام حسین اٹھا اور مسکراتا ہوا تہمند سنبھالتا ہوا چلا گیا۔

''یہ کیا تھا۔۔؟'' قدیر حیرت سے بولا ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔!''

مگر میں تو اس کے جملے کی حلاوت میں گم تھا۔ تیری ایک نگاہ سے، سب عالم بے ساکھ ہوئے۔ سچ ہی تو ہے۔ جب تک پرکھنے والی نگاہ نہیں ہوتی۔ قیمت کا صحیح ادراک نہیں ہوتا۔ ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھ کر لپک پڑتے ہیں۔ لالچ کے سکوں سے خواہشوں کے انبار خریدتے رہتے ہیں۔ جمع کرتے رہتے ہیں۔ آرزوؤں کے اتنے بڑے بڑے بلبلے بنا لیتے ہیں کہ پھر اسی بلبلے میں پھنس کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر جب پرکھنے والی آنکھ کھل جاتی ہے تو پھر اشیاء کی بے ثباتی سامنے آ جاتی ہے۔ اور سارے عالم اس کی رضا کے لئے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ طلب ہی سے ساکھ بنتی ہے۔ خواہش کی شدت، قیمت متعین کرتی ہے۔ جب آدمی بے طلب، بے خواہش ہو جائے تو پھر کیا ہیرا اور کوئلہ، جھونپڑی اور محل، ٹاٹ کے بوریے اور حریر ودیبا میں کوئی کشش، کوئی قیمت نہیں رہتی۔ ساکھ تو لینے کی خواہش سے، حصولِ آرزو سے بنتی ہے۔ اور جب جذبۂ حصول ہی ختم ہو جائے تو پھر ہر شئے بے ساکھ ہو جاتی ہے۔

''کہاں گم ہو جاتے ہو تنزیل۔۔؟'' قدیر نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں جیسے یکلخت اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔

''کچھ نہیں۔۔!'' میں نے کہا۔

''کچھ تو ہے تم کچھ چھپا رہے ہو۔؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''بہت بدل گئے ہو۔ یوں جیسے لوگوں میں رہ کر، لوگوں سے دور ہو گئے ہو۔ مجھے بھی کچھ بتاؤ۔''

''کچھ بتانے کو ہے کیا۔؟'' وہ آہستہ سے بولا۔ پھر اچانک چونک کر بولا۔ ''ارے میں نے تمہیں یہ بتایا ہی نہیں کہ تمہاری کتاب ''سندیسے جو کھو گئے'' کا دوسرا ایڈیشن ختم ہونے والا ہے۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو تیسرا ایڈیشن چھاپوں۔۔؟''

''تمہاری مرضی۔۔!'' میں نے بے نیازی سے کہا۔ مجھے سچ مچ اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''ویسے یہ کتاب بغیر پبلسٹی کے خوب بکی۔ جمالی صاحب کہہ رہے تھے کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی کروانا بہت ضروری ہے۔''

قدیر نے کہا۔ ''انہیں بے حد پسند آئی ہے یہ کتاب۔۔!''

''کیوں۔۔۔؟'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''اس میں کیا ہے؟ سوائے بے تکے خیال۔ ویران یادوں کے جزیرے۔ امیدوں کے کملائے ہوئے باسی بے بو پھول، شکستگی، پامالی، بے ثباتی، بکواس فلسفہ محبت، بے تکی افلاطونی خواہشیں۔۔!''

''ایسا نہ کہو۔۔!'' قدیر نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ اس کتاب میں کیا کیا ہے۔؟ وہ آرزو، وہ آگ، وہ تپش جس سے ہر جوان کے سینے روشن ہیں۔ محبت کی ایک نئی تفہیم، کسی کے لئے بے طلب ہونے کا گر ہے اس میں۔'' قدیر نے کہا۔ ''بعض اوقات ہمیں اپنے لکھے کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنے لفظوں کے اثرات کا، جنموں کی مسیحائی کا اعجاز معلوم نہیں ہوتا۔ مگر لفظ جس میں، خلوص ہو، جذبہ جس میں پذیرائی ہو، ایک عالم کو متاثر کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری کتاب جس نے شوق میں لی، پھر اس نے اس کو سمجھ لیا۔ اس کو اپنی محبت کا۔ اپنے جذبے کی شدتوں کا علم ہو گیا۔ لفظ بڑے پر اثر ہوتے ہیں۔ تنزیل لمحوں میں دنیا بدل دیتے ہیں۔!''

''کیا تمہاری بھی دنیا بدل گئی۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''میری دنیا۔۔؟'' قدیر نے کہا۔ ''میری دنیا ہے کیا جو بدل جائے گی۔؟'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

''تمہارے اندر کچھ ہے۔ جب جی چاہے بتانا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ مجھے اچھا نہیں لگا اس کو بے وجہ کریدنا۔ اچانک میرے فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے فون اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز سنائی دی

''اسلام علیکم! کیا حال ہیں کیسے ہیں آپ۔۔۔؟'' انداز بہت پرتپاک تھا۔

''میں ٹھیک ہوں طاہر بھائی آپ کیسے ہیں۔؟'' میں نے طاہر پریس والے کو فوراً ہی پہچان لیا۔

''ممبر صاحب کی ووٹنگ کی پرچیاں چھپ گئی ہیں۔ ساتھ میں کچھ دوسرا لٹریچر بھی تیار ہے۔ گاڑی آنے کو تیار ہے۔ آپ ذرا ڈرائیور کو پتا سمجھا دیجئے۔''

''ممبر صاحب۔!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''آپ نے تو پہلے ہی نتیجے کا اعلان کر دیا۔''

''سرکار نے کہہ دیا ہے نا دیکھ لیجئے گا کہ خادم حسین نے ہی الیکشن جیتنا ہے۔ سرکار جو کہہ دیں وہی ہوتا ہے۔!'' طاہر کے لہجے میں بے پناہ یقین تھا۔

میں نے خادم حسین کو فون تھمایا۔ وہ طاہر کے ڈرائیور کو پتا سمجھانے لگا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ قادری سرکار کیا ہیں؟ کس قدر پر اثر، ذو داثر، تب مجھے پہلی بار ایک فخر کا احساس ہوا۔ میں کتنی اہم ہستی سے منسلک ہوں۔ ایسی ہستی جو لوگوں کی محبت، لوگوں کی عقیدت اور چاہت کا مرکز ہے۔ خود وہ لوگوں کی اصلاح، ان کی کردار سازی، ان کی بھلائی کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔ صلے اور ستائش سے بے نیاز۔ لوگوں کے لئے وقف۔

''کیا سوچ رہے ہیں خلیفہ جی۔؟'' مجھے چونکانے والی یہ آواز حافظ سلمان کی تھی۔ میں نے انہیں دیکھا نا معلوم وہ کب سے کھڑے تھے۔ ''حضور بہت گہری سوچ میں ہیں۔ خیر تو ہے۔؟'' وہ تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

''میں ٹھیک ہوں۔!'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''ارے جناب الیکشن کا نتیجہ تو طے شدہ ہے۔!'' وہ بے حد طمانیت سے بولے۔

''کیا۔۔۔؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

''یہی کہ اپنے خادم حسین ہی ممبر منتخب ہوں گے۔ انشاء اللہ۔ جنہیں ہمارے سرکار کی دعا ہو۔ وہ کیسے ناکام ہو سکتے ہیں۔؟''

حافظ سلمان کا لہجہ بے حد پر یقین تھا۔ میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جب بندہ پور پور یقین اور پیار میں ڈوبا ہوا ہو تو پھر وہی ہوتا ہے جو یقین اور پیار چاہتا ہے۔ ویسے بھی بزرگ کہتے ہیں کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔!''

''لوگوں میں تو جی بڑا جذبہ ہے۔!'' حافظ سلمان نے بات آگے بڑھائی۔ ''کئی دوسرے امیدواروں کی تو بڑی بڑی ہو رہی ہے۔ دو تین نے تو اپنی انتخابی مہم ہی بند کر دی ہے۔ ویسے بظاہر تو سب کا یہی خیال ہے کہ شاہ سکندر گیلانی کی شہادت کے بعد تو سیٹ پکی شاہ عبداللہ گیلانی کی ہے۔۔ مگر۔۔۔!''

''مگر کیا۔۔؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مگر لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ خادم حسین اور عبداللہ شاہ میں کانٹے کا مقابلہ ہو گا۔ ایک درویش کا نمائندہ ہے تو دوسرا سرمائے کا سرخیل، دنیا تو جی پیسے کی ہے۔ مگر سرکار کی دعا تو پیسے کو بھی بے اثر کر دیتی ہے۔!'' ان کا لہجہ بہت پر یقین تھا۔

''یعنی یہ لڑائی حق اور سچ کے ساتھ۔ مفاد پرست فیوڈل ازم کے درمیان ٹکراؤ ہے۔!'' قدیر نے مداخلت کی۔

''کہا تو جا سکتا ہے۔!'' حافظ سلمان نے تائید کی۔ ''مگر لوگوں کو گھر سے نکالنا بھی تو کام ہے۔''

''گھر سے نکالنا کیا مشکل ہے۔؟'' غلام حسین کے ساتھ بیٹھے ہوئے حنیف صحرائی نے کہا۔ ''جب لوگوں کو یہ یقین

ہو کہ ہمارا نمائندہ اصل میں کون ہے۔ ہمارے مسائل کون سمجھ سکتا ہے۔ مکی کی روٹی جس نے چٹنی پیاز کے ساتھ کھائی ہے۔ وہی ہمارے مسائل حل کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ جس کے گھر ہم ہر لمحے پہنچ سکیں۔''

''اور وہ ہمارا خادم حسین ہے۔ حضرت حسینؓ کا خادم۔ قوم کا خادم۔'' منشی اللہ دتہ نے بڑے جذبے سے کہا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ دین کو نرمی اور پیار سے، اس کے اصولوں کو، حقائق اور معاشرت پر منطبق کر کے، کس طرح سے طاقت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو لوگوں پر حد درجے اثر انداز ہو۔ بلاشبہ قادری سرکار نے جو نقشہ ترتیب دیا تھا۔ ہر شئے اسی کے مطابق ہو رہی تھی۔

''لوگ تو اپنے مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اجنبیت کو پسند نہیں کرتا۔ پھر ہمارا نمائندہ بھی اندر سے، باہر سے دیکھا بھالا ہونا چاہیے۔ ہمارے درمیان بیٹھ کر دکھ سکھ پھرولنے والا۔!'' رحمت اللہ حجام نے کہا۔ ''ہم تو سرکار کے فرمان کے مطابق ووٹ صرف اور صرف اپنے بچے کو ہی دیں گے۔ پکی سڑکاں بنیں، اسکول کھلیں۔ ڈسپنسری میں ڈنگر کی جگہ سفید کوٹ والا ڈاکٹر ہو۔'' رحمت اللہ حجام کے لہجے میں آس تھی۔ امید تھی۔ اور آنکھوں میں روشنی۔

''سب ہوگا۔۔ انشاء اللہ سب ہوگا۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ دن دور نہیں، جب راج کرے گی خلق خدا۔۔!''

''ووٹوں کی پرچیاں آ رہی ہیں۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے ہمیں علاقے کی ووٹر لسٹیں مل گئی ہیں۔ جتنے بھی لڑکے میٹرک یا انٹر میں ہیں۔ ان سب کی ڈیوٹیاں لگا دو کہ سب کے نام اور ووٹر لسٹ کا نمبر لکھ لکھ کر پرچیاں مکمل کریں۔ اور اس کے بعد گھر گھر جا کر تقسیم کریں۔'' میں نے ان کو کام بتانے شروع کیے۔

''اگر کوئی بینر لکھنے والا ہے تو اس کو بھی بلواؤ۔ تاکہ اس کو کچھ چیزیں لکھنے کے لئے دی جائیں۔'' میں نے خادم حسین کو مخاطب کیا۔ ''شہر سے طاہر بھائی نے جو گاڑی بھیجی ہے۔ اس میں لٹریچر وغیرہ بھی ہے۔ اس کو فوراً تقسیم کروانے کی تیاری شروع کرنا ہے۔ تاکہ ووٹرز تک بروقت تمام ضروری چیزیں پہنچا میں جا سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پولنگ ایجنٹ کے لئے ہمیں ایک ٹیم تیار کرنی ہے۔ تاکہ اس حلقے کے تمام پولنگ اسٹیشن پر ہمارے ایجنٹ باضابطہ طور پر موجود ہوں۔۔!''

''فہرست میں نے حنیف صحرائی کے ساتھ مل کر بنائی ہے۔!'' خادم حسین نے کہا۔ ''ابا کے کئی دوست ہیں، اپنے کئی امام مساجد ہیں، سرکار کا حکم تھا کہ پولنگ ایجنٹ امام صاحبان کو ہی رکھا جائے۔!''

''چلو کافی کام تو نبٹ گیا ہے۔ اس لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اسی وقت غلام حسین نے کہا۔ ''کام اور باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے کھانا کھا لیا جائے۔!''

''ٹھیک ہے۔۔!'' اچانک ہجوم چھٹنے لگا۔ لوگ سلام کر کے رخصت ہونے لگے۔

خادم حسین نے کہا۔ ''بھائیو آپ لوگ کھانا کھا کے جائیں۔۔۔!''

''او یار۔۔!'' اللہ دتہ حجام نے خوش دلی سے کہا۔ ''ہمارے بچوں کو پڑھا بھی رہے ہو۔ ہمارے لئے لڑ بھی رہے ہو۔ اب کھانے کا بوجھ نہ ڈالو ہم پر۔ ہم لوگ گھر سے کھانا کھا کر آئے ہیں۔!''

''ہاں ٹھیک کہہ رہا ہے دتہ۔۔!'' شریف حلوائی نے کہا۔ ''الیکشن والے دن رات میں میری طرف سے ایک کٹا ہے۔ اس کو بنا کر کھائیں گے۔ گوشت اور چاول کیا کہتے ہیں شہر والے برانی۔۔!'' وہ ہنسا۔

''برانی نہیں بریانی۔۔!'' حافظ سلمان نے اس کی تصحیح کی۔

''اور میٹھے چاول میری طرف سے۔!'' عبدالرشید نانبائی نے کہا۔

''دیکھتے ہی دیکھتے الیکشن کی دعوت کا نا صرف کھانا طے ہو گیا۔ بلکہ اس کے لئے سب نے اپنی اپنی خدمات بھی پیش کر دیں۔ محفل برخواست ہو گئی۔ ہم لوگ کھانے کے لئے اٹھ گئے۔

**تصوف اور محبت کی اِس پراسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے**

پلیٹ فارم نمبر کی 3 شعلہ سامان تحریریں

# شعلوں پہ رقص



حنا بشریٰ

اُس محبت کا قصہ عجب، جس نے اُس نوجوان کو مرتد بنا دیا تھا

میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں۔ آبائی شہر حیدرآباد مگر اپنا ذاتی اسپتال بنانے کا جنون مجھے داتا کی نگری میں کھینچ لایا۔ چھوٹی بہن کی شادی تھی تمام مصروفیات ترک کیں اور حیدرآباد کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔ پابندی وقت کی ایسی عادت پڑی تھی کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی جائے مقام پر پہنچ جاتا تاکہ خوامخواہ کی افراتفری سے بچ سکوں۔ شام کا وقت تھا ملگجا سا اندھیرا پھیلنے لگا۔ موسم میں خنکی تھی اور ہلکی ہلکی دھند بھی آسمان پر چھانے کی تیاری میں مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنا سفری بیگ پکڑا اور ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ لوگوں کا جمِ غفیر ہجوم تاحدِ نگاہ دکھائی دیا۔ ابھی ٹرین آنے میں خاصا وقت تھا۔ ایک گوشے میں سنگی بینچ پر میری نظر جا ٹھہری۔ وہ گوشہ شور شرابے سے قدرے محفوظ دکھائی دیا تو میرے قدم اس جانب اٹھ گئے۔

زندگی کو جس شکل میں یا جس رنگ میں دیکھنا ہو پلیٹ فارمز یا ریلوے اسٹیشن پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کہیں زندگی پیوند زدہ چوغہ پہنے فقیرانہ شکل میں دکھائی دے گی۔ کہیں قلی کی شکل میں بوجھ اٹھائے ہوئے نظر آئے گی۔ تھکی تھکی شکستہ زندگی جس نے ظاہری بدن پر سرخ لبادہ اوڑھا ہوتا ہے مگر اس کا باطن کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد ہوگا۔ کہیں زندگی انتظار کرتی نظر آتی ہے۔ ایسا انتظار جس میں بے قراری اور خوشی کا عنصر غالب ہوگا۔ اپنے پیاروں سے عرصہ دراز کے بعد ملنے کی خوشی اور کہیں کسی سنگی آہنی بینچ پر سہمی تنہا بیٹھی زندگی اپنے محبوب کی منتظر ہوگی۔ وہ محبوب جس کی خاطر وہ اپنوں کو دغا دے آئی تمام کشتیاں جلا آئی۔ کہیں آج وہ محبوب اسے ہی نہ دغا دے جائے اور وہ انتظار کی سولی پر لٹکی رہ جائے اور کہیں زندگی چادر تانے مایوسی سے بھری کسی بوسیدہ گٹھڑی کی طرح پڑی ہوگی۔ میں کافی دیر تک زندگی کی مختلف شکلوں کو محویت سے دیکھتا رہا۔ اداس موسم مجھ پر طاری ہونے لگا۔ سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے چائے کا کپ لیا اور وقت گزارنے کے لیے بک اسٹال سے کتاب خریدی اور غرقِ مطالعہ ہوگیا۔ اردگرد کے ماحول سے بیگانہ میں مطالعے میں مصروف تھا کہ میرے قریب ہی بینچ پر بوسیدہ سی گٹھڑی میں سے زندگی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں قدرے متحیر ہوا کیونکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید کسی مسافر کا سامان پڑا ہوگا مگر اس گٹھڑی میں تو سانس لیتا ہوا انسان تھا۔ وہ شخص کراہتے ہوئے قدرے مچلنے لگا۔

”رب العزت مجھے معاف کر دے۔“ کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میرے پردۂ سماعت سے ٹکرائی۔ مہین آواز میں سسکیاں بھری جا رہی تھیں اور پھر چند لمحوں بعد سسکیاں دب گئیں اور مکمل سکوت چھا گیا۔

میں ابھی ڈور کا ایک سرا سلجھا رہا تھا کہ دوسرا الجھ گیا۔
میرے پیروں کے قریب گاڑھا تازہ خون دکھائی دیا۔ وہی شخص جو چند لمحے پہلے کراہ رہا تھا اس کے پیروں سے خون رس رہا تھا۔

''ارے تم زخمی ہو۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔'' میں نے گھبرا کر کہا اور چادر کھینچ ڈالی۔

وہ پچیس سالہ نوجوان تھا۔ شاید وہ کبھی خوبرو تھا مگر اب چہرے پر رنج و ملال اور وحشت کے رنگ نمایاں تھے۔ گلے میں موٹے منکوں کی مالا اور ماتھے پر تلک، تن پر کیسری رنگ کا کرتا اور سفید تہمبند دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ نوجوان کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ سچائی اور نرمی میرے اندر سے عود کر نکلی۔ میں ہمیشہ فرسٹ ایڈ کا سامان رکھتا تھا۔ میں روئی سے اس کا زخم صاف کرنے ہی لگا تھا کہ اس نوجوان نے مجھے روک دیا۔

''مت کھاؤ مجھ پر رحم میں ہمدردی کے قابل نہیں ہوں۔'' آنسو اس نوجوان کے چہرے کو بھگوتے چلے گئے۔

''ارے پاگل ہو گئے ہو، کس قدر گہرے زخم ہیں اور پیپ پڑ چکی ہے۔ بے وقوف انسان تم چلتے کیسے ہو ان زخموں کے ساتھ۔'' میں نے کہتے ہوئے پھر سے اس کے زخم صاف کرنے لگا۔

''کوئی حق نہیں میرا کہ اب میں رب العزت کی زمین پر آزادانہ گھومتا پھروں۔'' وہ نوجوان یوں تڑپ تڑپ کر رویا کہ میرے دل کے طبق ہلا ڈالے۔

''کیا بات ہے تم کیوں رو رہے ہو اور یہاں لاوارثوں کی طرح زخمی حالت میں کیوں پڑے ہو؟'' اس کے منہ سے دوسری بار رب العزت کا لفظ سن کر میرا ذہن الجھا ہوا ریشم بن گیا۔

وہ چپ چاپ آنسو بہاتا رہا۔ میری بات کے جواب میں خاموش رہا۔

''اچھا تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی سعی کی۔

''مرتد۔'' وہ ایک دم بولا۔

میں اس کے لفظ پر ساکت رہ گیا تھا کتنی بڑی بات اس نے یوں لمحوں میں کہہ ڈالی تھی۔

''دیکھو میں ڈاکٹر ہوں۔ تم مجھے اپنا دکھ کہہ سکتے ہو۔ تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا۔''



میں ہمدردی سے بولا۔

''کیا کریں گے مجھ بدنصیب کی باتیں سن کر۔ کتاب زیست بوسیدہ دیمک زدہ ہو چکی ہے۔ ہر صفحہ کھولنے کی کوشش میں ہی پھٹ جائے گا اور ہاتھوں میں بھربھری سی دیمک باقی رہ جائے گی۔''

باتوں سے وہ مجھے خاصا پڑھا لکھا لگا۔

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔ کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہی کم ہو گا۔'' میں نے کہتے ہوئے ہمدردی سے اس کے بدن پر ہاتھ پھیرا کہ شاید میرا دلاسہ ہی اس کی زبان پر پڑا قفل کھول دے۔

چند لمحوں کے لیے فسوں خیز خاموشی چھا گئی۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا اور اس کی آنکھوں میں کرب اور لبوں پر زخمی الفاظ کا وحشیانہ رقص جاری ہو گیا۔

''میں نوفل ابراہیم جامع مسجد حیدرآباد کے ممتاز خطیب مفتی محمد ابراہیم کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کے مزاج میں سختی اور مذہبی کٹر پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں ابھی کچھ ہندو گھرانے حیدرآباد میں آباد تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت مگر ہندو اقلیت میں تھے۔ بابا جان بہت دفعہ ہندوؤں کے خلاف تحریک چلا چکے تھے۔ اس شہر کو خالی کروانے کے لیے ان کے خیال کے مطابق مسلمان اور ہندوؤں کا ساتھ رہنا موزوں نہیں۔ وہ اپنے کسی شاگرد کو کسی ہندو کے ساتھ ہنستا بولتا دیکھتے تو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتے۔ مسجد سے ملحقہ میدان میں درخت سے باندھ کر اس بری طرح سے اسے پیٹتے کہ لہولہان کر دیتے۔

''اکبر بادشاہ کے دور میں مسلمان اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ ہندوؤں سے آزادانہ میل جول کرنے لگے تھے۔'' وہ اکثر خطبات میں یہ کہا کرتے۔

''دور رہا کرو ان خبیثوں سے۔ شرک اتنی خاموشی سے انسان کے دل میں داخل ہوتا ہے کہ اسے خود بھی خبر نہیں ہوتی۔'' وہ کسی شیر کی طرح دہاڑتے تو پورا علاقہ یوں سہم جاتا کہ جیسے ببر شیر کے دہاڑنے پر جنگل کے جانور خوفزدہ ہو کر سہم جاتے ہیں۔

مجھے انہوں نے دین و دنیا دونوں کی تعلیم دلوائی۔ پورے صوبے میں جب میں نے ٹاپ کیا تو انگریزی پر کمال دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے مجھے ملازمت کے ساتھ ساتھ گھروں میں جا کر ہوم ٹیوشن پڑھانے کی آفرز بھی ہونے لگیں۔ میرے اسٹوڈنٹس میں ہندو بھی شامل ہونے لگے جس پر اکثر بابا جان اعتراض کیا کرتے۔ اس دوران مجھے ایک معزز ہندو برہمن گھرانے سے جو خود بھی اپنے مذہبی معاملات میں حد درجہ کٹر تھے۔ ایک ایف اے کی طالبہ کو انگریزی پڑھانے کی آفر ہوئی۔ ایک تو لڑکی اور دوسری ہندو بابا جان نے سختی سے انکار کر دیا مگر امی جان کے منانے پر اجازت دے دی۔

وہ گھرانہ باقی ہندو گھرانوں میں قدرے مالدار تھا۔ بڑے علم دوست قسم کے لوگ تھے پڑھے لکھے لوگوں کی عزت کرنے کا خوب فن آتا تھا۔ میں نے چندر المکھی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اپنی نظروں کو سختی سے جھکائے رکھتا۔ غلطی سے بھی ایک نگاہ غلط نہ ڈالتا ویسے بھی میرا نکاح ہو چکا تھا اور چند مہینوں بعد شادی تھی۔ چندر المکھی بلا کی ذہین و فطین لڑکی تھی۔ ایک دن دوران تدریس میرے منہ سے کوئی لفظ غلط نکلا تو چندر المکھی کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی تو گویا جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ نظریں جھکائے رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ نظر بے اختیار اٹھی تو پھر پلٹ نہ سکی۔ وہ پری چہرہ تو ملکہ حسن تھی۔ خوب صورت شربتی آنکھوں پر لمبی پلکوں کی جھالر گری ہوئی تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، روشن پیشانی پر چمکتی بندیا، دودھیا رنگت پر گلابی ساڑی اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ گلابی مخروطی انگلیوں کو گلاب چہرے پر رکھے وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہنستے ہنستے جھیل جیسی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

''ماشا کیجیے گا سر مجھ سے ہنسی روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔

وہ ہنستی جا رہی تھی اور میرے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر گئی تھی نظریں زاویہ بدلنے سے انکاری تھیں۔

☆......☆

چندر المکھی میرے حواسوں پر چھا گئی۔ دل کے سنگھاسن پر وہ کسی مہان دیوی کی طرح براجمان ہو گئی میرے ہوش و خرد کو بیگانہ کر گئی تھی۔ دل اسے کثرت سے یاد کرتا رہتا کہ مجھے خود پر غصہ آنے لگتا۔ تو دل مجھے ڈپٹ کر رکھ دیتا۔ محبت کا آسیب دل و جان سے یوں لپٹا کہ کسی ٹونے ٹوٹکے کا اثر ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی جھاڑ پھونک کا۔

محبت کا آسیب جیت گیا اور میں ہار گیا پھر میرے

ساتھ وہی ہونے لگا جو عاشق کے ساتھ محبت کی ابتدائی منزل پر ہوتا ہے۔ آہیں، سسکیاں، رت جگے یہی تو ہیں محبت کی سوغاتیں جو ہر دل کو محبت عطا کرتی ہے۔ مجھے بھی عطا کی جانے لگیں میرا وجود صلیب پر لٹک کر رہ گیا۔ وہ پور پور میں بس چکی تھی۔ جیسے ہی اس کے گھر جانے کا وقت ہونے لگتا میری حالت مرض الموت میں مبتلا اس شخص جیسی ہونے لگتی جس کا آدھا جسم بے جان ہو چکا ہو اور باقی میں ابھی جان ہو۔

بہت دفعہ ارادہ کرتا کہ اظہار محبت کر دوں مگر ہمت نہ ہوتی۔ چندر امکھی میری حالت سے بے خبر سر جھکائے کتاب پڑھ رہی ہوتی اور اپنی ریشمی سیال لٹ کو پین سے پیچھے ہٹاتی۔ میں کرسی سے ٹیک لگائے اس کا کتابی چہرہ پڑھتا رہتا۔ دل ان ساعتوں کے امر ہونے کی دعا کرتا۔

''سر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' میرے چہرے کے اضطراب پر وہ ٹھٹک کر بولی۔

''ہاں.....ٹھیک ہے۔'' میں نے بہانہ تراشا۔

''سر آپ کچھ دن کے لیے چھٹی لے لیں اور دوا لے کر آرام کریں۔'' وہ میری حالت سے بے خبر بولتی گئی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ صاف کہہ دوں۔ 'میری طبیب تو تم ہو۔ نبض پکڑو میری اور تشخیص کرلو مرض کی۔ مرض محبت لگ چکا ہے جو کسی دوا و آرام سے اب ٹھیک ہونے والا نہیں۔'

''سر کل ہمارا مذہبی تہوار ہولی ہے۔ ایک چھٹی مل جائے گی؟'' وہ دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ہاں۔'' میں نے بنا بولے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

☆......☆

ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرا تھا وہ اپنا مذہبی تہوار جوش و خروش سے منا رہے تھے۔ بابا جان ان کے خلاف زہر نکال نکال کے تھک نہیں رہے تھے اور جب یہ دیکھتے کہ مسلمان بھی شریک ہیں تو غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا۔ بہت سے شاگردوں کو ڈھولی کے کتے کی طرح پیٹ ڈالا اور بہت سے لوگوں کے پیر گرم سلاخ سے داغ ڈالے تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں۔ عجب ستم ظریفی تھی کہ باپ اتنا ہندوؤں کا دشمن تھا اور بیٹا ہندو لڑکی سے محبت کر بیٹھا اور ستم بالائے ستم کہ ایک دن بھی دیدار کیے بغیر چین نہ آتا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا چندر امکھی کے در پر لے گئی مگر پھر خیال آیا کہ اس نے چھٹی کا کہا تھا مگر درِ محبوب پر پہنچ کر دیدار کیے بغیر لوٹ جاؤں یہ گوارا نہ تھا سو اندر داخل ہو گیا۔

کشادہ صحن میں رنگ و روشنی کی بہار تھی۔ وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ تہوار منا رہی تھی۔ میں جو دیدار محبوب کے لیے بے چین تھا یکا یک کوئی نازک سا وجود مجھ سے ٹکرا گیا وہ چندر امکھی تھی۔

''سر آپ؟ آج تو چھٹی تھی سر؟'' وہ بہت شور ہونے کے باعث قدرے اونچی آواز میں بولی۔

وہ یوں مجھ سے مخاطب تھی کہ جیسے مجھے اس کے الفاظ سنائی نہ دے رہے ہوں۔ اس کے چاند چہرے پر رنگ لگے تھے۔ میرے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی ساڑی کے رنگ میرے سفید کرتے کو بھی رنگدار کر گئے۔ جب کہ میرا وجود تو پہلے ہی اس کی محبت میں رنگ چکا تھا۔

''سوری سر!'' وہ مسکراتے ہوئے اپنی ساڑی کے پلو سے میری قمیض کو صاف کرنے لگی مگر رنگ مٹنے کی بجائے اور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کو اتنا قریب دیکھ کر میں نے شدتِ محبت سے مغلوب ہو کر اس کی کلائی تھام لی۔ اس کی آنکھوں میں خوف و حیرت کے رنگ ساتھ ساتھ نظر آنے لگے۔

''چھوڑیں سر!'' وہ اس افتاد ناگہانی پر بری طرح گھبرا کر اپنی کلائی میری گرفت سے چھڑانے کی سعی کرنے لگی مگر میری مضبوط گرفت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

''سر کیا ہو گیا ہے آپ کو، کوئی دیکھ لے گا۔'' خوف آنسوؤں کی شکل میں اس کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔

وہ بے بسی سے رونے لگی میں نے عالم مدہوشی میں اس کی دوسری کلائی بھی تھام لی۔ میری لہو رنگ ہوتی آنکھیں فسانہ محبت تحریر کرنے لگیں تو وہ پڑھتے ہی خوفزدہ سی ہو گئی۔

''چندر امکھی کہاں رہ گئی ہو۔'' عقب سے اس کی سکھیوں نے پکارا تو وہ زور لگا کر مجھے دھکیلتی ہوئی بھاگ گئی۔

میں خاموشی سے اظہار محبت کر آیا تھا۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ محبت کے حسین جذبے سے سرشار میں گھر داخل ہوا ہی تھا کہ دھر لیا گیا۔

''یہ رنگ کہاں سے لگوا کر آئے ہو صاحبزادے۔'' بابا جان کی گرجدار آواز پر میں چونکا۔

''وہ بابا جان..... ایک ہندو لڑکی ٹکرا گئی تھی۔'' بابا جان کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرسکا۔

''بدبخت......بدذات......آج تیرے لباس پر رنگ لگ گیا کل کو تیری ذات پر ان مشرکوں کا رنگ چڑھ گیا تو کیسے اتارے گا۔'' انہوں نے کہتے ہوئے پوری طاقت سے لاٹھی کی ضرب میرے بازو پر ماری کہ میں تڑپ اٹھا۔

''معاف کر دیں مولوی صاحب۔'' امی جان میری ڈھال بن گئیں۔

''سمجھا لو اپنے لاڈلے کو آئندہ میں ایسا کوئی تماشا نہ دیکھوں ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔'' وہ جاتے جاتے پھر سے میرے بازو پر لاٹھی مار گئے۔

ساری رات میں تکلیف سے تڑپتا رہا مگر یادِ محبوب زخموں پر مرہم رکھتی رہی۔ اگلے دن وقت سے پہلے جا پہنچا وہ مجھ سے خوفزدہ تھی۔ میری طرف دیکھنے سے بھی کترا رہی تھی۔ میں بات کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ کتاب کو درمیان میں لا کر موضوع بدل دیتی۔ میں اشاروں، کنایوں میں اس سے اظہارِ محبت کرتا مگر وہ چہرے پر بے نیازی سجا لیتی۔ میں خاموشی سے کتاب میں خط رکھ دیتا تو اگلے دن خط کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

''سر میرے گھر والے کسی اور ٹیچر کا بندوبست کرنا چاہ رہے ہیں۔'' وہ بے رحمی سے کہتی مقصد مجھے صرف اذیت دینا تھا جب کہ میں بخوبی جانتا تھا کہ اس کا گھرانا میری تعلیمی قابلیت کا کس قدر معترف ہے مگر میں خاموشی سے سہہ لیتا۔ دل جل کر رہ جاتا مگر میں دھواں باہر نہ نکلنے دیتا۔

وہ میری نیت پر شک کر رہی تھی۔ وہ میری محبت پر ہوس کا الزام لگا رہی تھی۔ میں اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ میں تمہاری محبت میں بے خود ہو گیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان خاموشی طویل ہوتی جا رہی تھی جو میری اذیت کا باعث بن رہی تھی۔ ایک دن اس کے گھر پہنچا تو ملازم نے بتایا۔

''آج گھر پر کچھ مہمان آئے ہیں اس لیے چندرا مکھی پڑھنے نہیں آئے گی۔'' میں بے قرار ہو گیا۔ نماز میں بھی دل نہ لگا کیونکہ دل تو صنم آشنا ہو چکا تھا۔

امی جان میری شادی کا ذکر چھیڑتیں تو میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھتا۔ چندرا مکھی کے علاوہ مجھے کسی کا ساتھ منظور نہ تھا۔

''کل کوئی خاص مہمان آئے تھے۔'' میں نے پہلی بار بے تکلفی سے سوال کر ڈالا۔

''جی سر......میرے رشتے کے لیے کچھ لوگ آئے تھے۔'' وہ قدرے درشتی سے بولی تو تیکھے تیور ناگواری کے غماز دکھائی دیئے۔ وہ مختصر بولی اور کتاب میری جانب بڑھا دی۔

میں نے غصے سے کتاب میز پر پٹخ ڈالی اور اس کی صندل جیسی باہوں کو پکڑے ہوئے اسے اپنے روبرو کر لیا۔ میری آنکھیں انگارے کی طرح دہکنے لگیں۔

''چندرا مکھی! میں تمہاری محبت میں مر رہا ہوں۔ جانتے ہوئے بھی ایک بار بھی تم نے میرا حال نہیں پوچھا اور اوپر سے مجھے اپنے رشتے کی خبر سنا رہی ہو۔ اگر تم میرے علاوہ کسی کی بھی ہوئیں تو میں تمہاری جان لے لوں گا اور خود کو بھی ختم کر ڈالوں گا۔'' میں نے کہتے ہوئے سختی سے اسے دھکا دیا۔

وہ کانچ کی گڑیا کی طرح فرش پر جا گری اور کانچ ہر جگہ بکھر گیا۔ وہ آنکھوں میں حیرت لیے مجھے دیکھتی رہ گئی اور میں باہر نکل آیا۔

میری دیوانگی کھل کر باہر آ چکی تھی۔ میں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے راستے میں کھڑا ہو جاتا۔ کبھی سخت دھوپ میں جلتا اور کبھی سخت بارش میں کھڑا بھیگتا رہتا۔

☆......☆

آسمان کو سیاہ بدلیوں نے گھیر رکھا تھا۔ چندرا مکھی پوجا پاٹ میں مصروف تھی اور میں بارش میں بھیگتا اس کا منتظر تھا۔ وہ مندر سے نکلی تو مجھ پر نظر پڑی۔

میری حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی۔ میری محبت کی تپش نے اسے بھی موم کی طرح پگھلانا شروع کر دیا۔ آج وہ مجھے کمزور پڑتی ہوئی دکھائی دی۔ آنسو بھری آنکھیں چرا کر وہ جانے لگی تھی کہ میں نے اسے کا راستہ روک لیا۔ اس کا کترانا میرے جنون کو ہوا دے رہا تھا۔

''سر میں آپ کے آگے بنتی کرتی ہوں مجھے مشکل میں نہ ڈالیں۔ مجھے اپنے ساتھ اس تکلیف دہ راستے پر نہ گھسیٹیں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔

''چندرا مکھی کیسی مشکل۔'' میں نے تڑپ کر اس کے جڑے ہوئے ہاتھ تھامے۔

''سر آپ کا نکاح ہو چکا ہے کچھ مہینوں بعد شادی

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''صرف نکاح ہوا ہے۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ کیونکہ محبت تو بے پناہ میں تم سے ہی کرتا ہوں اور شادی بھی تم سے کروں گا۔'' میری بات سن کر وہ بت کی طرح ساکت ہوگئی۔ بادل اس زور سے گرجا کہ دل دہل گیا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے درمیان مذہب کی دیوار ہے جو نہ آپ گرا سکتے ہیں اور نہ میں۔'' وہ چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''چندر امکھی! میں تمہاری محبت میں اتنی دور نکل گیا ہوں کہ واپسی کا سفر ممکن نہیں۔ میں تمہارے لیے اس جہان سے ٹکرا جاؤں گا۔ ہر دیوار گرا دوں گا۔'' میں اپنی دیوانگی پر ڈٹا رہا۔

اور آخر چندر امکھی نے میرے جذبۂ جنون کے سامنے ہار مان لی۔ اس کی نگاہوں میں اقرارِ محبت جھلملانے لگا۔

وادی محبت میں میری فتح کا اعلان کر دیا گیا۔

میرے دل کی سلطنت پر چندر امکھی کی حکمرانی تھی۔

میں بارش میں بھیگتا ہوا گھر پہنچا تو بابا جان کو دروازے پر اپنا منتظر پایا۔ ان کی انگارہ آنکھیں مجھے بھسم کر دینے کے درپے تھیں۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' وہ دہاڑے۔

''وہ ایک دوست ساتھ تھا۔'' میں قدرے ہکلاتے ہوئے بولا۔

''تمہیں تو بارش میں بھیگنے سے سخت نفرت ہے۔ یہ کون سا دوست ہے جس نے بارش میں بھگو ڈالا۔'' ان کی کھوجتی نگاہیں میرے چہرے پر جم سی گئیں تو میں نے نظریں جھکا لیں۔

''نوفل! سچ سچ بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟'' انہوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

''وہ بابا جان مسجد سے......!'' ان کے زوردار تھپڑ نے میرا فقرہ مکمل نہ ہونے دیا۔

''بے غیرت انسان! اس لڑکی نے تجھے دیوانا کر دیا ہے کہ پہلی بار باپ کے سامنے جھوٹ بولا اور اس سے بھی زیادہ ہلاکت یہ کہ تو نے مندر کو مسجد بنا ڈالا۔ میں نے خود تجھے اس لڑکی کے ساتھ مندر کے پاس کھڑے دیکھا ہے۔'' انہوں نے اپنی لاٹھی پکڑی تھی کہ میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

''بابا جان میں چندر امکھی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اس کے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔'' میں گڑگڑایا۔

''تو اس ہندو لڑکی کی محبت میں اصل راستے سے ہٹ گیا ہے۔ یہ محبت نہیں گمراہی ہے۔'' وہ غصے سے بولے۔

پھر وہ مارتے رہے میں مار کھاتا رہا۔ میرا جسم لہولہان ہوگیا مگر زخمی وجود بھی چندر امکھی ہی پکارتا رہا۔ بابا جان نے میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی مگر میں چندر امکھی سے ملتا رہا وہ میرا زخمی وجود دیکھتی تو آنسو بہاتی میرے زخموں پر مرہم لگاتی۔ میری اور اس کی ملاقاتیں مندر میں ہونے لگیں۔

محبت سات پردوں میں بھی چھپ نہیں سکتی۔ اس کے گھر والوں کو علم ہوا تو اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ ہر بندہ بشر کی زبان پر نوفل ابراہیم اور چندر امکھی کی محبت کے چرچے ہونے لگے۔

میری شادی کا دن آن پہنچا۔ مجھے جو بھی کرنا تھا فوری کرنا تھا۔ ذرا سی دیر مجھے چندر امکھی سے دور لے جاتی، میں مہ جبین کے گھر جا پہنچا۔ وہ زرد کپڑوں میں ملبوس تھی مجھے دیکھ کر گھبرا اٹھی۔

''مہ جبین میں تم سے محبت نہیں کرتا اور نہ تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی محبت چندر امکھی کے حوالے کر چکا ہوں۔ اس لیے تمہیں ہر رشتے سے آزاد کرتا ہوں۔'' میں نے کھڑے کھڑے وہ تین الفاظ کہہ ڈالے جس کے کہنے کے بعد میرا اور اس کا نکاح ختم ہوگیا۔

میں آندھی طوفان کی مانند اس کے گھر سے نکلا۔ اس کے گھر سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہوئیں یوں جیسے وہاں کسی کی موت ہوگئی ہو مگر مجھے کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔ میں چندر امکھی کے گھر پہنچ گیا وہ ننگے فرش پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی مجھے دیکھا تو وہ ضبط نہ کر سکی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ یہ راہ آسان نہیں ہے ہمارے درمیان بہت سی دیواریں ہیں۔'' وہ میرے بازو کے ساتھ سر لگائے رونے لگی۔

''چندر امکھی میں تمہاری خاطر ہر دیوار گرا دوں گا۔ تم

چلو ہم ابھی اور اسی وقت شادی کریں گے۔'' میری دیوانگی انتہا پر پہنچ گئی۔

''یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' چندرا مکھی کے بابو جی کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

وہ قہر آلود نگاہوں سے ہمیں گھور رہے تھے۔

''نوفل صاحب ہم آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہمارے لیے آپ انسان کے روپ میں بھگوان تھے مگر آپ نے ہماری عزت کا یہ بدلہ دیا کہ ہماری بیٹی کو ہمارے خلاف بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔'' وہ کرختگی سے بولے۔

''میں چندرا مکھی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں کسی فقیر کی طرح بھیک مانگتے ہوئے بولا۔

''آپ مسلمان اور ہم ہندو...... یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' ان کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگیں۔ مولوی ابراہیم کی ہندوؤں سے نفرت اور اس کا کھلم کھلا اظہار ان کے اپنے بیٹے کو ہی مہنگا پڑ گیا۔

''چندرا مکھی مسلمان ہو جائے۔'' میں نے کہتے ہوئے چندرا مکھی کو دیکھا۔

وہ بھی جدائی کے غم میں آنسو بہاتی نظر آئی۔

''نہیں نوفل صاحب! اپنا مذہب ہمیں بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا آپ کو۔ محبت کی پٹی آپ کی آنکھوں پر بندھی ہے اسی لیے قربانی بھی آپ کو دینی ہوگی۔'' چندرا مکھی کے پتا جی نے مجھے آزمائش کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

''کیسی قربانی؟'' میں حیران ہوا۔

''ہمیشہ ہم ہندو کیوں اپنا مذہب چھوڑا کریں۔ اگر آپ کی محبت اتنی سچی ہے تو آپ اپنا مذہب قربان کریں میں ابھی اسی وقت آپ دونوں کا بیاہ کروا دوں گا اور پھر......''

اندھی محبت اپنا کام کر گئی۔ سورج ڈوب گیا پوری دنیا میں تاریکی چھا گئی۔ چراغ تلے اندھیرا ہو گیا، رحمان کا بندہ بھگوان کے چرنوں میں جا بیٹھا۔ رحمان کے بندے نے عہد الست (ہر روح جو پیدا ہونے کے بعد اللہ سے وعدہ کرتی ہے کہ اسی کی پابند رہے گی اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکائے گی) توڑ دیا۔

☆......☆

ٹرین اسٹیشن پر آرکی۔ ٹرین کی وسل نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کروائی وہ ہندو نوجوان خاموشی سے یاسیت بھری آنکھیں لیے دور آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم ٹرین سے اترنے چڑھنے میں مگن تھا مگر میرا دھیان اس نوجوان کی طرف تھا۔

''بولو دوست! چپ کیوں ہو...... پھر کیا ہوا؟'' میں تجسس بھرے انداز میں بول اٹھا۔

''مولوی ابراہیم کا بیٹا...... مرتد ہو گیا۔'' اس نوجوان کے الفاظ کیا تھے گویا دھماکا ہو گیا تھا۔ اتنی تیز روشنی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ حیرت کے مارے میں گنگ رہ گیا۔

''مرتد!'' لفظ سنتے ہی میرے دل کی رگیں کٹنے لگیں۔ میں جو ہمدردی سے اس کے پیروں کا زخم صاف کر رہا تھا میرے ہاتھ خود بخود رک گئے۔ میں بالکل فراموش کر چکا تھا کہ مجھے حیدرآباد جانا ہے کہیں ٹرین نہ نکل جائے۔

''میں نے کہا تھا نا ڈاکٹر صاحب میں قابل نہیں ہوں ہمدردی کے!'' محبت سچی ہو تو بھٹکے ہوئے کو سیدھا راستہ دکھاتی ہے مگر میری اندھی محبت نے مجھے بھٹکا دیا۔'' اس کے لہجے سے تاسف عیاں تھا پھر سسکیاں اور آہیں بلند ہونے لگیں میں تسلی کے دو بول بھی نہ کہہ پایا۔

''تم یہاں کیسے آئے؟'' میں نے اپنی حیرت و گھبراہٹ حتی المقدور چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں مرتد ہو گیا۔ اپنے مذہب کی نفی دے دی اور ہندو دھرم اپنا لیا۔ آگ کے گرد سات پھیرے لگائے اور چندرا مکھی اور میں یک جان دو قالب ہو گئے۔ میں خوشی و محویت سے اسے تک رہا تھا کہ مندر کے باہر شور بلند ہوا۔ بابا جان اپنے شاگردوں کے ہمراہ پہنچ گئے۔ میرے سر پر ڈنڈا پڑا تو میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی میں مسجد سے ملحقہ میدان میں درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میرے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پیروں کو بابا جان نے گرم سلاخوں سے داغ دیا تھا گویا پیروں میں آگ لگی تھی۔

''نوفل یہ تو نے کیا کر لیا بدنصیب۔'' امی جان بابا جان سے چھپ کر مجھ سے ملنے آئیں میرے ہندوانہ

روپ کو دیکھ کر ان کا کلیجہ پھٹنے لگا۔

''امی ..... چندرا مکھی کہاں ہے۔'' میں بمشکل بولا۔

''مرگئی وہ جہنمی اور جاتے جاتے تجھے بھی جہنمی کر گئی بدبخت۔'' امی جان غم سے چیخیں اور ماتھا پیٹنے لگیں۔

''نہیں وہ نہیں مر سکتی۔ ابھی تو ہماری شادی ہوئی تھی چاند کا ٹکڑا لگ رہی تھی وہ ..... ابھی تو میں نے جی بھر کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔'' میں یوں تڑپا کہ آنکھوں سے دریا بہا ڈالے۔

''اپنے رب سے رشتہ ختم ہونے کا تجھے کوئی ملال نہیں ابھی بھی وہ ناگن یاد آ رہی ہے۔'' امی رونے لگیں مگر مجھے صرف چندرا مکھی کی فکر تھی ایک ماں کے دل پر کیا گزر رہی تھی مجھے کوئی مطلب نہ تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو ہندوانہ حلیے میں دیکھ کر ایک ماں کے دل پر کیا گزر رہی تھی، یہ ایک ماں ہی جان سکتی تھی۔

''نوفل تو یہاں سے چلا جا تیرے بابا جان تجھے جان سے مار ڈالیں گے اپنے بیٹے کی لاش پر رونے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔'' وہ روتے روتے میری رسیاں کھولنے لگیں۔

''نوفل اگر تو مر گیا تو تجھے دفنایا جائے گا یا جلایا جائے گا۔'' وہ دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔

''نوفل تو یہ شہر چھوڑ کر چلا جا۔'' انہوں نے مجھے سختی سے دھکا دیا زخمی پیروں سے کھڑا ہونا بھی محال تھا۔

''امی جان ایک دفعہ چندرا مکھی کو دیکھنے دیں میں اپنے ساتھ اسے لے جاؤں گا۔'' میں ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ مگر آہ کہ ایمان بھی گیا اور محبت بھی نہ ملی۔ چندرا مکھی جانے کہاں چلی گئی تھی میں کچھ جان نہ پایا۔ میری اندھی محبت نے مجھے دربدر کر دیا۔ میں لاہور آ گیا۔ اذان کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو لمحے کے لیے بھول گیا کہ میں اس کے مقدس گھر میں داخل ہونے کا حق کھو بیٹھا ہوں۔ میں مسجد میں داخل ہونے لگا تو چند نمازیوں نے روک دیا۔

''ارے اندر کہاں گھسے آ رہے ہو۔ سامنے مندر میں جاؤ نا پوجا پاٹ کے لیے۔'' یہ الفاظ سن کر میری عقل پر پڑا اندھی محبت کا پردہ اترنے لگا۔ میں نے کیا کھو دیا کیا چھوڑ دیا تھا۔ اذان کی آواز کانوں میں پڑتی ہے تو دل میں ٹیس اٹھتی ہے۔ مندر سے آتی گھنٹیوں کی آواز سن کر دل بین ڈالنے لگتا ہے۔ رقصِ ابلیس جاری ہے رحمان کے ایک اور بندے کو بھٹکا کر۔'' وہ بے نام شخص چپ ہو چکا تھا۔

میرے اندر گہری خاموشی چھانے لگی۔ ہمدردی کے دو بول بھی میرے پاس نہیں تھے۔

ٹرین کی روانگی کی وسل بجنے لگی۔ اس قدر شور تھا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ ایک ایک لمحہ محال ہوا جا رہا تھا۔ وسل کے شور میں کوئی چنگھاڑ رہا تھا کہ نوفل ابراہیم ..... نوفل ابراہم مرتد ہو گیا۔'' میں نے خاموشی سے اپنا سامان پکڑا اس پر ہمدردی بھری نگاہ ڈالی اور ٹرین میں جا بیٹھا۔ دل وحشت سے رونے لگا تھا۔ میں نے کھڑکی سے اس پر نظر ڈالی۔ ہم دونوں بے بس تھے میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور وہ اپنے لیے کیا کرتا۔ مجھے لگا ہوا نے اس کے دل کی باتیں میرے کانوں تک پہنچا دی ہیں۔ بہت سارے کاش ہیں۔

''کاش ..... میں نے چندرا مکھی کو دیکھا ہی نہ ہوتا۔''

''کاش ..... میں ایک لمحے کے لیے رک کر سوچ لیتا۔''

''کاش ..... میں مرتد نہ ہوا ہوتا ..... اب مجھے بھی جلایا جائے گا۔''

نہ چندرا مکھی ملی نہ والدین کی محبت کا سایا ملا۔ رب کے سایۂ رحمت سے بھی محروم ہو گیا۔

ٹرین آہستگی سے سفر کرنے لگی۔ منظر بدلنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ وہ نوجوان بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ محبت کا اتنا دردناک انجام خوف سے مجھے جھرجھری آ گئی۔ دل کے گنبد سے صدا بلند ہوئی۔

''روح کو بس اللہ سے محبت کا جنون ہی جچتا ہے۔ اسے کسی انسان کی خواہش میں بھٹکاؤ گے تو وہ تمہارے جسم کے اندر تم سے انتقام لے گی، وہی شخص تمہاری تذلیل کا باعث بنے گا۔ تو پھر تمہاری روح کو تسکین ملے گی۔ خدا سے محبت کے سوا کسی بھی جذبے میں شدت انسان کو راس نہیں آتی!''

اس نوجوان کی آہیں ..... میرے دل کو تڑپانے لگیں ..... آہ یہ محبت .....!!

☆☆☆

دوسرا شعلہ

# بہت دیر کر دی



عبدالعزیز یافت

## اُس نوجوان کا قصہ عبرت جو محافظ بن کر عزتوں کا نیلام کرتا تھا

وہ ایک غلیظ سا شخص نظر آتا تھا۔ میں اس کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ اُسے دیکھ کر ہر ایک کو کراہیت ہی محسوس ہوتی۔ بال اور ناخن بڑھے ہوئے، کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، کسی بوجھ سے جھکے کندھے، انتہائی سُرخ آنکھیں اور میلا کچیلا جسم لیے وہ شخص ٹرین میں نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ ایسے جوڑے ہوئے تھے جیسے وہ کسی سے معافی مانگ رہا ہو، کسی کے پاؤں پڑ رہا ہو اور جس سے وہ معافی مانگ رہا ہو، وہ اُس کے سامنے ہی کھڑا ہو۔

میری نظر اُس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی پر اُس میں ایک بات ایسی تھی جو مجھے اُسکی طرف بار بار دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ اور وہ تھی اُس کی سُرخ آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے خون بہنا۔ میں حیران تھا کہ آخر ایسی بھی کیا بات ہے کہ اس شخص کی آنکھیں بجائے پانی کے خون بہاتی ہیں۔ یہ میرے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پہلے تو مجھے یہ اپنا وہم لگا لیکن بعد میں جب ساری حقیقت مجھے پتا لگی تو میں بھی اس بات سے متفق ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں سے خون ہی بہنا چاہیے۔

☆☆☆

میں اپنی نوکری کے ایک کام کے سلسلے میں لاہور جا رہا تھا۔ ٹرین پہ سفر کرنا ہمیشہ سے ہی میری پسند رہی ہے۔ میں اپنے لیے ایک برتھ اور ایک سیٹ ریزرو کروا چکا تھا۔ میرا تقریباً آدھے سے زیادہ سفر آرام سے گزر چکا تھا اور میں اپنی نیند بھی پوری کر چکا تھا۔ اب بچے تھے دو گھنٹے جو مجھے جاگ کر ہی گزارنے تھے سو میں بھی گھڑی کی سوئیاں گننے بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر تیزی سے بدلتے ہوئے مناظر دیکھنے لگا۔ ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی۔

میں نے سوچا کہ نیچے اتر کر تھوڑا زمین پر بھی پاؤں لگانے چاہئیں اور کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے سو میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر ٹرین نے بھی بہت بے صبری دکھائی اور فوراً سے پہلے روانہ ہونے کا ہارن بجا دیا اور مجھے خالی ہاتھوں ٹرین کی طرف بھاگنا پڑا۔

میں ابھی اپنے ڈبے میں داخل ہوا ہی تھا کہ میرے پیچھے ہی بیس یا تیس سیکنڈ بعد ایک شخص بھاگتا ہوا ٹرین میں داخل ہوا اور تب ٹرین کافی تیز ہو چکی تھی۔ میرے منہ سے نکلا پاگل ہو گیا بھائی۔ اور جب

میں نے اُسکی طرف غور سے دیکھا تو واقعی ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی پاگل خانے سے بھاگ کر ہی آیا ہے۔ میں جا کر اپنی سیٹ پہ بیٹھ گیا اور وہ شخص مجھ سے تھوڑے فاصلے پر نیچے ہی بیٹھ گیا۔

میں نے سب لوگوں کو اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھا لیکن کسی نے بھی شاید اُس شخص کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے لگا شاید یہ ابنارمل ہے کیونکہ اُس کا حلیہ اور انداز تو یہی بتاتا تھا کہ یہ کوئی نارمل آدمی نہیں ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں لیکن اُس کا دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا اور اُس کی آنکھوں سے نکلنے والے خون نے مجھے اُس کو بار بار دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کی خون بہاتی آنکھیں دیکھ کر مجھے وہ رپورٹ یاد آ گئی جو میں نے ماضی میں کسی اخبار میں پڑھی تھی اور ایک جھوٹ سمجھ کر ہوا میں اُڑا دی تھی۔ رپورٹ کچھ یوں تھی کہ دنیا میں ایک ایسی بھی بیماری ہے کہ آنکھوں سے پانی کی بجائے خون بہتا ہے اور یہ بیماری اب تک پوری دنیا میں سے پانچ لوگوں کو ہو چکی ہے۔ ان پانچ لوگوں نے اپنا علاج کروانے کی کوشش بھی کی لیکن علاج تو دور ڈاکٹرز اِس بات کا بھی پتا نہیں لگا سکے کہ آخر ان لوگوں کی آنکھوں سے خون کیوں نکلتا ہے۔

یہ تو رپورٹ تھی جو میں نے پڑھی اور جھوٹ بھی سمجھی لیکن اب میں اپنی پھٹی آنکھوں سے اُس شخص کو حقیقت میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ آپ سب چیزوں سے مکر سکتے ہیں مگر حقیقت سے نہیں۔ میں اُسے واقعی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں بار بار اِس سوال نے سر اُٹھایا کہ آخر اِس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ اُسکی جو حالت تھی اُس کی طرف ایک بار بھی دیکھنا کوئی گوارا نہ کرتا لیکن مجھ سے رہا نہ گیا اور میرے قدم اُس کی طرف بڑھ گئے۔ میں اُس کے پاس پہنچا تو وہ میرے پاؤں پڑ گیا اور رو رو کے بولنے لگا۔

"خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے ایک بار معاف



کر دوتا کہ میں سکون کی موت تو مر سکوں۔ مجھے ایک پل چین نہیں ہے میری روح بے قرار رہتی ہے میری آنکھیں خون روتی ہیں۔''

مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی اور میں اُس کے اس طرح کرنے پر بوکھلا سا گیا تھا۔ میں فوراً پیچھے ہٹا اور خود کو سنبھالا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ شخص میرے پاؤں کیوں پڑ گیا ہے۔ لیکن اپنی تمام ہمت جمع کرتے ہوئے میں نے خود کو سنبھالا۔

اُس شخص کے پاس جانے کی ہمت کی۔ اس کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اپنی سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہ شخص ابھی بھی رو رہا تھا اور میں نیچے بیٹھ گیا اور اُس کی آنکھوں کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُس کی سسکیوں کی آواز تھوڑی کم ہوئی تو میں نے پوچھا بھائی صاحب سنیے! لیکن وہ مسلسل رو رہا تھا۔ میں ڈرتے ہوئے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے زور سے بولا۔

''بھائی صاحب! کیا ہوا کیوں رو رہے ہیں اور آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟''

وہ شخص جو پہلے ابنارمل لگ رہا تھا اب کسی پڑھے لکھے اور نارمل شخص کی طرح بات کرنے لگا۔ اس نے اپنا نام افرائیم بتایا۔ وہ بولا میں ایک امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ اور دنیا جہان کی تمام بری عادتیں مجھ میں پائی جاتی تھیں حالانکہ میرے ماں باپ نے مجھے اچھے اور بہت مہنگے اداروں میں تعلیم دلوائی۔

میں نے اپنی جوانی میں ہر برا کام کیا لیکن کرن کے ساتھ کی ہوئی اُس ایک غلطی کی سزا آج بھی بھگت رہا ہوں مجھے ایک پل چین نہیں۔ میری آنکھوں سے خون نکلتا ہے میں مرنا چاہتا ہوں پر ایسی موت سے ڈرتا ہوں جو اس حالت میں آئے کہ میری آنکھوں سے خون نکل رہا ہو اور کرن کی بد دعا میرے چہرے پہ لعنت بھیج رہی ہو۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا افرائیم ایسا کیا کیا ہے تم نے کرن کے ساتھ۔ کون تھی وہ؟ افرائیم نے بولنا شروع کیا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ یونیورسٹی پڑھتی تھی۔ میں اس کے پیچھے تب تک پڑا رہا جب تک وہ مجھ سے دوستی پر راضی نہیں ہو گئی۔ میں نے ہمیشہ سے ہی ایسا کیا تھا کہ لڑکیوں سے دوستی کرتا انہیں پھر عشق کی جھوٹی کہانیاں سناتا اور بھاری بھاری شاپنگ کرواتا۔ اور جب وہ میرے جال میں پھنس جاتیں تو اپنے دوست عمران کے ساتھ مل کر ہم انہیں بے آبرو کر دیتے۔ اپنے جسم کی آگ بجھاتے اور پھر انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتے۔

یہ بات ہمارے لیے محض ایک تماشا بن چکی تھی۔ اب تک میں ہم دو لڑکیوں کے ساتھ ایسا کر چکے تھے اور کرن ہمارا تیسرا شکار تھی۔ اس بار مجھے کرن کی طلب تھی۔ کرن کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے میں نے پھر سے وہی طریقہ اپنایا۔ کرن بہت سادہ لڑکی تھی اور دوسری لڑکیوں کی نسبت وہ زیادہ جلدی میرے عشق کے جال میں پھنس چکی تھی۔ اسے کہیں گھمانا پڑا نہ ہی کوئی شاپنگ کروانی پڑی۔ بس میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُس سے سچا عشق کرتا ہوں۔ جلد اپنے ماں باپ سے شادی کی بات کروں گا اور پیار کی ہر وہ بات کی جس سے اُسے لگتا کہ اُسے مجھ پر اپنی جان وار دینی چاہیے۔

وہ واقعی مجھ پہ جان نچھاور کرنے لگی، مجھے اپنا خدا ماننے لگی۔ مجھے اس کا جسم چاہیے تھا بس اور وہ سمجھی تھی شاید میں اُس سے شادی کروں گا اور اسے عزت دوں گا پر میرے نزدیک تو اُس کی عزت لوٹنا ہی سب سے اہم بات تھی۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ مجھ سے سچی اور پاک محبت کرتی تھی۔ میں نے کبھی اُس کی محبت کو روح کی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھی ہمیشہ اُس کے جسم پہ ہی اپنی نظریں گاڑ کے رکھی تھیں۔ اور وہ تھی کہ مجھ پہ اتنا اندھا یقین کیے بیٹھی تھی جیسے میں اُس کی عزت کا محافظ ہوں اور اُسے ہمیشہ پاک ہی رکھوں گا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ جسے وہ اپنا محافظ سمجھ رہی ہے اصل میں وہی اُس کا رہزن ہے۔

میں جب بھی اُس سے پیار محبت کی باتیں کرتا تو وہ کہتی تمہارے لیے میں سب کر جاؤں گی چاہے کچھ بھی

کرنا پڑے۔ وہ ہمیشہ شادی پہ زور دیتی اور میں ادھر ادھر کی بات کر کے شادی کی بات کو ہمیشہ ٹال دیتا۔

ہم راتوں کو موبائل پہ باتیں کرتے اور دن میں یونیورسٹی میں بیٹھ کے باتیں کرتے رہتے۔ ہمارے دن رات پیار بھری باتوں میں گزرتے تھے۔ اور جب کرن مکمل طور پر مجھ پر بھروسہ کرنے لگ گئی تب میں نے اپنا مقصد پورا کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اُس صبح میں نے کرن سے کہا کہ کیا تم میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہو۔ اُس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھا اور بولی ہاں کچھ بھی۔ میں نے فوراً کہا مجھے اکیلے میں ملو گی۔ وہ تھوڑی ہچکچائی لیکن میں نے پیار کا تیر چلا دیا اور کہا کہ میں تمہاری عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا تم میرا یقین کر۔ میں تمہارا محافظ بنوں گا تمہاری عزت ہمیشہ ایسے ہی قائم رہے گی میں وعدہ کرتا ہوں۔ میری باتوں اور جھوٹے وعدوں پہ یقین کر کے وہ مان گئی اور ملنے کے لیے شام کا وقت طے ہوا۔

میں نے کرن کو جگہ کا پتا بتا دیا تھا۔ کرن شام کو وہاں رکشہ پر پہنچ گئی۔ میں اور عمران گاڑی میں بیٹھے کرن کا انتظار کر رہے تھے۔ کرن میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی اور میں نے عمران کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔ کرن میرے ساتھ اسی لیے مطمئن بیٹھی تھی کیونکہ وہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی تھی۔

عمران جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ کرن چپ چاپ میرے ساتھ گاڑی میں پیچھے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ گاڑی اسٹیشن کے قریب پرانے ڈاک خانے پہ جا کر رکی۔ میں نے کرن کو اترنے اور اندر چلنے کا کہا۔ وہ مجھ پہ بھروسہ کرتے ہوئے میرے پیچھے چلنے لگی۔ اندر پہنچتے ہی میرے اندر کے شیطان نے جوش مارا اور میں اپنے شیطانی روپ میں آ گیا۔ پھر ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں نے کرن کو زور سے پکڑ لیا اور عمران نے کرن کے منہ پر پٹی باندھ دی۔

کرن کو اس بات کی توقع نہیں تھی اس لیے جب تک وہ سنبھلی تب تک ہم اُس باندھنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اُس کے دونوں ہاتھ بھی بندھ چکے تھے۔ کرن کے منہ اور ہاتھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ مسلسل خود کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔

عمران نے میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ مارا اور پھر ہم دونوں نے زوردار قہقہے لگائے۔ کرن میری طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی انہونی دیکھ رہی ہو۔ وہ پھٹی آنکھوں سے بنا جھپکے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہمارا یہی طریقہ ہوتا تھا۔ میں لڑکیوں کو اپنے پیار کے جال میں پھنساتا پھر انہیں بھروسے میں لے کر اکیلا ملنے کا کہتا اور انہیں اپنے ساتھ اسٹیشن کے قریب پرانے ڈاکخانے کی اس عمارت میں لے آتا۔ اس تمام کام میں ہر بار میرے دوست عمران نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ یہ ڈاکخانہ اسٹیشن سے تھوڑا دور واقع تھا۔ یہ بہت سال پہلے بند ہو چکا تھا لیکن اس کی عمارت کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا تھا جسے میں نے اور عمران نے اپنی ہوس مٹانے کا ڈیرہ بنا لیا تھا۔

کرن کو اس بات کی ذرا بھی امید نہیں تھی کہ میں ایسے کروں گا۔ اس بیچاری کا تو جیسے سب کچھ لٹ گیا تھا اور وہ بندھے ہاتھوں اور نم آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر عمران نے مجھے آواز دی اور بولا پہلے تُو یا میں۔ میں ڈھٹائی سے بولا تجھے پتا تو ہے پھر بھی کیوں پوچھتا ہے ہر بار۔ میں نے عمران سے کہا تُو چل باہر میرے بعد پھر تیرا نمبر۔ وہ باہر جانے ہی لگا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میری بہن کا فون تھا۔ اس لیے مجھے اُٹھانا پڑا میری بہن کہہ رہی تھی کہ ڈرائیور آج چھٹی پہ ہے ابو آفس میں ہیں مجھے کالج تم چھوڑ آؤ۔ جلدی آنا مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے میرا آج ٹیسٹ ہے جلدی آؤ۔ مجھے اب جانا پڑنا تھا۔ عمران ابھی وہیں پر کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے قدم باہر کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا عمران تُو سنبھال اسے میں بس آدھے گھنٹے تک آتا ہوں۔ میں تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے گھر پہنچا۔ میری بہن گاڑی میں بیٹھی اور میں نے گاڑی کو اس کے کالج کی طرف تیزی سے ڈرائیو کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری بہن جلدی میں گاڑی میں پیچھے ہی بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے اسی جگہ کرن بیٹھی تھی۔ میرے ذہن میں بہت

سے خیالات ابھرنے لگے۔ میں اپنی بہن کو دیکھتا تو مجھے کرن یاد آجاتی جسے میں عمران کے ہاتھوں دے کر آ گیا تھا۔ مجھے اپنی بہن کا اُس جگہ بیٹھنا بہت برا لگ رہا تھا۔ مجھے تب پہلی بار احساس ہوا کہ جو کچھ میں دوسروں کی بہنوں کے ساتھ کرتا ہوں اگر وہ سب میری بہن کے ساتھ ہو جائے تو مجھ پہ کیا بیتے گی۔ اور ابھی تو وہ بھی کرن کی جگہ پہ بیٹھی ہے تو میرا خون کھول رہا ہے۔ میرا ذہن اب اُلجھنے اور بھٹکنے لگا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے میرا ذہن مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ میرے اندر موجود شیطان کہیں گہرائی میں سو چکا تھا لیکن اب میرا ضمیر جاگ گیا تھا جو مجھے مسلسل ملامت کیے جا رہا تھا۔ اب میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کرن نے نہ تو دوسری لڑکیوں کی طرح میرے پیسوں پہ عیش کی تھی اور نہ ہی کوئی شاپنگ کی۔ اس نے بس مجھ سے پیار کیا تھا بنا کسی مطلب کے کسی غرض کے۔ اس نے مجھے اپنی عزت کا محافظ مانا تھا۔ اُسے واقعی میری دولت سے نہیں بلکہ مجھ سے پیار تھا۔ وہ بس مجھے چاہتی تھی سچے دل سے۔ میں اس کا غرور تھا اعتبار تھا اور اس غرور کو میں نے بڑی بے دردی سے اپنے پیروں تلے روند دیا تھا اُس کا اعتبار چکنا چور کر دیا تھا۔ مجھے اس کا محافظ بننا چاہیے۔ میں نے گاڑی کی رفتار کو مزید بڑھا دیا تھا کیونکہ جو کام مجھے اب کرنا تھا اگر اُس میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو میں کبھی بھی اُس وقت کو واپس نہیں لا سکتا تھا۔

میں نے اپنی بہن کو کالج ڈراپ کیا اور جتنی تیز ممکن تھا گاڑی ڈرائیو کی اور ڈاکخانے پہ پہنچا۔ لیکن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں باہر دیوار کے پاس کھڑا تھا اور کرن کی مدھم سسکیوں اور چیخوں کو سن رہا تھا۔ اس کے منہ پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے اسکی ہر چیخ اسی کمرے میں دب کر رہ جاتی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ڈاکخانے میں خاموشی چھا گئی۔

عمران کپڑے پہنتے ہوئے باہر آیا اور باہر آتے ہی بولا یار آج تو مزا ہی آ گیا سچ میں۔ پہلی بار میرا نمبر تجھ سے پہلے لگا ہے۔ میرے پاس بولنے کو کچھ نہیں تھا میں خاموش رہا۔ میں عمران کو اس کے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ کر پایا کیونکہ میں نے سوچا کہ اگر کچھ دیر پہلے میں یہاں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اور کرن یہاں آئی بھی میری وجہ سے ہی ہے۔ سارا قصور تو میرا اپنا ہے پھر میں عمران پر کس منہ سے ہاتھ اُٹھاؤں۔ میں چپ چاپ کمرے کے اندر چلا گیا۔ کرن ایک طرف زمین پہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اسکا نام لے کر بھی اسے بلا سکوں۔ وہ بہت ہی پاک اور معصوم لڑکی تھی جو آج میری وجہ سے اپنی عزت گنوا بیٹھی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں جب بھی اسکی طرف دیکھتا تو میری آنکھیں اُسکے بری طرح کچلے گئے جسم سے ٹکرا کر شرمندہ واپس لوٹ آتیں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کرن کے منہ پہ بندھی پٹی کھولی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا۔ میرا سر شرمندگی کے مارے نیچے جھک گیا۔ شاید وہ مجھ پہ چیخنا چلانا چاہتی تھی مجھے تھپڑ مارنا چاہتی تھی لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ اگر وہ یہ سب کر لیتی تو شاید میں آج تھوڑا بہت ٹھیک ہوتا پر اس نے تو میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا کیا۔ وہ اُٹھی اور وہ بولی نے تمہیں اپنا محافظ سمجھا تھا اور تم نے دیکھو میرے ساتھ کیا کر دیا۔ میں نے تمہیں پیار کیا تھا سچا پیار۔ اور تمہیں بس میرے جسم سے محبت تھی۔ اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بولی کہاں گئے تمہارے وہ وعدے کہاں گئیں تمہاری وہ قسمیں۔ میں نے تم پہ اعتبار کیا تھا اپنا سب کچھ تو تمہیں سونپ دیا تھا پھر تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں بس گردن جھکائے کرن کے الفاظ سن رہا تھا۔ اور پھر وہ بولی میری بددعا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی میں ایک پل چین نہ آئے تم ساری عمر تڑپتے رہو۔ کوئی تمہاری مدد کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ خدا کرے تم خون کے آنسو روؤ جیسے آج تم نے میری آنکھوں سے آنسو بہائے ہیں اور تمہارے آنسو کوئی پونچھنے والا بھی نہ ہو۔ خدا کرے تم مرنا چاہو پر تمہیں موت نہ آئے۔ تمہیں موت آئے تو ایسے کے

تمہاری آنکھوں سے خون نکل رہا ہو تمہارے پاس کچھ نہ ہو سوائے زندگی کے بوجھ کے۔ تمہارے پاس تمہارا کچھ نہ رہے۔ نہ تمہارے اپنے نہ تمہاری دولت کچھ بھی نہیں۔ یہ میری بددعا ہے تمہیں۔"

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ میں ابھی بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اُٹھی اور باہر کی جانب چل دی۔ اُس کا رخ اسٹیشن کی جانب تھا۔

میں نڈھال قدموں کے ساتھ باہر آیا تو عمران نے پوچھا کیوں بھئی کیسی تھی یہ والی۔ مجھے تو بہت مزہ کروایا تھا اس نے۔ ماننا پڑے گا تُو بھی چن کے ڈھونڈتا ہے۔ عمران اُسے جاتا دیکھ کر چلایا! یار تُو اُسے ایسے ہی کیوں جانے دے رہا ہے۔ ہم نے بنا کپڑوں کے اُس کی کوئی تصاویر نہیں اُتاریں نہ کوئی ویڈیو بنائی ہے۔ ہمارے پاس اُسے بلیک میل کیے رکھنے کی کوئی چیز بھی نہیں ہے اگر اُس نے گھر جا کر بتا دیا تو؟ لیکن مجھے اب اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کس کو بتاتی ہے یا کیا کرتی ہے۔ میں تو گم سم چپ چاپ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اُس شخص کی مانند کھڑا تھا جو اپنا سب کچھ ہار گیا ہو جس کے ہاتھوں سے سب کچھ نکل گیا جسے وقت نے منہ کے بل نیچے گرایا ہو اور جو زمین میں گردن تک دھنس چکا ہو۔ ٹرین اسٹیشن پہ رکی۔ میرا دل کر رہا تھا کہ ابھی آسمان سے کوئی بڑا سا پتھر میرے اوپر آ کر گر پڑے اور میں مر جاؤں۔ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ کرن ٹرین میں بیٹھی۔ ٹرین نے ہارن دیا اور آگے بڑھ گئی۔ اس شام میری آنکھوں نے کرن کو آخری بار دیکھا تھا۔ اور کرن پھر لاپتا ہو گئی اور کسی نے اُسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کہاں گئی اور نہ ہی کسی کو پتا چلا کہ اس کے ساتھ پھر کیا ہوا۔

وہ تو پتا نہیں کہاں چلی گئی لیکن اس واقعے کے بعد میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی مجھے خوابوں میں کرن کی سسکیاں اور بددعائیں سنائی دیتیں۔ اور دن میں وہ ایک ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جو ڈاکخانے میں اس شام میری وجہ سے کرن کے ساتھ ہوا۔ میں آنکھیں بند کر لیتا لیکن مجھے ہر طرف کرن ہی محسوس ہوتی۔ مجھے اس کی بددعا واقعی لگ گئی۔ میں بے چین رہنے لگا۔ ہر وقت تڑپتا۔ اپنا علاج مہنگے سے مہنگے ڈاکٹرز سے کروایا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں راتوں کو جاگتا رہتا تھا۔ نیند کی دیوی مجھ پہ کبھی مہربان نہ ہوئی تھی۔ میں نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ دن رات روتا رہتا۔ میری آنکھیں رو رو کر سوج گئیں لیکن میرا کیا ہوا گناہ ابھی بھی تازہ تھا۔ میری آنکھیں اب سوکھ چکی تھیں لیکن مجھے رونا پڑا اور بہت رونا پڑا۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ میری آنکھوں سے پانی کے بجائے خون بہنے لگا۔

میری زندگی عذاب بن گئی ہے۔ میں اب بس مرنا چاہتا ہوں لیکن مرنے سے پہلے کرن سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اُس دن کے بعد سے میں ہمیشہ اسی ٹرین پہ روزانہ شام کو اسی وقت سفر کرتا ہوں۔ کاش ایک بار مجھے دوبارہ سے کرن مل جائے اور میں اس کے پاؤں پڑ جاؤں گا۔ اس کے سامنے خود کو آگ لگا لوں گا۔ ٹرین کے نیچے آ کر اپنی جان دے دوں گا۔ کچھ بھی کر کے اُس سے معافی مانگ لوں۔ میں اُس سے شادی بھی کر لوں گا۔ پر وہ ایک بار مجھے ملے تو صحیح۔ میں خون کے آنسو رو رو کے تھک چکا ہوں۔ میں تڑپ تڑپ کے تھک چکا ہوں مجھے اب مرنا ہے مجھے سکون چاہیے۔ وہ میرے ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہنے لگا تم کرن کو کہیں سے ڈھونڈ کر لا دو میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ ٹرین نے بریک لگانا شروع کر دی تھی جس کا مطلب تھا کہ لاہور کا اسٹیشن آ چکا ہے۔ مجھے اب ٹرین سے اترنا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو افرائیم کی گرفت سے آزاد کروایا اور کہا کہ تمہارے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے تم اس سزا کے حقدار ہو۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر میں اُٹھا اپنا بیگ اُٹھایا اور تیزی سے ٹرین سے نیچے اتر گیا۔ میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ میری آنکھوں سے اسی وقت دو بڑے بڑے آنسو نکلے اور زمین پہ جا گرے۔ پتا نہیں وہ آنسو اس معصوم کرن کے لیے تھے یا شاید افرائیم نامی درندے کی موجودہ حالت دیکھنے پر......!!

☆☆☆

تیسرا شعلہ

# اپنا خون

سید محمود حسن

اُس بھائی کی کہانی جس نے اپنے ہی بھائی کی جائیداد ہتھیالی

یہ لوکل ٹرین جس میں بہت سے لوگ سفر کرتے تھے اور اس کی منزل لاہور ہوتی تھی، بہت سے لوگ سرکاری ملازم تھے تو کوئی کسی نہ کسی کاروبار سے منسلک تھا۔ میں لوکل ٹرین میں بیٹھا اس بوڑھے شخص کے ساتھ روز ہی سفر کرتا تھا۔ وہ شہر کی ایک بڑی اناج مارکیٹ میں مزدوری کرتا تھا۔ اس کا نام کریم الدین تھا۔ میں انہیں چاچا کریم کہتا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، بھرے ہوئے بازو، لال سرخ رنگ، چاچا کریم کے ورزشی اور محنتی جسم کا پتا دیتے تھے۔ چاچا نے سگریٹ سلگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"محمود بابو! کسی دن ہماری داستان دکھ و عبرت سننے کے لیے بھی ٹائم نکال لو۔"

اور میں یہی کہتا تھا کہ "کسی چھٹی والے دن آپ کی داستان سنوں گا اور اپنے زورِ قلم سے تحریر میں لاؤں گا۔"

اور ایک دن ہمیں موقع مل ہی گیا کیونکہ اس دن شہر میں ہڑتال ہوئی تھی اور مجھے چاچا کریم ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی مل گیا تھا۔

"آ جائیں بابو جی باہر چائے کے بڑے ہوٹل پر بیٹھتے ہیں اور چائے بھی پئیں گے اور گپ شپ بھی کریں گے۔" چونکہ یہ چائے کے ہوٹل ریلوے اسٹیشن کے اردگرد تھے اس لیے دن رات اور ہر طرح کے حالات میں بھی کھلے رہتے تھے۔

"ہاں چاچا جی، آج سنائیں اپنی داستانِ غم۔" میں نے گرما گرم چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میری داستان کو نہ جانے تم کیا سمجھو، نادانی، سراپا اندھا اعتماد۔ ہاں ہمارا بھی ایک دور تھا میاں ہم بھی اپنے زمانے میں سیٹھ ہوتے تھے۔ میری جیبیں پیسوں سے بھری ہوتی تھیں۔ میں لوگوں کو ادھار دیا کرتا تھا اور آج میں ایک غریب اور معمولی سا آدمی ہوں اور مزدوری کرتا ہوں۔ میں کسی اور کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے سگے بھائی کے ہاتھ کچھ اس طرح برباد ہوا ہوں کہ ایک دوراہے پر کھڑا ہوں۔ نہ آگے جا سکتا ہوں اور نہ ہی پیچھے کی طرف دیکھ سکتا ہوں کہ سوائے پشیمانی اور ندامت کے کچھ نظر نہیں آتا اور شاید یہ میرے اعمالوں کی سزا بھی ہے جو کہ میں بھگت رہا ہوں۔"

اور پھر چاچا کریم نے اپنی داستانِ حیات کچھ اس طرح سنانا شروع کی تھی۔

"میں کریم الدین شروع سے ہی بڑا محنتی تھا اور اسی محنت کے بل بوتے پر میں ایک امیر اور دولت مند آدمی بن چکا تھا جب کہ میرا بھائی ریاض الدین شروع ہی سے غریب اور مسکین نظر آتا تھا۔ میں اس کی تعلیم کے سارے اخراجات اٹھاتا تھا۔ میں اس سے تقریباً دس سال بڑا تھا۔ میری ایک فلور مل تھی جس میں آٹا اور ایک مسالا جات کی ہول سیل دکان، جس پر میں ملاوٹ شدہ مال فروخت کرتا تھا، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، بے ایمانی میرا شیوہ تھے۔ میرے چار



پلاٹ اور ایک عالیشان قسم کا فلیٹ تھا جہاں میں بڑے کروفر کے ساتھ رہتا تھا اور ایک خفیہ ٹھکانا جو کہ میں نے اپنی عیاشیوں کے لیے رکھا ہوا تھا جہاں پر میرے جیسے بگڑے ہوئے لوگ اپنا وقت اور پیسہ برباد کرتے تھے۔

سیٹھ کریم الدین یعنی میں نے ذخیرہ اندوزی کے لیے خفیہ گودام قائم کر رکھے تھے۔ جب بھی مارکیٹ میں کسی غذائی اجناس یا مسالا جات کا بحران پیدا ہوتا تھا، میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاری رقم کے عیوض ان اشیاء کو فروخت کرتا اور خوب منافع کماتا تھا۔ میرا ایک خاص دوست رشید عرف شیدا مارکیٹ کا کیڑا سمجھا جاتا تھا اور تمام خبریں رکھتا تھا کہ کس کس چیز کا بحران پیدا ہونے والا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے خبر دی کہ سیٹھ صاحب اس دفعہ بارشوں کی زیادتی کی وجہ سے گندم کی فصل کو بڑا نقصان ہوا ہے اور جو گندم آنے والی ہے وہ موجودہ ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ گندم کی بوریاں ایک بڑی تعداد میں خفیہ طور پر اسٹاک کرلی جائیں۔“

”بڑی اچھی خبر لائے ہو شیدے۔“ اور پھر میں نے ایسا ہی کیا اور اس ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے لوگوں کی مجبوری کی وجہ سے خوب منافع کمایا اور خوب ہی لوٹا۔ ہم دوستوں کا گروپ جو کہ اوباش اور بگڑے ہوئے افراد پر مشتمل تھا۔

اسی طرح جب گنے کی فصل خراب ہوئی اور ملک میں چینی کا بحران پیدا ہوا تو اس سے بھی ہم نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے بینک اکاؤنٹ بھر لیے ہر جگہ ہمارے رابطے تھے۔ سب ہماری مٹھی میں رہتے تھے اور ہم سب کی جیبیں گرم رکھتے تھے۔ اس لیے کبھی ہم قانون کی گرفت میں بھی نہیں آئے۔ دور دور سے لوگ میرے پاس ادھار لینے آتے تھے، میری جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں اور میں اپنے آفس میں بھی بڑے بڑے لوگوں کو ادھار دیا کرتا تھا۔ لوگ مجھے سیٹھ کریم کے نام سے جانتے تھے اور میری صحت بھی قابل رشک ہوتی تھی، بدقسمتی سے میری شادی کو پندرہ سال گزر چکے تھے پر میں اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ ہر وقت اپنی بیوی کو بے اولادی اور بانجھ ہونے کے طعنے دیتا رہتا تھا۔

سلمٰی میری بیوی ایک وفا شعار، سلیقہ مند اور اچھی عورت تھی۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ میرے جیسے

عیاش طبیعت، جواری، شرابی انسان کے ساتھ اپنا گزارا کر رہی تھی لیکن میرا کام تو بس اسے گھر میں داخل ہوتے ہی لعن طعن کرنا تھا۔ ہر وقت میرے منہ پر ہی رہتا تھا۔ ''تو تو ہے ہی منحوس اور بانجھ تو مجھے اولاد نہیں دے سکی۔'' روزانہ کا یہی معمول تھا جب بھی میں گھر میں داخل ہوتا، میں نشے میں دھت ہوتا اور پھر لڑائی ہوتی تھی۔

''آ گئے اپنی عیاشیاں کر کے۔'' میری بیوی کی آواز گونجتی۔ پھر میں چلاتا۔

''میری مرضی جو چاہے کرتا پھروں، تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی۔'' بس یہی روزانہ کا معمول تھا۔

پھر ایک دن جیسے میری زندگی میں انقلاب سا آ گیا۔ یہ سردی کا موسم تھا، جب مجھے کھانسی محسوس ہوئی اور پھر کھانسی میں خون بھی آنے لگا اور ساتھ ساتھ ہی کمزوری بھی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے محلے کے ایک ڈاکٹر کو دکھایا اس نے دوا دے دی مگر مجھے کچھ آرام نہ آیا۔ پھر دوسرے ڈاکٹر کے پاس اور پھر تیسرے کے پاس، آخر کار میں تنگ آ کر ایک اسپیشلسٹ کے پاس پہنچا تو اُس نے مجھے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے، میں دوسرے دن جب ٹیسٹ رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے رپورٹیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ کریم الدین آپ کو ٹی بی تشخیص ہوئی ہے اور آپ کو اسپتال میں داخل ہونا پڑے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ سرکاری اسپتال میں داخل ہو کر اپنا علاج کراتے ہیں یا اگر آپ کی گنجائش ہے تو بے شک پرائیویٹ اسپتال میں اپنا علاج کرا سکتے ہیں۔'' اس زمانے میں ٹی بی ایک مہلک اور جان لیوا مرض سمجھا جاتا تھا، یہ سن کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور مجھے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا کہ اب موت ہی میرا مقدر ہے۔ میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

''کیا میری زندگی بچ سکے گی ڈاکٹر صاحب؟''

''دیکھیں پچاس فیصد امکان ہے کہ آپ کی زندگی بچ جائے گی اور پچاس فیصد ہی نہیں۔'' ڈاکٹر نے مجھ سے حقیقت پسندانہ انداز میں کہا۔

☆.....☆

میں جیسے ہی اپنے گھر پر پہنچا میرے ذہن پر شدید دباؤ تھا اور دوسرے دن صبح میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ شاید میں نے سوچنا زیادہ شروع کر دیا تھا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو ایک اسپتال کے بیڈ پر میں لیٹا ہوا تھا اور میری بیوی میرے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' میں نے کراہتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ میری روز اسپتال میں ہیں۔'' میری بیوی نے کہا۔

''میں یہاں پر کیسے آیا؟'' میں نے دوبارہ سوال کیا۔

''آپ کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی، اس لیے میں آپ کو اسپتال لے آئی اور اب یہاں پر آپ کا مکمل علاج ہوگا۔''

ریاض الدین جو کہ میرا سگا اور چھوٹا بھائی تھا، اسے میں نے اسکول کی تعلیم دلوائی پھر کالج کی اور پھر اسے سرکاری ملازمت بھی مل گئی اس میں بھی میری کوششوں اور رشوت کا دخل تھا، وہ شکل سے مسکین ٹائپ اور خاموش طبیعت نظر آتا تھا لیکن نہایت موقع شناس اور چالاکی و عیاری کا مجموعہ تھا جس کا پتا مجھے بعد میں چلا۔ جب اس کا وار مجھ پر چل گیا۔

میری طبیعت کی خرابی کا سن کر میرا چھوٹا بھائی ریاض الدین بھی اسپتال پہنچ گیا۔

''ارے بھائی جان آپ کو کیا ہو گیا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

''آؤ میرے بھائی آؤ تم ہی تو دنیا میں میرا ایک سچا سہارا ہو۔''

''بھائی جان کسی بھی چیز کی فکر نہ کریں۔''

''لیکن میرے کاروبار کا کیا ہوگا؟'' میں نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ارے بھائی صاحب میں ہوں نا، سب دیکھ لوں گا۔''

اور دوسرے دن میری طبیعت انتہائی خراب ہو گئی اور مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ میرا بھائی اور میری بیوی مستقل میرے ساتھ موجود تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک یا دو دن بمشکل جی سکوں گا۔ میری بیوی میرے ساتھ موجود رہتی تھی اور میرا بھائی ریاض الدین بھی چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ مجھے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوائیاں لا کر دیتا تھا اور میری خدمت کی ہر ممکن کوشش کرتا، میرے کاروبار کا بھی اس نے انتظام اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا تھا اور میں اسی لیے بے فکر تھا، مجھ سے اکثر وہ بینک کے چیک سائن کرا کر لے جاتا تھا اور میں اسے اپنا ہمدرد ترین فرد ہی سمجھتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا نظر آتا تھا کہ بھائی جان آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گا، آپ بس ٹھیک ہو جائیں۔''

اور پھر میری طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی اور ڈاکٹر بھی مایوس ہو چلے تھے۔ میرا بھائی میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔

"بھائی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو اس دولت کا کیا ہوگا۔ یہ ساری دولت تو حکومت ضبط کر لے گی کیونکہ آپ ٹیکس چوری بھی کرتے رہے ہیں۔" ریاض الدین نے مجھے ڈراتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ فکر نہ کریں بھائی جان، میں ہوں نا آپ کے مسائل اور معاملات دیکھنے کے لیے۔" ریاض الدین نے مجھے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

فضل خان جو کہ شہر کا ایک شاطر اور چالباز قسم کا وکیل تھا، جھوٹ کو سچ کرنا اور سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ میرے بھائی ریاض الدین کے ساتھ قانونی کاغذات اور میرے جائیداد کے کاغذات اور حلف نامے، فارم اور وصیت نامہ اور پاور آف اٹارنی لے کر آیا، اس کی فیس بھی بہت ہائی تھی کیونکہ وہ دو نمبر کاموں کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا، حلف نامے اور وصیت نامہ میں نہ جانے کیا لکھا تھا۔ مجھے تو اتنا ہوش ہی نہیں تھا میں تو بس یہی سمجھ رہا تھا کہ اب میرا دنیا میں نام ختم ہو چکا ہے اور میرا بھائی ہی دنیا میں میرا فقط ایک ہی ہمدرد ہے۔ بعد میں جب میں نے حلف نامہ اور دوسرے کاغذات دیکھے تو لکھا تھا کہ اس کی رو سے سیٹھ کریم الدین کی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کا مالک اب اس کا سگا چھوٹا بھائی ریاض الدین ہے اور آج کے بعد میرا اس جائیداد اور دولت سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔" یہ جملے اور الفاظ اس شاطر اور عیار وکیل فضل خان نے لکھے تھے اور اسے قانونی دستاویز کی شکل دے دی تھی اب میرے پاس کوئی ایسا شخص تو موجود نہ تھا جو کہ وصیت نامے اور پاور آف اٹارنی کے الفاظ مجھے پڑھ کر سناتا، میں تو یہی سمجھا کہ کیا پتا میں صحت یاب ہو جاؤں تو یہ میرا بھائی دوبارہ مجھے سب کچھ دے دے گا اور یہ عارضی طور پر پاور آف اٹارنی بنوا رہا ہے۔

اور اس طرح میرا سب کچھ ریاض الدین کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ وہ ساری قانونی کارروائی اس شاطرانہ طریقے سے سرانجام دے رہا تھا کہ آگے چل کر کوئی رخنہ نہ آئے۔ میری بیوی نے مجھے منع بھی کیا، میرے ہوتے ہوئے تم ایسا نہ کرو لیکن مجھ پر تو جیسے اپنے بھائی کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ میں غنودگی کے عالم میں تھا اور مجھے بار بار کھانسی اور اس کے ساتھ خون آ رہا تھا مجھے ایسا لگا کہ فرشتے مجھے لینے کے لیے آ گئے ہیں۔ میں نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی شروع کر دی۔ اے اللہ پاک تو مجھے صحت و زندگی ایک مرتبہ عطا فرما دے تو میں کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا اور تیرا نیک بندہ بننے کی کوشش کروں گا۔ شاید اللہ کو میرا توبہ کرنا پسند آ گیا۔

ادھر میں چند دن تک تو بے ہوش سا رہا اس کے بعد میری طبیعت میں بہتری آتی چلی گئی اور چھ مہینے کے عرصے میں بالکل ٹھیک ہو گیا لیکن میرے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور کمزوری بھی بہت تھی۔ اس لیے میں کاروبار تو نہ سنبھال سکتا تھا۔ میرا بھائی ریاض الدین مجھے مطمئن کرتا رہا۔ بھائی جان میں ہوں تو سہی آپ کا کاروبار سنبھالنے کے لیے، آپ بے فکر رہیں۔ پہلے مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں پھر دیکھا جائے گا۔ ہاں پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لیتے رہیں اور جب ایک سال کے بعد میں نے اس سے اپنی مکمل صحت یابی کے بعد اپنے کاروبار کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔" بھائی جان بات یہ ہے کہ کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے اور میں تو خود اپنی جیب سے پیسا لگا رہا ہوں۔ اور میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ریاض الدین تمہارے پاس تو کچھ بھی نہ تھا، یہ سب کچھ تو میرا ہی ہے جو کہ میں نے تمہیں عارضی طور پر دیا تھا۔"

"نہیں بھائی صاحب! وہ سب تو ختم ہو گیا جو کہ آپ نے دیا تھا، کچھ آپ کی بیماری پر لگ گیا اور کچھ کاروبار میں ڈوب گئے۔"

"بھائی اس کے علاوہ جو میرے فلیٹ، مکان اور دکانیں ہیں وہ سب کیا ہوئیں۔" میں نے شدت غم سے چیختے ہوئے کہا۔

"بھائی جان میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

اصل میں ریاض الدین نے بڑی چالاکی سے سب کچھ فروخت کر کے ساری دولت اپنے بینک اکاؤنٹس میں منتقل کر لی تھی اور خفیہ طور پر کوئی جائیداد بھی خرید لی مجھے جھوٹے آسرے دیے کہ کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ رہنے دیں۔ میں اسے اپنا سچا ہمدرد سمجھتا رہا اور اس کی بات مان لی، پھر آہستہ آہستہ اس نے میری ساری پراپرٹی بیچ

کر ساری دولت اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر لی اور اسی طرح تین سال گزر گئے پھر اس نے کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور اپنی آنکھیں پھیر لیں۔

اس کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میری بانجھ بیوی کو اللہ نے اولاد کی نعمت دے دی۔ میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے اور وقت اپنے پر لگا کر گزرتا رہا اور میری بیٹی روبینہ جوان ہوگئی لیکن میں اپنے بھائی سے اس ولے کے ساتھ ملتا رہا کہ یہ میرا ایک ہی بھائی ہے اور کیا پتا اسے بھی احساس ہو جائے کہ اس نے کیا جرم کیا ہے اور میں نے اس سے قطع تعلق نہیں کیا۔ ادھر میرے بھائی ریاض الدین کے بھی دو بیٹے راشد اور فہیم تھے کیونکہ ریاض الدین مجھ سے تقریباً دس سے گیارہ سال چھوٹا تھا اس لیے اس کی اولادیں اور میری اولاد ہم عمر ہی تھیں۔

میری بیٹی روبینہ کالج میں پڑھتی تھی، وہ خوب صورت تھی اور ابھی کالج میں ہی پڑھتی تھی کہ اس کے رشتے آنے لگے کیونکہ میرے یہاں اولاد نہیں تھی اور میں شروع سے ہی اپنے بھائی کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔ خاص طور پر اس کا سب سے چھوٹا بیٹا راشد تو میرے گھر آتا رہتا تھا اور اب راشد بھی جوان ہو چکا تھا اس کی عمر اب 24 سال جب کہ میری بیٹی روبینہ کی عمر 19 سال تھی۔ راشد بدکردار تو نہیں تھا۔ یعنی نہ ہی وہ میری طرح شراب نوشی کرتا تھا اور نہ ہی کسی اور برے کام میں ملوث تھا لیکن اپنے باپ ریاض الدین کی طرح شاطر دماغ، عیار اور کاروباری ذہن رکھنے والا موقع شناس انسان تھا۔ اسے نہ جانے روبینہ کیسے پسند آ گئی۔ یا یہ بھی کسی سازش کا ہی حصہ تھا کہ راشد کی شادی روبینہ سے ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی ریاض الدین کے آگے سرنگوں ہو جاؤں۔ بہرحال اس وقت میں نے اتنا کچھ نہیں سوچا اور راشد کو اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتا رہا۔

''بھائی جان! میں آج آپ سے سوال کرنے آیا ہوں۔'' ریاض الدین ایک مرتبہ پھر اپنی بیوی کے ساتھ میرے در پر چلا آیا تھا۔ ظاہر ہے میرا سگا بھائی تھا، کوئی غیر تو نہ تھا اور نہ ہی میں نے اس سے کوئی لڑائی کی تھی۔

''بھائی آج ہم آپ سے اپنے بیٹے راشد کے لیے آپ کی بیٹی روبینہ کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔''

''لیکن ریاض الدین اب میرے پاس رہا ہی کیا ہے اور میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں، میں تو ایک غریب آدمی ہوں اور تم ایک بڑے دولت مند آدمی ہو۔''

''ارے بھائی صاحب چھوڑیں پرانی باتوں کو آؤ نفرتوں کو مٹائیں اور اپنے رشتے کو مزید مضبوط کریں۔''

میں ایک بار پھر اپنے بھائی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا اور روبینہ بھی یہی چاہتی تھی کیونکہ وہ راشد کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔ صرف میری بیوی میری مخالفت کر رہی تھی لیکن مجھ پر تو جیسے ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کی محبت کا بھوت سوار ہو چکا تھا اور میری بیٹی روبینہ کی شادی راشد سے ہوگئی۔

☆......☆

وقت کا پہیہ پھر آگے چلا اور میرے حالات مزید خراب ہو گئے کیونکہ میں مالی خستہ حالی کا شکار تھا اور کرائے کے مکان میں رہتا تھا جب کہ اس کے برعکس میرا بھائی ریاض الدین کوٹھا کر ولا میں سفر کرتا اور شہر کی ایک متمول سوسائٹی میں رہتا تھا اور کچھ عرصے کے بعد میرے حالات مزید خرابی کی طرف چلے گئے اور میں نے اپنے بھائی سے اپنی جائیداد اور دولت کا مطالبہ کیا اور کہا کہ آدھی ہی سہی، میرا آدھی دولت ہی واپس کر دو، اس نے مجھے ٹکا سا جواب دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، یا مجھے کچھ اتنی رقم دے دیں کہ میں اپنا مکان خرید سکوں اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ارے بھول جاؤ، پرانی باتیں کریم الدین میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے مجھے ٹکا سا جواب دیا۔

میں نے کورٹ میں ایک وکیل سے بات کی تو اس نے کہا کہ اگرچہ آپ اپنا سب کچھ اس کے نام کر چکے ہیں اور قانونی طور پر پاور آف اٹارنی دے چکے ہیں، میں نے اسے اپنی پراپرٹی کے تمام کاغذات دکھائے اور وہ پاور آف اٹارنی، وصیت نامہ بھی جو کہ ریاض الدین نے میری بیماری کے دوران تیار کروایا تھا۔ معین خان شہر کے اچھے وکیلوں میں تھے، میرے تمام کاغذات دیکھ کر کہنے لگا۔ اگرچہ ایک بہت طویل عرصہ گزر چکا ہے اور یہ پاور آف اٹارنی اور حلف نامے میں لکھا ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے، آج کے بعد اس پر میرا کوئی حق نہیں ہوگا۔

''لیکن کوئی تو راستہ ہوگا وکیل صاحب؟'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا تو وکیل صاحب کہنے لگے۔ ''دیکھیں ہم وکیل لوگوں کے پاس ہر چیز کا کوئی نہ کوئی حل اور قانونی جواز موجود ہوتا ہے، اب صرف ایک چیز ہو سکتی ہے کہ آپ کورٹ میں کہہ دیں کہ میرے ساتھ دھوکا دہی کی گئی ہے۔ میں شدید

بیماری کی حالت میں تھا اور مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ معاہدہ صرف عارضی طور پر ہے، میرے صحت یاب ہوتے ہی یہ سب کچھ جو کہ میری جائیداد ہے مجھے واپس مل جائے گی لیکن جب میں صحت یاب ہوا تو میں نے دیکھا کہ حلف نامے اور پاور آف اٹارنی پر تحریر بدلی ہوئی ہے اور نہایت چالاکی سے وکیل نے ہمیشہ کے لیے آپ کو اپنی جائیداد سے دستبردار قرار دیا ہے۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں، میں نے وکیل معین خان کو اپنا کیس لڑنے کا کہہ دیا اور پھر ایک دن لیگل نوٹس بھجوا دیے جو کہ ریاض الدین کو ملے لیکن جب نوٹس کو ملے ہوئے دو ہی دن گزرے تھے کہ میری بیٹی روبینہ جو کہ اب ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ میری بیٹی میرے گھر پر روتی ہوئی آئی کہ بابا آپ چاچا جان جو کہ اب میرے سسر بھی ہیں، کیس نہ کریں، ورنہ میں اور میری بچی رُل جائیں گے اور میرا شوہر مجھے طلاق دے دے گا اور میری بیٹی روبینہ بری طرح سے رو رہی تھی اور اس میں اپنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا۔ میری بیوی نجمہ بھی چیخنے لگے۔

''پہلے تم پر اپنے بھائی کی محبت سوار تھی اور جب تم ایک مرتبہ اس کے ہاتھوں چوٹ کھا چکے تھے تو میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی اس شاطر انسان کے بیٹے سے نہ کرو۔ لیکن تم نے میری ایک نہ مانی، ساری زندگی تم نے اپنی ہی چلائی اور نقصان اٹھایا۔ اب کیا اپنی بیٹی کا گھر بھی اپنے ہاتھوں برباد کرو گے۔''

''نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' میں بیٹھا بہت دیر تک روتا رہا۔

اس کے بعد میں اپنے وکیل معین خان کے پاس گیا اور کہا۔ ''میں اپنا کیس واپس لینا چاہتا ہوں۔''

وہ حیرت سے بولا۔ ''وہ کیوں؟ آپ تو بڑے جذبے کے ساتھ آئے تھے اور واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، میں نے بڑی مشکل سے آپ کے لیے راستہ نکالا تھا اور اب آپ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔''

''نہیں وکیل صاحب بس رہنے دیں۔ میں نے اپنا معاملہ اب اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔ شاید میں ایک کم عقل اور بے شعور انسان ہوں۔''

جیسے ہی میں نے کیس واپس لیا ریاض الدین میرے گھر پر آیا اور کہنے لگا۔ ''دیکھو کریم الدین تم میرے بڑے بھائی ہو، اب یہ حماقتیں کرنا چھوڑ دو اور میں اور تم اب نہ صرف بھائی ہیں بلکہ آپس میں سمدھی بھی ہیں اور مزید پریشانی والے کاموں سے گریز کرو، میں اپنی بہو روبینہ کو لے جانے آیا ہوں اور میں میری بیٹی اس کے ساتھ واپس اپنے شوہر کے گھر چلی گئی اور میں ایک بار پھر تن بہ تقدیر ہو کر خاموش ہو گیا۔

اور آج میں ایک بڑی ہول سیل کی دکان پر مزدوری کرتا ہوں اور میرا بھائی عیش و آرام کی زندگی گزار رہا ہے جو کہ میرے پیسوں اور دولت کے بل پر ہی ہے جو کہ اس نے شاطرانہ طریقے، چال بازی اور میری بے وقوفی سے حاصل کر لیا اور اب میں بے دست و پا ہوں اور آج میری بیوی اور بیٹے مجھ سے نالاں ہیں اور ہر طرح کا قصوروار مجھے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے پاس کچھ نہ رہا اور میں ایک غریب اور معمولی سا آدمی ہوں اور میرے پاس سوائے پچھتاوے کے کیا رہ گیا ہے۔ یہ شاید میرے گناہوں کی سزا ہے اور جو کچھ میں نے مال حرام، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور بے ایمانی کے ذریعے کمایا تھا میرے پاس نہ رہا لیکن میرے دل میں امید کی ایک کرن اب بھی باقی ہے کہ میں اپنی زندگی سے صرف اس لیے مطمئن ہوں کہ میرے پاس اب مال حرام موجود نہیں ہے اور برائیوں سے پاک ایک زندگی گزار رہا ہوں۔''

چاچا کریم الدین کی کہانی ختم ہو چکی تھی اور اب انہوں نے پانی کا ایک گلاس بھر کر پیا اور کہنے لگے۔

''بابو جی! آپ کو میری کہانی یقیناً پسند آئی ہو گی اگرچہ خاصی طویل ہو گئی ہے اور میں نے آپ کا بہت ٹائم بھی لیا ہے۔''

''ارے نہیں نہیں چاچا کریم، آپ ہمارے بزرگور بڑے ہیں میں یہ کہانی ضرور لکھوں گا تاکہ نہ صرف معاشرتی برائیوں کی عکاسی ہو سکے اور انسان کسی پر بھی اندھا اعتماد کرنے سے پہلے تھوڑا سا غور و فکر کر لے، کیونکہ آج کل کا دور مفاد پرستی کا دور ہے اور سگے بھائی کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے بابا کریم الدین کو جواب دیا اور ہم بوجھل قدموں سے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہونے لگے کیونکہ ٹرین کی وسل کی آواز آ رہی تھی تاکہ جلد اپنے گھر پہنچیں اور زندگی کل پھر اسی طرح رواں دواں رہے۔

☆☆☆

دوسری ٹرین حکایت

# رستوں کے ساتھ ساتھ



محمد بلال فیاض

اُس عورت کی داستان، جسے ہر موڑ پر صرف رستوں کے ساتھ ساتھ ہی رہنا تھا

"چھک چھک چھک چھک......" ریل کی رفتار بڑھاتی آوازیں ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ دھیرے سے پلنگ پر ڈھے گئی تھیں اور پھر آنکھیں موندتے ہی یادوں نے ان کے گرد میلے لگا دیے۔

صحن کے علاوہ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ صحن میں پڑے تخت پر عشاء کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ وسیع و عریض صحن میں ایک چھوٹی سی ٹیوب لائٹ کی محدود روشنی بھلا کہاں تک اندھیرے کو ختم کر سکتی تھی۔ صحن کے کونے میں لگا آم کا قد آور درخت اندھیرے میں بھوت کی طرح ڈراؤنا لگ رہا تھا۔

انہوں نے سلام پھیرا اور دیوار سے ٹیک لگا کر تسبیح کے دانے ہولے ہولے گرانے لگیں۔ اس سناٹے میں تسبیح کے دانوں کی ٹک ٹک واضح سنائی دے رہی تھی۔ "یہ تنہائی اور بڑھاپا دونوں بڑی جان لیوا چیزیں ہیں۔" انہوں نے دکھ سے سوچا۔

کتنا ارمان تھا انہیں کہ اسفر کی شادی ہو جائے۔ پھر اس گھر کے آنگن میں بھی چوڑیوں کی کھنک سنائی دے۔ ہنسی کی پازیب بجے۔ بچوں کی کلکاریاں سنائی دیں مگر اسفر تو اپنے خواب پورے کرنے میں مگن تھا۔

"آج اسفر آئے گا تو میں اسے ہر حال میں شادی کے لیے قائل کر لوں گی کیونکہ مجھ سے اب یہ تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔" انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ کر خود سے کہا تھا۔

☆......☆

"بس بیٹا! اب مجھ سے اس بڑھاپے میں اس گھر کی تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔" دادی کی آواز سن کر اس کا کھانے کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔ "دادی آج پھر آپ یہ موضوع لے کر بیٹھ گئیں۔" اس نے روٹی کا نوالہ توڑا۔

"بیٹا! اپنی بوڑھی دادی کی طرف دیکھو۔ اپنی بوڑھی دادی پر ترس کھا۔" دادی کی آواز رندھ گئی۔ اس نے بے اختیار دادی کی طرف دیکھا۔

چہرے پر بے شمار جھریاں، زرد اور ناتواں چہرہ۔ بوڑھی، التجا کرتی آنکھیں جن میں گرم سیال تیر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اسفر کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے دادی میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر اس نے کہہ ڈالا۔ دادی کو گویا دو جہانوں کی دولت مل گئی تھی۔

"پھر کوئی لڑکی ہے تیری نظر میں؟" دادی نے شوخ لہجے میں پوچھا۔ "نہیں کوئی نہیں۔" اس جواب پر تو دادی نہال ہی ہو گئی۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں کل سے لڑکی کی تلاش شروع کر دوں۔" دادی کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ اسفر مسکرا دیا۔

"جی ضرور...... ضرور......"

☆......☆

ڈاکٹری رپورٹ دیکھ کر اس کے اردگرد دھماکے ہونے لگے۔

"مجھے کینسر ہے۔" ہونٹ لرزنے لگے۔ آنکھیں پتھر ہو گئیں۔

کمرے میں داخل ہوتے احسن صاحب نے یہ منظر دیکھا تو ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ عائشہ احسن کو دیکھ کر دیوانہ وار ان کی طرف بڑھیں۔

"آپ نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی۔ بتائیں؟ کیوں چھپائی آپ نے مجھ سے اتنی بڑی بات۔" وہ ان کی قمیض کا کف جھنجھوڑ کر ان سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار آنسو تھے۔ "پلیز کول ڈاؤن! میں تم سے یہ بات ہرگز چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا تھا مگر......"

"مگر...... مگر کیا؟" وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

"مگر کسی مناسب وقت، مناسب طریقے سے میں تمہیں بتا دیتا، سمجھا دیتا۔ مجھے کیا معلوم تم اچانک یہ رپورٹس دیکھ لوگی اور تمہیں گھبرانے اور اپنی اس بیماری کے متعلق زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ کینسر کا علاج ممکن ہے۔ ہم عنقریب بہت بڑے اسپیشلسٹ کے پاس چلیں گے تمہارے علاج کے لیے اور پھر تم انشاء اللہ ضرور صحت یاب ہو جاؤ گی۔ میں نے ایک بہت ماہر ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے۔ بس تم فکر نہ کرو۔" احسن صاحب نے عائشہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ صوفے پر ڈھے سی گئیں۔

اور پھر احسن صاحب اور عائشہ چھ سالہ اسفر کو دادی کے پاس روتا بلکتا چھوڑ کر دوسرے شہر روانہ ہوگئے مگر تقدیر کو تو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ احسن صاحب اور عائشہ جس ٹرین میں بیٹھے تھے بدقسمتی سے وہ حادثے کا شکار ہوگئی۔ جس میں وہ دونوں بھی جاں بحق ہو گئے۔ ان کی موت کی خبر نے تو دادی کی ساری جان کھینچ لی۔ دادی کی زندگی میں تو دکھ زیادہ اور سکھ کم تھے۔ بھری جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ ساری عمر محنت کی، بچوں کو ٹیوشن پڑھایا، اسکول میں نوکری کی اور احسن صاحب کو پال پوس کر جوان کیا۔ احسن صاحب کی شادی کے بعد انہوں نے سوچا کہ بس اب ان کی زندگی میں سکھ کا موسم آ گیا ہے مگر دادی کا اور سکھ کا شاید کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ کچھ لوگ دنیا میں صرف دکھ اٹھانے کے لیے ہی آتے ہیں۔

اب احسن صاحب اور عائشہ کی اچانک موت کے بعد دادی کو یوں لگا جیسے وہ ایک بار پھر بیوہ ہوگئی ہیں اور چھ سالہ اسفر احسن کی شکل میں ان کے سامنے کھڑا ہے۔ دادی نے ایک بار پھر بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک پرائمری اسکول میں نوکری کر لی حالانکہ یہ ان کے آرام کے دن تھے مگر اسفر کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ ضروری تھا۔

اور یوں دادی نے اپنی صحت کی پروا کیے بغیر اسفر کو پڑھایا لکھایا، کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی، خود فاقہ کیا مگر اسے پیٹ بھر کے کھلایا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ زندگی



کے دھارے میں اسے اپنا راستہ بنانا سکھایا۔

اسفر نے ایم بی اے کے ساتھ اسے ایک پرائیویٹ بینک میں جاب مل گئی۔ دادی بھی بے حد خوش تھیں۔ دادی کی خواہش تھی کہ اب اسفر شادی کر لے مگر اس نے تو آنکھوں میں کچھ اور ہی خواب سجا رکھے تھے۔ ایک گاڑی بڑی کا خواب، خوب صورت بنگلے کا خواب جس میں نوکروں کی لمبی فوج ہو، ڈھیر ساری دولت کا خواب وغیرہ۔ یہی وجہ تھی کہ دادی جب بھی شادی کا ذکر کرتیں وہ ٹال جاتا تھا مگر آخر کار دادی نے اسے شادی کے لیے قائل کر کے ہی دم لیا۔

☆......☆

''یہ کچھ تصویریں ہیں۔ خالہ نسیم (رشتے کروانے والی) لائی تھیں۔ تم دیکھ لو ان میں سے جو پسند آئے بتا دینا۔'' رات کا کھانا کھاتے ہوئے دادی نے تصویروں کا خاکی لفافہ اس کے آگے رکھ دیا جسے اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔

اور پھر دوسرے دن ہی اس نے ایک تصویر منتخب کر کے دادی کو تھما دی۔ دادی تو خوش ہو گئیں۔

''مجھے بھی یہ لڑکی ہی پسند آئی تھی۔'' وہ مسرت سے گویا ہوئیں تو اسفر بھی ہنس دیا۔ اور پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا حساب ہوا۔ حجاب تصویر میں جتنی خوب صورت تھی، حقیقت میں اس سے زیادہ حسین تھی۔ جہاں لڑکے والوں کو لڑکی پسند آئی وہاں لڑکی والوں کو بھی لڑکا بے حد اچھا لگا۔

دادی نے جھٹ پٹ شادی کی تیاری کر ڈالی۔

''دادی! آپ میں اتنی پھرتی کہاں سے آ گئی۔'' اسفر شادی کی تیاریوں میں مگن دادی کو چھیڑتا تو دادی ہنس دیتیں۔

☆......☆

وہ ایک حسین شام تھی۔ جب حجاب چاندنی بن کر اسفر کے سونے آنگن میں اتری تھی۔ دادی کے تو مارے خوشی کے زمین پر پاؤں نہ ٹک رہے تھے۔ کیونکہ ان کی دیرینہ خواہش جو پوری ہوئی تھی۔

حجاب بہت محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے آ کر گھر کا سارا نظام بڑے سلیقے سے سنبھال لیا تھا۔ دادی نے تو شکر کا کلمہ پڑھا اور اب وہ زیادہ تر یاد الٰہی میں مشغول رہتیں یا پھر حجاب اور اسفر کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتیں۔ اور ان کی خوش حال زندگی کی مزید دعائیں کرتیں۔ شادی کے بعد اسفر اور حجاب کی زیادہ تر شامیں گھر سے باہر گزرنے لگیں۔ اسفر تو شادی کے بعد حجاب کا ہو کر رہ گیا تھا مگر دادی نے کبھی شکوہ نہ کیا وہ اس کی خوشی میں خوش تھیں۔

ایک دن اسفر دادی کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔

''دادی! میں اور حجاب شمالی علاقہ جات کی طرف جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔'' دادی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں۔ ''پھر؟''

''دادی! میں نے بینک سے چھٹیاں لے لی ہیں۔ پندرہ دن کی۔'' وہ پھر بولا۔

''اچھا! چلو ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ زمانہ ہو گیا شمالی علاقہ جات گئے ہوئے۔ آخری دفعہ تمہارے دادا کے ساتھ گئی تھی۔'' دادی نے مسکراتے ہوئے بتایا تو اسفر بوکھلا گیا۔ ''آ...... آپ...... بھی جائیں گی؟ لیکن بھلا آپ کیا کریں گی جا کر میں اور حجاب چلے جاتے ہیں۔''

''تم اور حجاب چلے جاؤ گے اور میں گھر میں اکیلی تنہا......!'' دادی نے کہا۔ ''آخر دادی سمجھتی کیوں نہیں۔'' اسفر نے جل کر سوچا۔ ''دادی......! بس میں نے کہہ دیا آپ گھر رہیں گی اور صرف میں اور حجاب جائیں گے۔'' اسفر نے سخت لہجے میں کہا اور دھپ دھپ کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

دادی شدید حیران تھیں۔ یہ وہی اسفر تھا کتنا بدل گیا تھا۔ اس کے لہجے میں مجھ سے بھی بات نہ کی تھی۔ دادی سوچتی ہی رہ گئیں۔

☆......☆

اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔

دادی ایک بار پھر تنہا ہو گئیں۔ اکیلی رہ گئیں۔ وہ جتنا تنہائی سے بھاگتیں تنہائی اتنا ہی ان کا پیچھا کرتی۔

''شاید میرے مقدر میں یہ تنہائی ہی لکھی ہے۔'' دادی نے تخت پر نیم دراز ہوتے ہوئے سوچا۔ دور سے عشاء کی اذان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صحن میں دادی کے تخت کے پاس ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی کے علاوہ پورا گھر اندھیرے میں گم تھا۔

جب احسن صاحب کے والد فوت ہوئے تب بھی وہ یوں ہی تنہا تھیں۔ اور آج...... آج بھی وہ یونہی اکیلی تھیں۔ تنہا تھیں۔ وہ چشم زدن میں پوتا اور بہو کو ریل میں اٹکھیلیاں کرتے دیکھ رہی تھیں۔ اور ریل کی وسل ان کے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ویرانی کا سینہ چاک کر رہی تھی۔ دادی دھیرے دھیرے مسکرانے لگیں اور انہیں لگا وہ کسی پلیٹ فارم پر بیٹھی ہیں۔ پوتے اور بہو کو الوداع کرتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی ہیں۔ چھک چھک چھک کی آواز مزید تیز ہو گئی۔

☆☆☆

# ٹرین کب آئے گی

نسیم سکینہ صدف

اُس بوڑھے کی داستانِ عجب' جس کی زندگی پلیٹ فارم پر انتظار بن کر معلق ہو گئی تھی

وہ ضعیف آدمی آج بھی پلیٹ فارم پر صبح اسی وقت آیا جیسے وہ روز آیا کرتا تھا۔ اس کی چال بھی ایک ہی طرح کی ہوتی تھی۔ ویسے ہی آگے کی طرف اس کا جسم جھکا ہوا ہلکا سا خم کھایا ہوا، داہنا کاندھا کچھ نیچا اور بایاں ہاتھ کبھی سیدھا کبھی کمر پر رکھا ہوا۔ یہاں چٹیانہ کے اسٹیشن پر اپنی تجسس بھری آنکھوں کے ساتھ آتا تھا۔ پہلے نمبر کے پلیٹ فارم پر جو خاصا لمبا ہے، دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ایک دم آخری سرے سے پہلے ایک بینچ کے کونے پر بیٹھ جاتا تھا اور شورکوٹ جنکشن کی طرف دیکھتا تھا۔ ڈاکٹر نے صبح کی سیر کی پابندی کردی تھی اور شام کو سڑک ناپنے کی پابندی اختر نے لگا دی تھی۔ جب سے اس ریلوے اسٹیشن کی حسن کاری ہوئی تھی میں بھی دوسروں کی طرح صبح کو اِدھر ہی آجاتا تھا۔ اب صبح کے وقت بہت سے لوگ آجاتے تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم ہوتا تھا کچھ چہل پہل رہتی تھی۔ پتا نہیں یہ ضعیف آدمی کب سے یہاں آتا تھا۔ صبح کی سیر تو اس کا مقصد نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ آکر اسی ایک گوشے میں بیٹھ جاتا تھا۔ اپنی چپل سے ایک پاؤں نکال کر دوسرے پاؤں کے گھٹنے پر رکھ کر ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتا تھا۔ پھر اپنے کسی ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکا کر بڑے گمبھیرانہ انداز میں دیکھتا تھا۔

کہیں بہت دیر سیر کر لینے کے بعد میں جب تھک جاتا تھا تو اس سے کچھ دور والی بینچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگ جاتا تھا اور کبھی کبھی اپنی گردن گھما کر اسے دیکھ بھی لیتا تھا۔ وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھتا یا تو وہ سامنے دیکھتا یا پھر شورکوٹ جنکشن کی طرف جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ لیکن صبح کی گاڑیاں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرف نکل جاتیں تو کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھتا تھا اور آہستہ قدم چل کر بے حد تھکی آواز میں پان والے سے پوچھتا تھا۔

''فیصل آباد کے لیے ٹرین کب آئے گی؟''

پان والا ہنس دیتا تھا اور روز کی طرح کہتا تھا۔''بابا وہ تو گئی......گئی؟''

''لیکن میں تو یہیں بیٹھا انتظار کر رہا تھا''

پان والے نے اس کی بات کا اب کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔

''فیصل آباد والی ٹرین......؟''

''اب کل آنا بابا!'' اس کی کچھ اکتائی ہوئی آواز میں شاید تھوڑا سا پیار بھی تھا یا شاید مجھے ہی ایسا لگ رہا تھا اور میں بھی تھک جانے کے بعد اخبار پڑھنے لگا تھا۔ ہوا خوشگوار تھی اور املتاس کے پھولوں کا سایہ ہم دونوں کے سروں پر تھا۔ خبروں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اوب کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت پاکستان ایکسپریس دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر گئی، بہت تیز رفتاری سے۔ اسے لمبا



سفر جو طے کرنا تھا نا، لاہور سے کراچی تک اور لمبے سفر کے لیے تیز رفتاری تو ضروری ہے۔ اس کے بعد شالیمار ایکسپریس، شالیمار ٹرین کی اپنی ہی شان ہے۔

بوڑھے آدمی نے اپنی گھڑی دیکھی۔ میں نے اس کے بینچ کے قریب جا کر کہا۔ ''آج شالیمار لیٹ ہے بابا۔''

''اب شالیمار بھی......'' بوڑھے آدمی نے پہلی بار مجھے مسکرا کر دیکھا اس کی مسکراہٹ کچھ اس سے بھی زیادہ بوڑھی معلوم ہوئی تھی۔

''ہوتا ہے بابا۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔'' ہماری بات ختم نہ ہو پائی تھی کہ نائٹ کوچ آ گئی اور اس چھوٹے سے اسٹیشن پر خدا معلوم کیوں رک گئی۔ ''اسے کیا ہوا جو یہاں......؟''

''آگے شورکوٹ جنکشن پر پلیٹ فارم خالی نہ ہوگا۔''

''تمہیں ان ٹرینوں کی بہت واقفیت ہے۔'' وہ پھر مسکرایا۔ اس بار اس کی مسکراہٹ اور آواز اچھی لگی۔

''بہت تو نہیں بابا تھوڑی سے کام چلاؤ معلومات رکھتا ہوں۔'' میں بھی اسی بینچ پر بیٹھ گیا۔ نائٹ کوچ کے مسافروں نے آئس کریم، پان، سگریٹ اور ناشتا، کچوریوں والوں کو خوب نوازا۔ وہ ضعیف آدمی مسکراتا رہا اور بس اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے سفید بالوں میں اب تک لہریں باقی تھیں۔ گھنے سر کے بال دو بچوں جیسے اس کے بے داغ چہرے پر اچھے لگ رہے تھے۔ پس منظر میں نے سوچا۔ یہ شخص خوب صورت رہا ہوگا۔

''کیا سوچتے ہو بیٹا؟'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''سوچ رہا تھا بابا کہ آپ کس کے لیے آتے ہیں؟''

''ہاں! میں اپنے آپ کے لیے آتا ہوں۔'' وہ ٹھنڈی سی آواز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''ایک وقت ایسا بھی آتا ہے بیٹا سمجھ لو گے جب تم پر ایسا وقت کبھی آئے گا۔ میں تو زندگی کا قیدی ہوں لیکن شاید جہاں پہنچنا تھا وہاں پہنچ نہیں پایا۔ شاید راستہ بھٹک گیا لیکن قسمت ہے یا خدا کی رضا۔''

''بابا پھر بھی میں سمجھا نہیں۔''

''تم نے زندگی کہاں دیکھی ہے تم کیا سمجھ پاؤ گے؟ یہ باتیں سمجھانے کی نہیں۔'' ''خوب دیکھی ہے میں نے زندگی۔ اس جیون میں بڑا شوقِ آوارگی رہا ہے۔'' میں نے طاقت بھری آواز میں کہا۔ ''بیٹا! تم نے تپتی دوپہر میں چٹیل سڑک کے کنارے سائیکل کا پنکچر بنوایا ہے کبھی؟''

''بابا وہ بات دراصل یہ ہے......'' میں بوڑھے کے

اس اچانک حملے سے گڑبڑا سا گیا۔

"تم مجھ کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تمہارے پاس کچھ چھوٹ جانے کی یادیں نہیں ہیں۔ بچھڑے ہوئے چہروں کی ریکھا میں تمہاری آنکھوں میں نہیں ہیں۔ تم نے زمین سے شیشے کو ہاتھ سے صاف کر کے گرم تپتی ہوئی زمین پر جھوٹ کا بوریا بچھا کر بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے سینکڑوں کو نہ جوتے والی آنکھوں سے سنیٹ پر نقصان کے حساب نہیں لگائے ہیں۔ زمین کے ٹوٹے شیشے کو پرانے پوسٹ کارڈ چپکا کر جوڑنے کا جو کھیل بھی نہیں کھیلا ہوگا۔"

اس لمبی سانس لینے کے لیے وہ بوڑھا لمحہ بھر رکا میں کچھ کہنے والا تھا کہ وہ پھر بولنے لگا۔

"تم نے معصوم و بے غرض، بے ریا لوگوں کو نہیں دیکھا۔ بجلی آنے سے پہلے کی زندگی نہیں دیکھی، تم جلاوطنوں جیسی زندگی گزارتے ہو اور دھوپ کی دنیا سے بے نیاز ہو۔"

اس وقت کی آگہی لیکن وہ اسی حالت میں بولتا چلا گیا۔

"تم نے اعصاب زدہ زندگیاں گزاری ہیں۔ تمہیں کیا پتا آدمی کیا ہوتا ہے۔ دور سے آنے والی ہواؤں کی خوشبو کیا ہوتی ہے۔ انتظار کیا ہوتا ہے؟ تمہیں تو محسوس کرنے اور گنگنانے کی فرصت بھی نہیں۔ دنیا سب کا خون پی جاتی ہے۔"

میں نے کہنا چاہا لیکن الفاظ میرے دل میں ہی رہ گئے۔

"بیٹا! ایسا تمہارے ساتھ بھی ہوا ہے کہ پانی کوئی دوسرا پیے اور پیاس تمہاری مٹ جائے؟"

"نہیں..... نہیں ایسا بھی ہوتا بھی ہے کیا؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔ "نہ سمجھ پاؤ گے۔" اب ہم دونوں کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ پھر میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

"آپ کون ہیں بابا؟"

بوڑھے کی پیشانی پھر شکن آلودہ ہو گئی۔

"وہ عہد و پیماں کے جزیرے جہاں محبت کی فصلیں اگتی تھیں۔ تمہارے لائے ہوئے زہر کے سمندر میں ڈوب گئے۔ اب تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟ دن کا دروازہ بند ہو جاتا ہے لوگوں کی پہچان بھی بند ہو جاتی ہے۔" کس قدر جھکی اور چڑچڑا ہے یہ بوڑھا۔ میں نے دل میں کہا اور چپ ہو رہا۔ لیکن چلنے سے پہلے ہمت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔

"بابا آپ کرتے کیا ہیں۔"

"میرا کیا پوچھتے ہو؟ خوش ہوں کہ دوسرے خوش ہیں۔ بھیڑ میں تنہا پہلے تماشا دیکھتا تھا۔ اب خود تماشا ہوں۔ بوریں شیشے میں مقید مچھلی دیکھی ہے تم نے؟ جی ہاں وہ مچھلی خالی پیتی ہے، ہر وقت تیرتی پھرتی ہو سب اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن مچھلی تو شیشے کی دیوار کے اندر ہے۔ اسے کہاں کچھ نظر آتا ہوگا؟ اپنے کمرے کی راکنگ چیئر پر میں تھکا ہوا مقید، کچھ کر گزرنے کی خواہش پر اب کچھ نہ کرنے کی خواہش آگئی تھی۔ وہاں بیٹھا بیٹھا چپ چاپ جتنی دنیا دکھائی دیتی ہے، دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں، اب موت نہیں زندگی مایوس کرتی ہے۔"

وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ میرے ساتھ یا شاید میں ہی اس کے ساتھ چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے سائے ایک ہو گئے۔ اس وقت اگر نزدیک سے بھی کوئی ہمیں دیکھتا تو اسے ہم دونوں ایک ہی لگتے۔

بہت وقت گزر گیا تھا۔ ایک ضعیف آدمی آج بھی اسی پلیٹ فارم پر اسی وقت آیا تھا اور دور بینچ پر اس طرح ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ املتاس کے پھول بھی اسی رنگ میں اوپر کھلے ہوئے تھے۔ گاڑیاں آج بھی یوں ہی آ اور جا رہی تھیں۔ شالیمار ایکسپریس، پاکستان ایکسپریس، نائٹ کوچ، خوش دلی کے شب و روز کے سبز جزیرے جنہیں زیر سمندر گوشے نے چھپا لیا۔ خالی نگاہیں ادھر وہاں دیکھ رہی تھیں۔ جہاں کچھ نہیں تھا اور جب پلیٹ فارم پر سناٹا ہو گیا تو اس نے پان والے سے پوچھا۔

"فیصل آباد جانے والی ٹرین کب آئے گی بھائی؟"

"وہ تو گئی بابا۔"

"لیکن یہ کیسے ہوا؟"

وہ کچھ زیر لب سا بڑبڑایا تھا۔ "میں تو یہیں اس بینچ پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ پھر کیسے....."

"اب کل آنا بابا۔" اس نے کچھ اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا تھا لیکن اس کی آواز میں شاید تھوڑا سا پیار بھی تھا یا شاید یہ مجھے ہی ایسا لگ رہا تھا۔

"پان والے کے آئینے میں میری بوڑھی صورت ایک لمحے کے لیے جھلک گئی۔ جواب جگہ جگہ پھیلنے لگی تھی۔ نئے دن کا آغاز کہ دوسرا آغاز اور نیا اختتام اور کوئی نیا مستقبل..... سب کچھ بدلتے ہوئے آنگن میں سمٹنے لگا تھا۔

☆☆☆

تیسری ٹرین حکایت

# اگر میں دروازہ نہ کھولتا



شیخ معظم الٰہی

ٹرین کے سفر کی ایک ناقابلِ فراموش یاد، جو یقیناً آپ کو بھی عرصے تک یاد رہے گی

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور اپنے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا میرے بڑے بھائی جناب محمود الٰہی کا خط آیا جو ان دنوں کراچی میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں رہائش پذیر تھے۔ انہیں نئی نئی ملازمت ملی تھی اور دفتر کی جانب سے رہائش کے لیے ایک خوب صورت گھر اور آنے جانے کے لیے کار ملی



ہوئی تھی۔ان کی رہائش ناظم آباد کراچی میں تھی۔اب انہوں نے مجھے کراچی آنے کی دعوت دی تھی۔

یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ چھٹیاں تو بہت مزے کی گزریں گی۔ دوسرے یہ کہ مجھے کراچی میں موجود قائداعظم کا مقبرہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لہٰذا اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب مجھے کراچی روانہ ہونا تھا۔لہٰذا میں اور میرے دو چچازاد بھائی بس اڈے پر پہنچ گئے اور ملتان جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔موسم خوشگوار تھا۔اس لیے بس کا سفر بڑا اچھا گزرا۔پھر ہم ملتان ریلوے اسٹیشن پہنچ کر کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ہمیں سیٹیں بہت اچھے ڈبے میں ملی تھیں۔غالباً ان سب کو بھی کراچی ہی جانا تھا۔

ہم نے اپنا اپنا سامان اوپر برتھ پر رکھا اور ٹرین چھک چھک کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔میرے چچازاد بھائی اور میں اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ٹرین کی تیز رفتاری کے ساتھ وقت بھی اتنی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے آٹھ بج چکے تھے تو میرے چچازاد بھائیوں کو نیند آنے لگی کیونکہ ہم نے صبح سے سفر کا آغاز کیا تھا۔تھکاوٹ کی وجہ سے انہیں جلد نیند آ گئی تو وہ اوپر برتھ پر جا کر لیٹ گئے اور میں نیچے والی سیٹ پر بیٹھا ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔میں نے ایک نظر ڈبے پر ڈالی، خنکی بڑھ جانے کی وجہ سے تمام مرد اور خواتین اپنی اپنی سیٹوں اور کچھ برتھ پر لیٹے ہوئے تھے۔ایک خاتون اپنی سیٹ پر سو رہی تھی جب کہ اس کا ننھا سا بچہ اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا فیڈر سے دودھ پی رہا تھا اور اپنی ماں کو خراٹے لیتے ہوئے اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔مجھے اس بچے پر بے اختیار پیار آ گیا کچھ مرد اور خواتین اونگھ بھی رہے تھے۔میری نظر سامنے والی سیٹ پر پڑی جہاں ایک خاتون لیٹی ہوئی تھی۔وہ بار بار اپنے ایک چھوٹے سے بیگ پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔غالباً اس کے پاس کوئی رقم ہوگی۔زیور یا اور کوئی قیمتی چیز وغیرہ۔

رات گہری ہو چکی تھی۔آسمان پر گہرے گہرے بادل بھی آ رہے تھے۔بڑے بڑے درخت بھوتوں کی مانند پیچھے کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔کہیں کہیں جھاڑیوں میں سے آگ کی چنگاریاں بھی لگی نظر آ رہی تھیں۔دور دور کہیں ننھی سی بتیاں ایک لمحے کو جلتی ہوئی دکھائی دیتیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔رات کا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ٹرین میں ایک ننھا سا بلب لگا ہوا تھا جس نے سارے ڈبے میں روشنی کر رکھی تھی۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔مجھے بھی اب نیند آنے لگی تھی۔لہٰذا میں نے اپنے بیگ سے چادر اور تکیہ نکالا اور اپنی سیٹ پر لیٹ گیا۔میری آنکھ اس وقت کھلی جب ٹکٹ چیکر مسافروں کو ہدایت کر رہا تھا کہ تمام مسافر ڈبے کی کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح سے بند کر دیں کیونکہ آگے آنے والا علاقہ خطرناک ہے۔ٹکٹ چیکر یہ ہدایت دے کر چلا گیا مگر تمام مسافروں کے رگ و پے میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ہم سب نے اپنے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دیں اور سب نے اپنے اپنے سامان اپنے قریب رکھ لیے۔میں نے گھڑی پر نگاہ کی تو رات کے تین بجے تھے۔اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔میرے دونوں چچازاد بھائی بھی جاگ گئے تھے۔میں نے تھوڑی سی کھڑکی کھول کر دیکھا سامنے بڑے بڑے پہاڑ اور درخت پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے اور ہر طرف مٹی اڑ رہی تھی۔میرے سامنے والی سیٹ پر خاتون ابھی تک جاگ رہی تھی اور اس کی وہی مضطرب سی کیفیت تھی۔میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور رسالہ پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی کھڑکی پر دستک سی محسوس ہوئی۔میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب دوبارہ دستک ہوئی تو میں ہی نہیں تمام مسافر بھی چونک گئے۔تیسری مرتبہ جب دستک کے ساتھ آواز بھی آئی کہ دروازہ کھولو! خدا کے لیے دروازہ کھولو۔میں اور تمام مسافر سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔اب دستک کے ساتھ ہی باہر سے کسی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میری کھڑکی کا پٹ اوپر اٹھا دیا۔یہ میری غلطی تھی کہ میں نے باہر دیکھنے کے بعد کھڑکی کو مضبوطی سے بند نہیں کیا تھا۔

باہر ایک ادھیڑ عمر کا پٹھان اپنے ایک ہاتھ سے دروازے کا ڈنڈا پکڑے ہوئے تقریباً جھول رہا تھا۔ٹرین کی چھک چھک کے ساتھ اس کی التجا ہمارے کانوں میں سنائی دی کہ خدا کا واسطہ دروازہ کھول دو ورنہ ہم ٹرین کے نیچے آ جائے گا۔اللہ پاک کا واسطہ دروازہ کھول دو۔

میں نے ایک لمحے اس کی طرف دیکھا وہ شاید رو رہا

تھا۔ یکا یک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ کسی عورت کا شوہر ہو۔ بچوں کا باپ ہو۔ کسی کا بھائی ہو۔ شاید اسی لیے وہ رو رو کر ہم سے کہہ رہا تھا کہ دروازہ کھولو اگر وہ کوئی ڈاکو یا چور ہوتا تو وہ بندوق سے فائر کرتا یا پھر ڈرا دھمکا کر ہمیں دروازہ کھولنے پر مجبور کرتا۔ بس اسی خیال کے تحت میں ایک جھٹکے سے اٹھا تا کہ دروازہ کھول دوں مگر سب مسافروں نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ کیا سب کو مروانے کا ارادہ ہے۔ میرے چچا زاد بھائیوں نے بس مجھے ایسا کرنے سے روکا مگر میں نے کسی کی پرواہ کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔

وہ شخص ایک لمحے کے اندر ڈبے میں آ گیا۔ تمام مسافروں کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے ہیں اور میں بھی اسی شخص کو خوف اور حیرت کی ملی جلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ غالباً کوئی فوجی تھا کیونکہ اس نے فوجی لباس پہنچ رکھا تھا اور کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی۔ سر مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ مجھے بندوق دیکھ کر ڈر سا محسوس ہوا مگر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور اس کی سیاہ داڑھی میں جذب ہو گئے۔ وہ گڑگڑا کر اللہ پاک کا شکر ادا کر رہا تھا۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا کہ بیٹا اگر تم ہمارا جان نہ بچاتا تو ہم ٹرین کے نیچے آ گیا ہوتا۔ اللہ پاک کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہماری جان بچائی۔ مسافروں کے چہرے ابھی تک زرد پڑے ہوئے تھے۔ غالباً وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ڈاکو ہے جو ہمیں بہلا پھسلا رہا ہے۔ میں نے اس فوجی کو اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک قبائلی علاقے میں لانس نائیک کے عہدے پر فائز ہے۔ اچانک اسے اپنی بیوی کا تار وصول ہوا کہ وہ شدید بیمار ہے اسی لیے وہ چھٹی لے کر اپنے گھر واپس جا رہا تھا اور کسی ضروری کام کے تحت اس کی ایک ٹرین بھی چھوٹ گئی تھی۔

لہٰذا دوسری ٹرین کا انتظار اس نے رات بھر جاگ کر کیا مگر ایک رات مسلسل جاگنے سے اسے نیند آ گئی اور آنکھ تب کھلی جب یہ ٹرین (ہمارے والی) اسٹیشن سے روانہ ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس نے بھاگتے ہوئے ٹرین پکڑی اور ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے کے دروازے کو پکڑتا ہوا ہمارے ڈبے تک پہنچا تھا۔

اس نے شاید یہ سمجھا کہ کسی ڈبے کا دروازہ کھلا ہوا ہو گا تو وہ اندر داخل ہو جائے گا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے سے اسی طرح لٹکا ہوا سفر کر رہا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ اگر میں دروازہ نہ کھولتا تو وہ نیچے گر پڑتا کیونکہ مسلسل جدوجہد کرنے سے اس کے بازو شل ہو چکے تھے۔ پھر اس نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔ وہ بار بار اللہ پاک کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

صبح صادق کا اُجالا اب ہر طرف پھیل رہا تھا۔ ہم نے سب کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ صبح کے چھ بج چکے تھے اور کراچی اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ اس فوجی جس کا نام قیس فارس خان تھا نے اپنے کندھے سے بیگ اتارا اور اس میں سے کیک پیس نکال کر ہم سب کو دیئے مگر مسافروں کو ابھی تک اس پر اعتماد نہیں ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے کیک پیس نہیں کھائے تو فوجی نے کہا کہ شاید آپ سب کو ابھی تک مجھ پر اعتماد نہیں ہوا ہے۔ مگر میں اللہ اور اس کے پیارے نبی اکرمؐ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں کوئی چور اور ڈاکو نہیں ہوں۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ بیٹا یہ میرا گھر کا پتا ہے۔ تم ہمارے گھر ضرور آنا۔ میرا بھی ایک تمہارے ہی جتنا بھائی ہے وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔

اتنے میں کراچی کا اسٹیشن آ گیا اور بھائی محمود الٰہی بھی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارے ڈبے میں آ گئے۔ میں نے اس فوجی کو بھائی محمود الٰہی سے نہیں ملوایا۔ وہ فوجی ہمیں دعائیں دیتا ہوا ٹرین سے نیچے اترا اور چلا گیا۔ بھائی محمود الٰہی نے سارا واقعہ سنا اور میری اس ہمدردی کے جذبے کو سراہا مگر ساتھ ساتھ ایک نصیحت بھی کی جو آپ سب کو میں بتا رہا ہوں کہ ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ آپ اس وقت تک کسی بھی شخص کی مدد نہ کیجیے جب تک آپ کو پورا یقین نہ ہو جائے کہ وہ واقعی آپ کی مدد کا حق دار ہے تو آپ اس کی مدد کیجیے۔ کیونکہ یہی ہمارا اخلاقی اور انسانی فرض ہے۔

مجھے اس شخص کی آنکھوں اور لہجے میں ایک سچائی اور حقیقت نظر آئی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے اس پر اعتماد کیا اور سب لوگوں کے منع کرنے کے باوجود اسے اندر آنے دیا۔

آج اس واقعے کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ نہ جانے وہ فوجی کہاں گیا۔ اس کے بیوی بچوں کا کیا حال ہو گا۔ اللہ کرے وہ جہاں بھی ہو خوش ہو۔ آج میں جب بھی ٹرین میں سفر کرتا ہوں تو وہ واقعہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)۔

☆☆☆

پانچویں بہترین حکایت

# بزنس کلاس کا سفر



دستگیر شہزاد

کچھ سفر اپنی یادوں کی عفریت روح تک میں پیوست کر ڈالتے ہیں

**جب** میں پلیٹ فارم پر پہنچا تو شالیمار ایکسپریس تیار تھی۔ اے سی کیبن میں میرا پہلا سفر تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایسا موقع میرے ہاتھ آ گیا تھا ورنہ میری حیثیت کا آدمی اے سی پارلر کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں ایک دواساز کمپنی میں ڈسپیچ کلرک تھا اور اس وقت شالیمار ایکسپریس میں منیجر کی جگہ خود سفر کر رہا تھا۔ اصل میں کمپنی کا ایک معاملہ سپریم کورٹ میں اٹکا ہوا تھا۔ وکیل نے کچھ کاغذات طلب کیے تھے۔ منیجر خود جانا چاہتا تھا لیکن ایک دن پہلے وہ اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ کاغذات اہم تھے جن کا وکیل تک پہنچنا ضروری تھا۔ منیجر نے یہ ذمہ داری مجھ کو سونپ دی تھی اور اپنے نام کا ٹکٹ بھی میرے حوالے کیا تھا۔ میں منیجر کا ہم عمر تھا۔ منیجر کے نام پر سفر کرنے میں زیادہ دشواری نہیں تھی۔

راستے کے خرچ کے لیے کمپنی کی طرف سے دو ہزار کی رقم بھی پیشگی ملی تھی مجھ کو سفر کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ میں نے راولپنڈی دیکھا تک نہیں تھا۔ میری زندگی یوں ہی بہت تنگی بندھی تھی جیسی عموماً دفتر کے کلرکوں کی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ اے سی میں اعلیٰ طبقے کے لوگ ہوں گے اور میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ پھر بھی میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ منیجر نے مجھے معتبر سمجھا اور میں کمپنی کے کام سے راولپنڈی جا رہا ہوں۔

سب سے پہلے مجھے سوٹ کیس کی مرمت کا خیال آیا۔ میرے پاس ایک پرانا سوٹ کیس تھا جس کی حالت اب خستہ ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا نیا سوٹ کیس خریدوں لیکن سوٹ کیس مہنگا تھا مجھے ارادہ ترک کرنا پڑا۔ پرانے سوٹ کیس کو ہی جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ مرمت کروائی اور نیا تالا لگوایا۔ کپڑے ہمیشہ میری بیوی پریس کرتی تھی۔ اس بار کپڑے میں نے لانڈری میں دھلوائے۔

ڈبے میں گھستے ہی مجھ کو فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس ہوا لیکن گھبراہٹ ایک دم ذرا بڑھ گئی۔ مجھ کو 36 نمبر کی برتھ ملی تھی۔ پردے کے پیچھے سے میں نے کیبن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ یہ چار برتھ والا کیبن تھا۔ اوپر کی دونوں برتھیں خالی تھیں اور سامنے ایک خاتون تشریف فرما تھیں۔ میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالی۔ کھڑکی کا پردہ سمٹا ہوا تھا اور خاتون کے بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ ایک رسالہ پڑھنے میں محو تھی۔ ان کا سامان مختصر تھا۔



ایک چھوٹا سا سوٹ کیس فرش پر رکھا ہوا تھا۔ ایئر بیگ اور ہینڈی بیگ برتھ پر پڑے تھے اور ایک چھوٹا سا تھرماس جو کھڑکی سے لگے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ رسالہ اس کی انگلیوں میں اس طرح دبا ہوا تھا کہ انگوٹھی کا نگینہ نمایاں ہو رہا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بندے ٹمٹما رہے تھے اور گلے میں سونے کی چین چمک رہی تھی جس کا لاکٹ آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ شاید ایمی ٹیشن ہو۔ میں نے سوچا آج کل عورتیں سفر میں زیادہ زیور نہیں پہنتی ہیں۔ دفعتاً میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

’آخر میں خاتون کے بارے میں ہی کیوں سوچ رہا ہوں؟‘

اچانک رسالہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر گر پڑا انہوں نے جھک کر اٹھایا تو زلفیں شانوں پر بکھر گئیں۔

میری نظر اپنے سوٹ کیس پر پڑی مجھ کو لگا سوٹ کیس کا پہلا رنگ نئے تالے سے میچ نہیں کر رہا ہے۔ مجھ کو یاد آیا جب میں نے مرمت کروائی تھی تو سب ٹھیک ٹھاک لگا تھا۔ خاتون کا سوٹ کیس نیا نہیں تھا لیکن اس میں چمک باقی تھی۔ اسی کیبن کے فرش پر آس پاس رکھے ہوئے دونوں سوٹ کیس طبقے کے فرق کو نمایاں کر رہے تھے۔ پرانے سوٹ کیس کا نیا تالا میری حیثیت کی جیسے چغلی کھا رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے خاتون کی طرف دیکھا اور اپنا سوٹ کیس برتھ کے نیچے کھسکا دیا۔

سروس بوائے منرل واٹر کی دو بوتلیں ڈیش بورڈ پر رکھ گیا۔ خاتون نے اپنے حصے کی بوتل ہینگر پر اوندھا کر رکھ دی۔ پھر اسنیکس اور چائے بھی آ گئی۔ میں ایک بسکٹ منہ میں رکھ کر چبانے لگا۔ خاتون نے بسکٹ کو پیالی میں آہستہ آہستہ ایک دو بار ڈپ کیا پھر بسکٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈالا تو مجھ کو احساس ہوا کہ کھانے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ خاتون اسی بے نیازی سے رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھیں۔ اسی دوران انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

مجھ کو سگریٹ کی طلب ہوئی۔ کیبن سے نکل کر میں باتھ روم کے پاس آیا ایک سگریٹ سلگائی اور ہلکے کش لینے لگا۔ اچانک خاتون کے لمبے بال میری نگاہوں میں نہرا گئے اور مجھ کو بیوی کی یاد آئی۔ اس کو کھلے بالوں میں، میں نے کم دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ جوڑا باندھ کر رکھتی تھی۔ صرف غسل کے وقت اس کے بال کھلے رہتے۔ مجھ کو یاد آیا کہ ان دنوں میری بیوی نے صابن کا برانڈ بدلا ہے۔ لرل استعمال کر رہی ہے۔ لرل کا ٹی وی اشتہار میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہو ہڑپ کرتی ہوئی ماڈل گرل۔ میں آہستہ سے مسکرایا۔ میری بیوی ہو ہڑپ نہیں کر سکتی لیکن لرل استعمال کر سکتی ہے۔ لرل اس کو لڑکی سے جوڑتا ہے۔ اس طبقے سے جوڑتا ہے جو ایلیٹ کلاس ہے۔ لرل دونوں میں مشترک ہے۔ اس طرح وہ اپنے ماحول سے فرار حاصل کرتی ہے۔ یہاں تنگی ہے۔ روز کی کھچ کھچ ہے۔ لرل اس کے فرار کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اپنے تجزیے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے میں نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور کیبن میں لوٹ آیا۔

☆......☆

گاڑی رینگنے لگی تھی۔ خاتون نے ایک بار کھڑکی کے شیشے سے باہر کی طرف دیکھا اور کہنی کے بل نیم دراز ہوگئی۔ پھر ٹخنے کے قریب ساڑی کی سلوٹوں کو درست کیا تو پاؤں کے ناخن جھلک گئے، ناخن پر عنابی رنگ کی نیل پالش تھی اور بیچ کی انگلی میں بچھیا چمک رہی تھی۔ خاتون کے پاؤں مجھ کو خوشنما معلوم ہوئے۔ مجھ کو پھر بیوی کی یاد آگئی وہ بھی بچھیا پہنتی تھی۔ میں نے سوچا ایلیٹ کلاس کی عورتیں جامہ زیب ہوتی ہیں۔ کچھ بھی پہن لیں بھاتا ہے۔ ساڑی کتنی خوب صورت ہے اور فال کو کس سلیقے سے درست کیا تھا مجھ کو یاد آیا کہ میری بیوی کے پاس ایک مصنوعی سلک کی ساڑی تھی جسے وہ سینت سینت کر رکھتی تھی اور محلے ٹولے میں کہیں جاتی تو وہی ساڑی پہنتی تھی۔

مجھ کو حیرت ہوئی کہ میں اس طرح اپنی بیوی کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں؟ کہاں سے لائے گی کپڑے۔ کپڑے تو گہنا ہے اور گہنا تو سپنا؟

☆......☆

گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تھی۔ پلیٹ فارم کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ خاموش پتلے کی طرح چل پھر رہے تھے میرے جی میں آیا اپنے پاؤں پھیلاؤں لیکن میں نے محسوس کیا ایک جھجک مانع ہے اور مجھ کو حیرت ہوئی کہ میں ابھی تک ریلیکس کیوں نہیں ہو سکا ہوں؟ سروس بوائے کھانے کا پیکٹ دے گیا۔ پیکٹ کھولتے ہی مجھ کو خیال آیا کہ آہستہ آہستہ کھانا چاہیے۔ مجھ کو کوفت ہوئی کہ نوالہ چباتے ہوئے میرے منہ سے چڑ چڑ کی آواز کیوں نکلتی ہے؟

پھر میں زیر لب مسکرایا، شاید مفلوک الحال آدمی کھانا اسی طرح کھاتا ہے۔ کھانے کے بعد مجھ کو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں جھنجھلایا کہ کیبن سے باہر جانا ہوگا میں اتر کر پلیٹ فارم پر آیا۔ پلیٹ فارم طرح طرح کے شور سے گونج رہا تھا۔ خوانچے والے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے سوچا کہ پلیٹ فارم کا شور ریل کے سفر کا حصہ ہے جس سے اے سی کیبن محروم ہے۔ اے سی میں آزادی جیسے سلب ہو جاتی ہے۔ سگریٹ نہیں پی سکتے۔ کھڑکی کا لطف نہیں لے سکتے لیکن بھیڑ سے تو راحت ہے۔ ہاں بھیڑ سے اور یہ میڈم کہاں تک جا رہی ہیں؟ ان کے زیور اصلی ہیں؟ گاڑی نے سیٹی دی تو میں نے آخری دو تین کش لگائے اور اچک کر ڈبے میں گھس گیا۔

سروس بوائے بیڈ رول دے گیا۔ خاتون نے بیڈ لگایا اور تکیے کے سہارے نیم دراز ہوگئیں۔ گاڑی رینگنے لگی تھی۔ میری جھجک کچھ کم ہوگئی تھی۔ میں نے بھی اپنا بستر لگایا اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھ کو جھپکی آنے لگی تو میں نے پاؤں پر کمبل ڈالا اور دراز ہو گیا لیکن لیٹتے ہی جھپکی جیسے غائب ہوگئی۔ خاتون بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر تھرماس سے پانی ڈال کر پیا اور گلاس کو ڈیش بورڈ کے دوسرے کنارے پر رکھ دیا جہاں میری منرل واٹر کی بوتل رکھی ہوئی تھی مجھ کو عجیب لگا۔ خاتون نے اپنا گلاس وہاں کیوں رکھا؟ میرے سامان کے قریب۔ خاتون کا بلوریں گلاس منرل واٹر

کی بوتل کو قریب قریب چھوڑ رکھا تھا اور وہ چہرہ ہتھیلی پر لگائے ادھ لیٹی فرش کو تک رہی تھی۔

☆......☆

گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اچانک پٹڑی بدلنے کی آواز کیبن میں ابھری۔ شاید گاڑی جنگل سے گزر رہی تھی۔ خاتون نے روشنی گل کر دی۔ کیبن میں ملگجا اندھیرا پھیل گیا اور مجھ کو دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ میں پھر کیبن سے باہر آیا۔ راہداری میں سناٹا تھا۔ سبھی کیبن کے پردے کھینچے ہوئے تھے اور روشنی بجھی ہوئی تھی۔ صرف نیلے رنگ کا بلب روشن تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ مجھ کو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی میں نے سگریٹ سلگائی جلدی جلدی دو چار کش لیے اور کیبن میں واپس آیا۔

خاتون نے اپنی برتھ سے لگا پردہ برابر نہیں کیا تھا۔ وہ چاروں شانے چت لیٹی تھیں اور پاؤں پر کمبل ڈال رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ گاڑی کی رفتار اچانک دھیمی ہو گئی کسی اسٹیشن کا آؤٹر تھا۔ گاڑی سیٹی دیتی ہوئی رک گئی۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا۔ پلیٹ فارم سے دور اِکا دکا مکان نظر آرہے تھے جن کی روشنی بہت مدھم تھی۔ پاس ہی برگد کی شاخوں کے درمیان چاند بلور کی چوڑی کی طرح اٹکا تھا۔ پتے ہوا میں زور زور سے جھوم رہے تھے۔ ان میں یقیناً سرسراہٹ تھی جو کیبن میں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دفعتاً مجھ کو محسوس ہوا کہ میں کسی آسیب کی طرح کیبن میں بیٹھا ہوں اور خاتون میرے وجود سے قطعی غافل۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ واقعی خاتون نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ مجھ کو لگا خود میں نے اپنے وجود کو گم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے سوٹ کیس برتھ کے نیچے کیوں چھپا دیا اور اگر خاتون کیبن میں نہیں ہوتیں تو کیا یہ بات میرے ذہن میں آتی کہ بیوی نے صابن کا برانڈ بدلا ہے اور مصنوعی سلک...... ایک طرح سے میں نے بیوی کے وجود کی بھی نفی کی۔ مجھ کو لگا کہ میں ایک موہوم سی آگ میں جل رہا ہوں۔ میں نے خاتون کی طرف دیکھا۔ میرے جی میں آیا کہ ان کو اپنے ہونے کا احساس دلاؤں لیکن میری نظر بلوریں گلاس پر پڑی اور میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ کیا معانی رکھتا ہے آخر بھری بوتل کے پاس رکھا ہوا خالی گلاس؟

اچانک خاتون نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ تنہا کیبن کے ملگجے اندھیرے میں پہلی بار خاتون کی نگاہ غلط پڑی تھی۔ میں راحت سی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ خاتون اٹھ کر ڈیش بورڈ کے قریب آئیں تو مجھ کو اور بھی حیرت ہوئی۔ وہ میرے بہت قریب کھڑی تھیں۔ یہاں تک کہ میں ان کے بدن کا لمس صاف محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے تھوڑا کھسک گیا۔ خاتون بھی بیٹھ گئیں۔ پھر بوتل سے پانی ڈال کر پیا اور پھر ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ گاڑی اچانک ہچکولے کے ساتھ چل پڑی۔ بلوریں گلاس بوتل سے چھو گیا خاتون مجھ پر جھکیں اور......

☆......☆

صبح میری آنکھ کھلی تو گاڑی راولپنڈی پہنچ گئی تھی۔ میں نے مخمور سی انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں رات کا خمار باقی تھا۔ چہرے پر تازگی تھی۔ خاتون کیبن میں موجود نہیں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ان کا سامان بھی نہیں تھا۔ ڈیش بورڈ پر منرل واٹر کی خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ میں نے برتھ کے نیچے جھانک کر دیکھا چائے کے خالی کپ لڑھکے پڑے تھے۔

پلیٹ فارم پر اترتے ہی گرم ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا اور مجھ کو اچانک سب خواب سا معلوم ہونے لگا۔ رات کی باتوں کو میں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ مجھ کو اپنا سفر بھی اب خواب معلوم ہوا۔ مجھ کو لگا جیسے میں دھند میں چلتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ پھر بھی میں ایک سرور سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے چہرے پر پراسرار سی تمازت تھی۔ میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور سامنے پھیلی بھیڑ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اپنی منزل کی جانب چل دیا۔ یہ سفر میری زندگی کی یادمیں ہمیشہ اپنی یادیں تازہ رکھے گا۔

☆☆☆

پانچویں ٹرین حکایت

# صبح کا ستارہ

ثمینہ فیاض

اُس دوشیزہ کی کتھا، جو محبت پر عزت قربان کرنے سے بال بال بچ گئی تھی

ٹرین کی آمد کے ساتھ ہی آنے اور جانے والے تمام مسافروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اسٹیشن پر اچانک ہی ہلچل سی مچ گئی تھی۔ رات کے اس پہر میں بھی اسٹیشن جاگ اٹھا تھا۔ قلی ہر مسافر سے سامان اٹھانے کا پوچھتے اور کبھی کوئی جھڑک دیتا تو کوئی بہت کم پیسوں میں بہت احسان کے ساتھ راضی ہو جاتا۔ مہنگائی کے اس زمانے میں قلی مجبور تھے۔ اپنی انا اور خودداری کو مار کر بیگم صاحبات اور صاحبان کے سامان کو اپنے سر اور کندھوں پر لادے ان کے اگلے سفر کی گاڑی تک پہنچا کر جو جتنے دے دیتا خاموشی سے رکھ لیتے۔ اس چھوٹے سے شہر کے اسٹیشن پر جلتی پیلے پیلے بلبوں کی روشنی میں آنکھیں پھاڑے وہ بہت بے بسی سے اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہاں اسی کا جس کے لیے وہ اپنے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگا کر اپنے محفوظ گھر کی دہلیز کو پار کر آئی تھی۔ کبھی دائیں جانب دیکھتی تو کبھی بائیں جانب۔ یہ تیسری ٹرین تھی۔ جو آئی تھی مگر اس میں بھی وہ نہیں تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئے گا۔ ہر صورت آئے گا۔ وہ اس کے ساتھ اک نئی دنیا بسائے گا۔ وہ ان رسموں کو ان زنجیروں کو توڑ دیں گے۔ روایات کی ہر بیڑی کو اپنی محبت سے کاٹ ڈالیں گے۔ اپنی پسند سے شادی کرنے کا اپنی مرضی سے جینے کا انہیں پورا پورا حق تھا۔ مانا کہ بہت پیار سے ان کے والدین نے انہیں پالا پوسا ہے مگر اب راشد کی محبت خالدہ کے دل و دماغ پر ایسی چھائی تھی کہ اسے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ اس سے کچھ دور بیٹھی اک عمر رسیدہ خاتون بڑی گہری نظروں سے خالدہ کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ خالدہ نے کئی بار محسوس کیا مگر اپنا وہم سمجھ کر جھڑک دیا مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ باقاعدہ اسے ہی گھور رہی ہیں۔ خالدہ کو الجھن ہونے لگی۔ یہ عورت مجھے کیوں دیکھے جا رہی ہے۔ خاکی چادر میں لپٹی وہ عمر رسیدہ خاتون پوری طرح سے خالدہ کی جانب متوجہ تھیں۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کچھ دیر جب وہ یوں ہی دیکھتی رہیں تو خالدہ بھی بیزار ہو گئی اور ان کی جانب سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ یہ ٹرین بھی شہر کی جانب روانہ ہو رہی تھی مگر راشد کا کچھ پتا نہ تھا۔ وہ بار بار اپنے موبائیل فون کو دیکھتی گھبرا کر فون کرتی مگر راشد کا سیل فون ہی بند تھا۔ اس کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ وہ

تو اپنی ساری کشتیاں جلا آئی تھی۔ اس کے پاس اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ ٹرین جا چکی تھی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ وہ گھر سے شام پانچ بجے اپنی سہیلی کے گھر جانے کا کہہ کر نکلی تھی۔ اماں نے اس کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر پوچھا بھی تھا کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

تو ہنس کر اس نے کہا تھا اماں ہمارے پاس کون سی دولت یا زیور ہے جو کہیں لے کر جا رہی ہوں گی۔ اپنے پرانے کپڑے اور کچھ کتابیں ہیں جو آمنہ کی چھوٹی بہن کو دینے جا رہی ہوں۔ پھر تو مجھے اس گھر سے چلے ہی جانا ہے پھر بعد میں دینا اچھا نہیں لگے گا۔ ماں نے اس کی نیک نیتی پر کتنے فخر سے کہا تھا۔

''بہت اچھا سوچا تم نے بیٹا کسی کی مدد ایسے ہی کرنی چاہیے کہ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔'' وہ اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔ اماں کو تو ذرا بھر بھی شک نہ گزرا وہ اب آرام سے راشد کے ساتھ دوسرے شہر چلی جائے گی اور اماں ابا اسے ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے۔ اس طرح اس کے اس کزن سے جو اماں کے بقول بہت کماؤ پوت ہے۔ بھلا بتاؤ اک درزی کی کمائی ہی کتنی ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسے چھوٹے شہر میں جہاں زیادہ تر عورتیں گھر میں ہی کپڑے سی لیتی ہوں۔ اس سے بھی جان چھوٹے گی۔ اس کی تو آواز بھی اتنی موٹی ہے۔ پورا مرد ہے لڑکا تو کسی اینگل سے لگتا ہی نہیں۔ کم از کم میری جان چچا کے اس کماؤ پوت سے تو چھوٹ ہی جائے گی۔

لیکن...... لیکن یہ راشد کہاں رہ گیا۔ اب تک آیا کیوں نہیں۔ اک بار پھر اسٹیشن پر سناٹا چھانے لگا تھا اور رات کا اندھیرا جیسے جیسے بڑھ رہا تھا۔ اس کا دل اسی تیزی سے ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اپنے روشن مستقبل کے سہانے خواب اسے وہاں سے ہلنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ خود سے عذر تراشنے لگی۔ اسے کوئی



مجبوری ہوگئی ہوگی۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہو گا ورنہ وہ اب تک ضرور آ گیا ہوتا۔ یقیناً کہیں پھنس گیا ہوگا۔ شاید کچھ پیسوں کا انتظام کر رہا ہوگا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ ہر حال میں آئے گا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ جب وہی خاتون دھیمے سے اٹھیں اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی اس کی جانب آن پہنچیں۔

''کہاں جانا ہے تمھیں بٹی!'' بہت میٹھی مگر تھکی ہوئی آواز کے ساتھ انہوں نے پوچھا۔

''جی! وہ جی مجھے لاہور جانا ہے۔'' اس نے گھبرا کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

عمر رسیدہ خاتون اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپ گئی تھیں۔ بہت اطمینان سے مسکراتے ہوئے وہ اس کے برابر میں آن بیٹھی تھیں۔

''اچھا اس کا مطلب ہے ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ تم دونوں کس جگہ جا رہے ہو۔''

''کو.....کون؟ دونوں؟'' وہ سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔ جیسے اس کا چور پکڑا گیا ہو۔ پھر جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔ ''میں تو اکیلی ہی جا رہی ہوں۔ وہاں میرے ماموں رہتے ہیں ان کے گھر جا رہی ہوں۔''

وہ عمر رسیدہ خاتون اک بار پھر مسکرائیں۔

''ماں باپ کی محفوظ چار دیواری سے بھی اچھی جگہ کوئی ہو سکتی ہے بھلا۔''

خالدہ تیز تیز نظروں سے اک بار پھر اسٹیشن کا جائزہ لینے لگی۔ جیسے یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اب اگر وہ یہاں بیٹھی رہی تو کہیں اس کے دل کا راز انہیں معلوم نہ ہو جائے۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ اس سناٹے میں اس کی دھک دھک وہ خاتون آرام سے سن سکتی تھیں۔

''تم نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ میں اسٹیشن پر کیا کر رہی ہوں؟ کسی کو لینے آئی ہوں یا چھوڑنے؟'' بات بدل کر انہوں نے اس پر احسان ہی کیا تھا۔ خالدہ کے دل کی دھڑکن کچھ قابو میں آئی۔

خالدہ نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا آپ کہاں جائیں گی؟''

''معلوم نہیں بیٹا ساری زندگی پارسائی کے ساتھ گزاری۔ بس اک چوک ہوگئی۔ بیٹی کی اچھی تربیت نہ کر سکی۔ اس کو ہر طرح کا آرام دیا آزادی دی اس نے کہا موبائل دلا دیں اس میں انٹرنیٹ لگا دیں ہم نے سب کر کے دیا تاکہ وہ خوش رہے مگر ہمیں کیا معلوم تھا یہ موبائل ہی ہماری تباہی بن جائے گا۔ اب معلوم نہیں اس کے اعمال کی وجہ سے مجھے کہاں جانا پڑے؟''

وہ رو دینے کے قریب تھیں۔ خالدہ کو ان پر رحم آنے لگا۔ اس کے دل میں اچانک ان سے ہمدردی جاگ اٹھی۔ وقت گزارنے کا اک بہانہ بھی تھا اور ان سے باتوں میں زیادہ ڈر بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پھر اسے تجسس ہوا کہ پوچھوں تو ایسا کیا کر دیا ان کی بیٹی نے؟

''آنٹی کیا ہوا؟ آپ کی بیٹی کو۔'' وہ بہت جھجکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''اس کا نصیب خراب تھا۔ گھر کی محفوظ چار دیواری کو پار کر کے کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ بعد میں ہم نے بہت ڈھونڈا ہم سمجھے اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا یا وہ اغوا ہو گئی ہے لیکن کافی عرصے بعد معلوم ہوا وہ لاہور کے اک ایسے بدنام علاقے کی مشہور رقاصہ بن گئی ہے جہاں سے عزت دار لوگوں میں واپس آنا ناممکن ہو جاتا ہے اک لڑکی کے لیے اور وہ ساری زندگی اسی بھٹی میں جلتی رہتی ہے۔''

خالدہ سر جھکائے بہت دھیان سے ان کی بات سن رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہیں اس کے ساتھ بھی ایسا ہو گیا تو؟

''نہیں راشد ایسا نہیں ہے۔'' اگلے ہی پل اس نے اپنے ہی سوال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اجنبی خاتون اک بار پھر کہنا شروع ہوئیں۔

''جس لڑکے کے ساتھ ہماری عزت پر داغ لگا

کر بھاگی تھی۔ اس نامراد نے ہی اسے اس کوٹھے پر بیچ دیا۔ ان کے والد تو اس صدمے سے ہی چل بسے میں اس امید پہ زندہ ہوں۔ کہ شاید کسی کی بیٹی کی زندگی بچا لوں کسی لڑکی کو اس راہ پر چلنے سے روک سکوں جو اک دلدل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم اس کی جہاں شادی کر رہے تھے۔ وہ غریب ضرور تھا مگر اسے بھوکا نہیں رہنے دیتا۔ اس کی طرف کسی کی میلی نظر نہ اٹھنے دیتا ہم نے تو اس کا بھلا ہی چاہا تھا ہم ماں باپ ہیں اس کے اور کوئی ماں باپ اپنے بچوں کا برا نہیں چاہ سکتے۔ وہ لڑکا اسے اک وقت کی روٹی بھلے کم دیتا مگر عزت کے ساتھ رکھتا۔ اب سوچتی ہوں اگر میں کسی کی بیٹی کو بچا سکوں تو شاید کوئی میری بیٹی کو واپس لا دے۔

اس کے بھائی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے مرگئی مگر میں کیا کروں اس دل کا۔ میری ممتا مرتی ہی نہیں۔ بس میں ہی اندر سے کہیں مرگئی ہوں۔''

خالدہ انہیں بدحواسوں کی طرح دیکھے ہی جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ اس سے اتنا بڑا گناہ سرزرد ہونے والا تھا۔ ماں باپ کی ساری زندگی کی عزت خاک میں ملا کر کیا وہ زندگی میں کبھی خوش رہ پائے گی۔ ابھی وہ پلٹنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ راشد دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

''چلو یار دیر ہوگئی! میں ہمارے لیے گھر کا بندوبست کر رہا تھا۔ میرے دوست نکاح خواں کو بھی لیے بیٹھے ہیں۔'' اس کا ارادہ پل بھر کو ڈول گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پختہ ارادے اور پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

''آنٹی مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں گی۔ آپ کی دعا قبول ہوگئی۔ اک بیٹی کو اس کے گھر باحفاظت پہنچا دیں گی۔'' راشد اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

خالدہ اجنبی خاتون کے ساتھ گھر پہنچی تو سب پریشان تھے۔ اماں تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔ ابا جی دل پکڑے بیٹھے تھے۔ بھائی مختلف اسپتالوں میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ خالدہ کو دیکھتے ہی ابا اور

## بیٹیاں پھول ہیں

پھول جب شاخ سے کٹتا ہے، بکھر جاتا ہے
پتیاں سوکھتی ہیں ٹوٹ کے اڑ جاتی ہیں
بیٹیاں پھول ہیں
ماں باپ کی شاخوں پہ جنم لیتی ہیں
ماں کی آنکھوں کی چمک بنتی ہیں
باپ کے دل کا سکوں ہوتی ہیں
گھر کو جنت سا بنا دیتی ہیں
جب بچھڑنے کی گھڑی آتی ہے
ایک گھر میں تو اترتی ہے اداسی لیکن
دوسرے گھر کے سنورنے کا یقیں ہوتا ہے
بیٹیاں پھول ہیں
اک شاخ سے کٹتی ہیں مگر
سوکھتی ہیں نا کبھی ٹوٹتی ہیں
اک نئی شاخ پہ کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں

شاعر: محمود شام

اماں اک ساتھ ہی اس کی جانب لپکے کہاں چلی گئی تھیں تم؟ ہم نے آمنہ کے گھر بھی دکھوایا تم وہاں بھی نہیں تھیں۔'' بھائیوں کو فون کر دیا گیا وہ بھی لوٹ رہے تھے۔

''بہن تسلی رکھیں۔ اصل میں میں راستے سے گزر رہی تھی تو دیکھا یہ لڑکی بے ہوش پڑی ہے۔ جوان جہان لڑکی ہے۔ اچھے گھر کی لڑکی لگ رہی تھی اسے یوں سڑک پر چھوڑ دینا مجھے مناسب نہ لگا مجھے سمجھ نہ آیا کیا کروں اس لیے اپنے گھر لے گئی۔ ابھی یہ ہوش میں آئی تو اپنے گھر کا پتا بتایا تو میں اسے لے آئی۔ گرمی کا موسم ہے۔ نازک سی تو بچی ہے سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔'' خالدہ انہیں ممنون نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

چھٹی ٹرین حکایت

# نیلا دھوبی

شاہد رفیق سہو

اُس دھوبی کی حکایت، جس نے عزت پر لگی کالک کو بیوی کے لہو سے صاف کیا

نیاز پاشا نام تھا اس کا، لیکن محلے والے اسے نیلا دھوبی پکارتے تھے۔ وہ ایک شریف الطبع شخص تھا۔ محلے بھر کے میلے کپڑے دھونے کی ذمہ داری اسی کی تھی اس کے علاوہ وہ شہر کے خواص کے لباس بھی اسی کے پاس اجلے ہونے کو لائے جاتے تھے۔ اس کی وجہ اس کے کام کی ستھرائی اور کھرا پن تھا۔ نیلا دھوبی قسمت کا دھنی نکلا۔ جلد ہی اس کے کام کی شہرت علاقے میں پھیل گئی اور دور نزدیک سے میلے کپڑوں کے بڑے بڑے گٹھڑ دھوبی گھاٹ پر لائے جانے لگے۔ اس نے مدد کے لیے ایک اور دھوبی ملازم رکھ لیا۔ دونوں دھوبی گھاٹ پر صبح سویرے پہنچ جاتے۔ عصر کے بعد تک کپڑوں کی دھلائی اور اٹھا پٹخ جاری رہتی۔ جب کام بڑھ گیا مالی حالت بھی اچھی ہوگئی تب نیلے دھوبی نے صدر بازار میں ایک چھوٹی سی دکان خرید لی اور لانڈری کا کام شروع کر دیا۔ اب نیلا خود دکان پر بیٹھ گیا جہاں وہ شہر بھر کے میلے کپڑے وصول کرتا اور دھوبی گھاٹ پر اس کے کارندے کام کرتے تھے۔

نیلے کی عمر اٹھائیس برس ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی منگیتر جو خالہ کی بیٹی تھی نیلا اسے چاہتا تھا ابھی تک وہ داغ مفارقت دے گئی، تب اس کا دل ایسا ٹوٹا کہ پھر شادی کی خواہش ہی نہ رہی۔ دن جب اچھے ہو گئے تو گھر والوں نے شادی پر اصرار شروع کر دیا۔ بالآخر اسے ہار ماننی پڑی اور اٹھارہ برس کی حسینہ سے اس کی شادی ہوگئی۔

وہ صرف نام کی ہی حسینہ نہ تھی بلکہ واقعی حسین تھی۔ نیلا اسے چاہنے لگا۔ وہ اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتا۔ حسینہ کے آجانے سے جیسے اس کی زندگی میں بہار آگئی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ شریک حیات کے بغیر زندگی کچھ نہیں ہوتی۔ افسوس کرتا تھا کہ ناحق جیون کے اتنے دن روکھے پھیکے گزار دیے۔ پہلے شادی کر لیتا تو آج بچوں کی چہکار سے گھر گونج رہا ہوتا۔

نیلے کو شادی کے دو سال تک اولاد کی خوشی دیکھنی نصیب نہ ہوسکی لیکن پھر اللہ نے اس کی سن لی یکے بعد دیگرے دو بیٹے ہوگئے جن سے اس کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ نیلے کی بیوی یوں تو بہت اچھی تھی بظاہر وہ اس سے پیار بھی جتلاتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا رویہ اپنے خاوند سے ترش ہو جاتا تھا۔ وہ پہروں گم صم رہتی جیسے ماضی کے دشت پھلانگنے پر مامور ہو۔ حسینہ کا ماضی کیا تھا نیلا نہیں جانتا تھا۔ وہ تو بس اس کی من موہنی صورت پر مرمٹا تھا۔ دن رات کمانے میں لگا رہتا تا کہ بیوی کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھ سکے۔ ایک طرف قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی جب کہ دوسری جانب وہ ہمت سے کام لے رہا تھا جہاں خوشحالی برسنے لگے تو کچھ حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی نیلے کے ساتھ ہوا۔



☆ … ☆

صدر بازار میں ایک لانڈری اور بھی تھی جس کا مالک نیلے کی مقبولیت سے متاثر ہو رہا تھا۔ اب لوگ اس کی دکان کی طرف رخ کرنے کی بجائے نیلے دھوبی کی جانب جانا زیادہ پسند کرتے تھے جس کا نام اچھا اور کھرا کام ہو لوگ اسی کو پسند کرتے ہیں۔ پرانے گاہک بھی جب ٹوٹنے لگے تو مقبول دھوبی خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں دکان بڑھانی پڑ جائے، بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ملازم رکھوایا نیلے کے پاس کیونکہ نیلے کو ملازم کی ضرورت تھی اسے خاص مقصد کے تحت رکھوایا گیا تھا۔

کچھ دنوں بعد ہی بازار میں ہائے ہائے مچ گئی۔ اردگرد کے دکاندار افسوس کر رہے تھے کیونکہ نیلے دھوبی کی دکان کو آگ لگ گئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا یہ کیسے ہوا لیکن آگ نے نیلے کے کاروبار کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ فائر بریگیڈ نے بروقت پہنچ کر آگ پر قابو پا لیا لیکن نیلا دھوبی بے چارہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اب اس کا دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا اس نے دکان اونے پونے میں بیچ دی اور لانڈری کو بند کر دیا۔ ان دنوں اس پر سخت مایوسی طاری تھی۔ وہ گھر سے نہیں نکلتا تھا اس کے ذہن پر قنوطیت نے حملہ کر دیا تھا۔

نیلا ہمارے محلے میں رہتا تھا۔ جب ابا جان کو اس کی حالت کا علم ہوا تو ان کو بہت افسوس ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی کی نوکری ایک اعلیٰ سرکاری ادارے میں تھی۔ وہاں وہ آفیسر تھے۔ انہوں نے والد صاحب سے تذکرہ کیا کہ ہمارے محکمے کو کچھ دھوبی درکار ہیں جو وردیاں دھو کر استری کر دیا کریں۔ رہائش کے ساتھ دیگر سہولتیں بھی ان کو حاصل ہوں گی اور معقول معاوضہ ملے گا۔ والد صاحب نے فوراً نیلے کو بلوا بھیجا۔ وہ آیا تو بھائی نے اس کو آگاہ کیا۔ نیلا فوراً راضی ہو گیا۔ بھائی نے متعلقہ افسر سے بات کی اور یوں نیلا اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس علاقے سے وہاں چلا گیا جہاں میرے بھائی کی پوسٹنگ تھی۔ انہوں نے اس کو بطور دھوبی محکمے میں نوکری دلوا دی۔ یہ ایک صحت افزا مقام تھا اور پہاڑی علاقہ تھا۔ جہاں جھرنے بہتے تھے اور تند و تیز ندی نالوں سے سیلابی ریلے کی صورت پانی گزرتا تھا اور نزدیک ہی ایک اسٹیشن بھی تھا۔ جہاں اکثر ٹرین رکتی تھی اور گاؤں کی فضا میں ہلچل سی مچا دیتی تھی۔ نیلے کو بھی ایک بہتے ہوئے شفاف پانی کے نالے کے قریب رہائش کے لیے گھر مل گیا جہاں ریل کی پٹڑی بھی قریب تھی۔ وہ صبح کام پر چلا جاتا اور کوارٹر میں سارا دن اس کی بیوی بچے موجود رہتے۔ اس کے گھر سے تھوڑے

فاصلے پر ایک اور کوارٹر تھا اسی طرح باقی مکانات بھی فاصلے پر اکا دکا موجود تھے۔ حسینہ یہاں آ کر اداس رہنے لگی۔ اس کا دل اس دور افتادہ جگہ نہیں لگ رہا تھا۔ بات چیت کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کبھی کبھی دور کے کوارٹر سے کوئی خاتون نالے پر کپڑے دھونے آتی تو یہ اس سے دو چار باتیں کر کے اپنی بوریت دور کر لیتی تھی۔ حسینہ کے دونوں لڑکے سیپارہ پڑھنے مسجد جاتے تھے۔ اس کا بڑا لڑکا پانچ برس اور دوسرا چار سال کا تھا۔ البتہ روز صبح مسجد میں کلام پاک پڑھنے جانے لگے۔ ابھی اسکول نہیں جاتے تھے۔

ایک روز دونوں بچے سیپارہ پڑھنے گئے تو حسینہ کو کپڑے دھونے کا خیال آ گیا۔ یہاں خواتین اپنے کپڑے بہتے نالے کے کنارے دھو لیتی تھیں کیونکہ پہاڑی علاقوں میں ندی نالوں سے پانی بھر کر گھروں تک لے جانا ایک دشوار امر تھا۔ اس روز نیلے کے بیٹے حسیب اور مجیب جب سیپارہ پڑھ کر لوٹے تو ماں کو گھر نہ پایا وہ فوراً نالے کی طرف گئے وہاں ماں تو موجود نہ تھی لیکن ان کے کپڑے بھیگے ہوئے موجود تھے۔ جیسے انہیں دھوتے ہوئے وہ اٹھ کر کہیں چلی گئی ہو۔ وہ ماں کو پکارنے لگے۔ بچوں کی آواز سن کر ایک خاتون ادھر آ گئی اور پوچھنے لگی۔ ''بچو کیا بات ہے کیسے پکار رہے ہو۔''

''اپنی ماں کو وہ ابھی یہاں کپڑے دھونے آئی تھیں۔'' حسیب نے کہا۔ ''نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ گھر میں بھی دیکھ لیا ہے ہم کو بھوک لگی ہے مگر ماں گھر میں نہیں ہے۔''

تو پھر عورت متفکر ہوگئی۔ ''کہیں نالے میں نہ گر گئی ہو، پتھر پر بیٹھ کر کپڑے دھونے سے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔''

اس نادان عورت کے منہ سے ایسی بات سن کر نا سمجھ بچے رونے لگے۔ اسی وقت بھائی کے محکمے کے ایک اہلکار کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے جو بچوں کو روتے پایا تو پوچھا۔ ''کیا ہوا، کیوں رو رہے ہو۔''

وہ کہنے لگے۔ ''ہماری ماں نالے میں گر گئی ہے۔''

یہ ایسا اندوہناک فقرہ تھا کہ اہلکار لرز گیا کیونکہ یہ پہاڑی نالہ بہت زیادہ شوریدہ سر تھا جو اس میں گر جاتا تند و تیز پانی اسے منٹوں سیکنڈوں میں دور بہا لے جاتا اور وہ آناً فاناً موت کے منہ میں چلا جاتا۔ اہلکار نے سمجھا کہ بچوں نے اپنی ماں کو نالے میں گرتے دیکھا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا گیا اور جا کر اعلیٰ افسر کو خبر کی۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح چار سو پھیل گئی۔

نیلے دھوبی کو متعلقہ افسر نے بلا کر تسلی دی کہ ''فکر نہ کرو ہم تمہاری بیوی کو تلاش کرنے کی پوری جدوجہد کریں گے۔''

بے چارہ نیلا بہت پریشان تھا۔ وہ بچوں کو لیے اپنے کوارٹر میں اداس بیٹھا تھا کہ کہیں سے اس کی بیوی کی زندگی یا موت کی اطلاع ملے۔ یونہی وسوسوں میں رات گزر گئی۔ حسینہ کا کچھ پتا نہ چلا۔ دوسرے دن بھی اس کی تلاش میں بیت گیا۔ تلاش کرنے والے اہلکاروں نے چاروں طرف دور دور تک آوازیں بھی لگائیں ارد گرد کا چپہ چپہ چھان مارا۔ کوئی سراغ نہ ملا اور دوسری رات سر پر آ گئی۔ نیلے کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کون؟'' کوئی جواب نہ ملا۔ اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے حسینہ کھڑی تھی۔

''شکر ہے تم زندہ ہو، کہاں چلی گئی تھیں؟'' نیلے نے بے قراری سے کہا۔

''جانتی ہو بچے تمہارے لیے کتنے اداس تھے۔ ایک عورت نے جب ان کو بتایا کہ تم نالے کی نذر ہوگئی ہو تو انہوں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔'' وہ کچھ نہ بولی۔ گونگی سی چارپائی پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ بتاؤ تو سہی آخر تم تھیں کہاں؟'' بڑی مشکل سے زبان کھولی۔

''ایک بندر درخت سے اتر کر ادھر آ گیا تھا وہ تمہارے کپڑے لے کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگا تو میں اس کے پیچھے دوڑنے لگی کہ وہ کپڑے پھینک دے گا اور میں اٹھا لوں گی لیکن وہ آگے ہی بھاگتا گیا تبھی گھاٹی کے کنارے میرا پاؤں پھسل گیا۔ میں لڑھکتی ہوئی بہت نشیب میں جا گری اور بے ہوش ہوگئی۔ رات بھر بے ہوشی کے عالم میں پڑی رہی۔ صبح وہاں سے چلنا شروع کیا تو گرتی پڑتی چڑھائی چڑھتی اب پہنچی ہوں۔ بھوک پیاس اور خوف سے نڈھال ہوگئی ہوں۔''

نیلے نے غور سے بیوی کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں بھوک پیاس سے کمزوری و ناتوانی کا کوئی احساس نہ تھا۔ البتہ وہ کچھ خوفزدہ ضرور لگ رہی تھی۔ نیلے کو شک گزرا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے کہا۔

''ذرا چل کر مجھے وہ گھاٹی تو دکھاؤ جہاں سے تم پھسل کر نیچے گرتی چلی گئی تھیں۔''

حسینہ گھبرا گئی کہنے لگی۔ ''کیا ابھی؟''

''ہاں کیوں نہیں، بچے تو سو گئے ہیں۔''

ناچار وہ ساتھ ہو لی۔ آدھ گھنٹے چلنے کے بعد اس نے اشارہ کیا کہ یہاں سے گری تھی۔ نیلے نے کہا۔

''لیکن یہ گھاٹی تو اہلکاروں نے پوری طرح تمہاری تلاش میں چھان ماری اور رات سے دوسرے دن تک وہ مسلسل آوازیں بھی لگاتے رہے۔ انہوں نے تمہاری تلاش میں جدید آلات سے بھی کام لیا اگر تم اِدھر گری ہوتیں تو بھی ان کی اعلیٰ ترین دور بینوں سے نظر آجاتیں مجھے لگتا ہے تم جھوٹ بول رہی ہو'' وہ بولی۔

''سچ کہتی ہوں! اللہ قسم میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔''

''دیکھو حسینہ میں صحیح کہہ رہا ہوں کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اگر تمہارے ساتھ کوئی دھوکا یا زیادتی ہوئی ہے۔ مجھے بتا دو ہم چپ چاپ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اگر تم سچ نہ بولو گی تو ممکن ہے میں شک و شبے کی وجہ سے کوئی غلط قدم نہ اٹھا لوں۔''

حسینہ ڈر گئی مگر شوہر کے سامنے لب نہ کھول سکی۔ اس طرح وہ رات ان دونوں کے درمیان اجنبیوں کی طرح گزر گئی اگلے روز صبح کو جب نیلا ڈیوٹی پر آیا تو وہاں موجود ایک لڑکے نے اسے بتایا کہ ہمارے اور تمہارے کوارٹر کے بیچ جو گھر پڑتا ہے وہاں ایک آدمی منان نامی کچھ دن پہلے آیا تھا۔ یہ کوارٹر اس کے دوست کے پاس ہے منان وہاں ٹھہرا ہوا ہے پرسوں سے۔ اس سے ملنے ایک عورت آئی تھی مجھے لگا جیسے وہ باجی حسینہ ہو کیا۔ منان کو تم جانتے ہو؟''

''نہیں۔'' نیلے نے مختصر جواب دیا لیکن وہ سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس نے اس بات کا کھوج لگا لیا کہ حسینہ گھاٹی میں نہیں گری تھی کیونکہ اس کے جسم پر کسی چوٹ کا نشان نہیں تھا۔ اہلکار لڑکے کی بات اس کے دل میں کھب گئی تھی۔ تبھی وہ پڑوسی کے کوارٹر میں گیا۔ پتا چلا کہ منان بھی اسی شہر کا ہے جہاں سے نیلے کا تعلق ہے اس نے لڑکے کو اعتماد میں لے کر کہا کہ ''تم پتا کرو میری بیوی وہاں کب تک رہی تھی۔''

اس لڑکے نے کھوج لگایا۔ ساتھ والے کوارٹر میں اس کا دوست رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ نیلے کی بیوی تقریباً تین چار بار آئی۔ پہلے تو وہ منان سے باتیں کر کے چلی جاتی تھی لیکن اس روز جب وہ آئی تو باہر سے منان کے دوست جلیل نے ان کو کوارٹر میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر اہلکاروں نے جب تلاش شروع کی تو جلیل نے ڈر کے مارے تالا نہ کھولا۔ اسی سبب حسینہ اس کے کوارٹر سے باہر نہ آسکی۔ نیلے نے تمام واقعہ بیوی کے سامنے دہرا کر پوچھا۔ ''اب بتاؤ کیا کہتی ہو جلیل اور منان کے کوارٹر میں کیا کرنے جاتی تھیں اور ان سے تمہارا کیا تعلق ہے۔''

وہ رونے لگی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ اس نے کہا۔

''جان سے مار دیں یا زندہ رکھیں مجھ سے غلطی ضرور ہوئی ہے۔ منان میرے میکے کے محلے میں رہتا ہے اور ہمارا ہمسایہ ہے۔ وہ اتفاق سے جلیل کے پاس آیا تو مجھے نالے پر دیکھ لیا۔ اس روز میں اپنے میکے والوں کی خیر خیریت معلوم کرنے منان کے پاس جلیل کے کوارٹر کی طرف چلی گئی تھی۔ ہم کوارٹر میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ جلیل باہر سے آیا اس کو معلوم نہ تھا ہم دونوں اندر ہیں وہ باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ بس اتنی سی بات ہے اور اتنی میری غلطی ہے اب آپ جو بھی سمجھیں معاف کر دیں یا سزا دیں۔''

نیلے کا دماغ بیوی کے اس اعترافی بیان سے پھٹنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا جو بھی ہوا معاف کر دوں گا لیکن ابھی میرے ساتھ چلو۔''

وہ آگے آگے چلنے لگا اور حسینہ ڈرے سہمے قدموں اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ جب وہ ریل کی پٹڑی کے پاس پہنچے تو کوئی ٹرین وہاں سے گزرنے پر وسل دے رہی تھی۔

نیلا گویا ہوا۔ ''کل تک تم کہتی تھیں کہ گھاٹی سے لڑھک گئی تھی اور آج یہ دوسرا واقعہ ہے یقیناً تم جھوٹی ہو اور میں جان چکا ہوں کہ ماضی میں تمہارا تعلق اپنے ہمسائے منان سے رہا ہے۔ وہ تمہارے پیچھے یہاں تک پہنچا تھا اب اگر یہ واقعہ راز رہتا تو میں شاید بچوں کی خاطر تم کو معاف کر دیتا لیکن جس لڑکے نے مجھے حقیقت بتائی ہے یقیناً وہ کسی اور کو بھی یہ قصہ بتا چکا ہوں گا۔ اب اس معاملے کو کھلنے میں دیر نہ لگے گی۔ لہٰذا قصے کو قصہ پارینہ سمجھ کر ختم کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر نیلے نے تیزی سے قریب آنے والی ریل کے آگے بیوی کو دھکا دے دیا اور خود وہاں سے لوٹ آیا۔

وہ سیدھا میرے بھائی کے پاس پہنچا۔ تمام احوال بتا کر کہا کہ میرے بچے امانت ہیں ان کو میرے والدین کے گھر پہنچا دینا اور مجھے معاف کر دیں کہ میں نے بیوی کا قصہ تمام کر دیا ہے۔ جو سزا ملے گی اسے مقدر سمجھ کر قبول کروں گا۔ نیلے کو متعلقہ حکام کے حوالے کر دیا گیا اور اس کے معصوم بچوں کو بھائی جان کی تحویل میں دے کر ان کے افسران بالا نے کہا کہ ان کو آپ نیلے دھوبی کے والدین کے پاس پہنچا دیں۔''

آج بھی وہاں کے لوگ ریل کی وسل کے ساتھ نیلے دھوبی کو ضرور یاد کرتے ہیں۔

☆☆☆

سنا تورین ٹرین حکایت

# احسانِ عظیم

ثمینہ ناز عبدالقیوم

سفر کرنے والوں کے لیے ایک چشم کشا حکایت، جو یقیناً بہت سوں کو ریڈ الرٹ کردے گی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب امی کے گھر شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ آج صبح ہی امی کا فون آ گیا۔

''بیٹا تم کب آ رہی ہو۔ ہم لوگوں نے کارڈ بھی چھپوا لیے ہیں اور سلائی کا کام بھی تقریباً ختم ہونے والا ہے۔ درزن نے کہا ہے کہ بس دو تین دن میں تمام کپڑے مل جائیں گے۔''

''امی آپ نے درزن کو کپڑے کیوں دیے میں آ کر سلائی کر دیتی۔''

''ارے نہیں بیٹا! تم اپنے بچوں کو سنبھالو گی یا سلائی کرتی پھرو گی۔ اتنے عرصے بعد آؤ گی تو آرام سے رہنا اور انجوائے کرنا۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے امی جیسے آپ کی مرضی۔''

''اچھا بیٹا یہاں سخت سردی ہے ذرا خیال سے آنا۔''

''امی ہفتے کی سیٹیں بک ہوئی ہیں اور انشاء اللہ اتوار کی صبح ہم ساتھ ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ گھر میں جب سب سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔'' امی نے خوشی سے کہا اور پھر فون منقطع ہو گیا۔

☆......☆

آج صبح سے ہی میں پیکنگ کرنے میں مصروف تھی کیونکہ آج روانگی تھی۔ اماں (ساس ماں) بار بار تاکید کر رہی تھیں کہ دیکھو بیٹا سردی بہت ہے۔ رستے میں بچوں کا خاص خیال رکھنا۔ کمبل اور دوائیاں بھی خیال سے رکھ لینا۔ سنا ہے وہاں سردی بھی بہت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جی اماں سب سامان تیار ہے بس نکلنے کی دیر ہے۔''

تھوڑی دیر میں ٹیکسی آ گئی۔ نکلتے وقت اماں نے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا اور بچوں کو چوما اور مجھے ڈھیر سا پیار دے کر رخصت کیا۔ سب ٹیکسی پر سوار ہو کراچی اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔

اشعر نے تمام راستے خوب انجوائے کیا۔ وہ مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ ''ماما یہ کیا ہے؟ ماما یہ کیا ہے؟''

ہمارے گھر سے اسٹیشن تقریباً پچاس منٹ کے فاصلے پر تھا میرے دونوں بیٹے آج بڑے خوش

تھے۔ اشعر جو تین سال اور احمر ایک سال کا تھا۔ ماشاء اللہ دونوں بیٹے بڑے ہی پیارے تھے اور بہت جلد دوسروں سے گھل مل جاتے تھے اور بچے تو ہوتے ہی ایسے ہیں معصوم، دنیا جہاں کی اونچ نیچ سے بے نیاز، بے فکر۔

اسٹیشن آ گیا۔ میرے شوہر نے سامان اٹھایا اور میں نے دونوں بیٹوں کو سنبھالا، ہینڈ بیگ میرے کاندھے پر تھا۔ ہم لوگ پلیٹ فارم پر جا پہنچے۔ پتا چلا آج ٹرین کچھ لیٹ ہے۔ ابھی اسٹیشن پر زیادہ رش نہیں تھا کیونکہ ہم لوگ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ آج سردی بھی ضرورت سے کچھ زیادہ تھی۔ لوگ ٹرین آنے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ ہم لوگ بھی وہاں آرام سے بیٹھ گئے۔ میرے برابر میں دو خواتین آ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یہاں تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے تھوڑی دیر میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

''ماشاء اللہ آپ کے بیٹے بڑے پیارے ہیں۔'' حلیے سے وہ بس ٹھیک ہی معلوم ہو رہی تھیں۔ چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں پیار نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ میرے بڑے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔

''جی، اشعر حسن۔'' اس نے جواب دیا۔ عورت کہنے لگی۔

''نام تو آپ کا بہت پیارا ہے اور چھوٹے کا نام؟''

''احمر حسن!'' میرے بیٹے نے جواب دیا۔ مجھ سے کہنے لگی۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''سکھر!'' میں نے کہا تو وہ کہنے لگی۔

''ہم لوگ بھی وہیں جا رہے ہیں۔ وہاں کس کے پاس؟''

''میکے جا رہی ہوں۔'' پھر میں نے جواب دیا اور اسی طرح وہ ہم لوگوں میں گھل مل گئیں۔ وہ دونوں بہنیں میرے بھی بڑے بیٹے سے باتیں کرتیں اور کبھی چھوٹے کو پیار کرنے لگتیں۔ اس طرح جیسے وہ ہماری ہی فیملی کا حصہ ہوں۔ ایک عورت تقریباً چالیس سال اور دوسری تقریباً پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چالیس سالہ عورت مجھ سے کہنے لگی۔



''ہم لوگ خالہ کے انتقال پر اچانک جا رہے ہیں۔ سیٹیں بک نہ ہوسکیں بہت کوشش کی مگر مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ آپ اپنے شوہر سے کہیں وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ بٹھا لیں۔ ہمارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے۔ کیا وہ بٹھا نہیں گے؟''

''جی بالکل بٹھا لیں گے۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ میں بھی اپنے ماں باپ کی سی نیچر کی ہوں کسی کو بھی مشکل یا پریشانی میں نہیں دیکھ سکتی۔ ہر وقت مدد کے لیے تیار ہو جاتی ہوں۔ قریب بیٹھے میں نے اپنے شوہر کو ساری بات بتا دی۔ وہ بھی راضی ہو گئے۔

''ہاں ٹھیک ہے بیٹھ جائیں۔'' ویسے بھی وہ بچوں کے آرام کے لیے ایک برتھ ہمیشہ فالتو کرا لیتے تھے مگر میں بچوں کو ہمیشہ اپنے ساتھ ہی سلاتی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا ان کے پاس ہینڈ پرس کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ ہمیں چھوڑنے میرے بہنوئی آئے تھے۔ انہیں کوئی ضروری کام تھا اس لیے وہ جلدی چلے گئے اور رہا کپڑوں کا سوال تو خالہ کا گھر ہے۔ میرے بہت سے کپڑے ادھر ہی ہیں تو وہ میں پہن لوں گی۔ دو چار دن کی تو بات ہے۔'' میں خاموش ہو گئی، زیادہ کوئی توجہ نہ دی۔

تھوڑی دیر میں شور و غل مچنے لگا۔ ٹرین آ گئی...... ٹرین آ گئی! ہر جانب سے صدائیں گونجنے لگی۔ انہوں نے دونوں سوٹ کیس کمبل اور دوسرا سامان سنبھالا میں نے دائیں ہاتھ سے اپنے بڑے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور بائیں ہاتھ میں چھوٹے بیٹے کو سنبھالا وہ دونوں خواتین ایک میرے دائیں جانب اور دوسری بائیں جانب چلنے لگیں۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے ہم لوگ۔ ٹرین کافی دور تھی رش بھی بہت تھا ہم تیزی سے جا رہے تھے پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون کہاں سے گھس رہا ہے اور کون کہاں سے نکل رہا ہے اسی اثناء میں ایک عورت کہنے لگی مجھے اپنے بیٹے کو دے دیں میں پکڑ لیتی ہوں۔ پھر تم آرام سے چڑھنا۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں بس ٹھیک ہے۔'' پھر دوسری کہنے لگی۔ ''لائیں مجھے اپنا بیٹا دے دیں میں پکڑ لیتی ہوں۔'' اسی طرح باری باری وہ دونوں عورتیں کہتی رہیں اور میں تیز تیز قدموں سے چلتی رہی۔ یکا یک میرے ذہن میں لاشعوری طور پر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور میں نے دیکھا کہ میرے بار بار انکار پر وہ دونوں وہاں سے رفو چکر ہو گئی ہیں اور میں دھڑ کتے دل کے ساتھ ٹرین تک جا پہنچی کچھ فاصلے پر وہ میرا انتظار کر رہے تھے پھر ہم لوگ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ میں حواس باختہ ہو رہی تھی وہ کہنے لگے۔

''خیریت تو ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔'' اور تھوڑی دیر میں انہیں سارا ماجرا سنا ڈالا تو وہ بھی بہت پریشان ہو گئے اور گھبرا کر کہنے لگے۔ اکثر و بیشتر اس قسم کی خواتین اور مرد حضرات ایسی جگہوں پر سیدھے سادھے لوگوں کی گھات میں لگے رہتے ہیں اور ان کی ہمدردیوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان میں ایسے گھل مل جاتے ہیں جیسے وہ انہی کے ساتھ ہوں اور پھر بچوں کو اغوا کر کے یا سامان لوٹ کے رات کے کسی بھی پہر غائب ہو جاتے ہیں۔''

ساری رات ہم باتیں کرتے رہے اور جاگتے رہے، بچوں کو دیکھتے رہے کہیں وہ دوبارہ نہ آ جائیں۔ صبح تک دور دور تک ان کا کوئی پتا نہ چلا۔ میں نے اس مہربان رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے کبھی نہ ختم ہونے والے غم سے بچا لیا۔

گھر پہنچ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ آج میرا بڑا بیٹا پندرہ سال اور چھوٹا بارہ سال کا ہے۔

اس واقعے کو بارہ سال ہو گئے ہیں مگر جب بھی یاد کروں کہ اس دن اگر میں لمحہ بھر کو بھی چوک جاتی اور اپنا بچہ انہیں دے دیتی تو...... یہ سوچ کر میری بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔

☆☆☆

آٹھویں تریں حکایت

# میں اور پلیٹ فارم



مجید احمد جائی

اُس نوجوان کی حکایت، جس کی خوشیاں پلیٹ فارم سے عبارت تھیں

سردیوں کی یخ بستہ رات تھی۔ میں ملتان کے مشہور اور تاریخی پلیٹ فارم پر لکڑی کے بنے بنچ پر بیٹھا سوچوں کے نگر آباد کیے ہوئے تھا۔ رات گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی اور دھند اپنی چادر چہار سو پھیلاتی جاتی تھی۔

میں اونی چادر اپنے وجود پہ لپیٹے ریل گاڑی کے انتظار میں تھا کیونکہ میرا گھر پلیٹ فارم سے کوئی تیس کلومیٹر دور ہے۔ خدانخواستہ میں مقررہ وقت پر پلیٹ فارم پر نہ پہنچ سکتا تو ایک تو میرا ٹکٹ ضائع ہو جاتا اور میرا مقصد فوت ہو جاتا۔ میرے ساتھ



وابستہ زندگیاں بے موت مر جاتیں۔ میں کسی کی موت کیوں کر چاہوں گا۔ اگر وہ دن، وہ ریل گاڑی، وہ سفر میرے مقدر میں نہ ہوتا تو آج کسی چوراہے پر سموسے، پکوڑے یا مونگ پھلی بیچ رہا ہوتا۔ اس پلیٹ فارم اور ریل گاڑی اور خاموش ویران پٹڑی نے میری زندگی بنادی۔

میں اُس ریل گاڑی کا منتظر بیٹھا تھا جس نے میری زندگی بنادی۔ رات کے ایک بجے اس ریل گاڑی نے یہاں پہنچنا تھا اور شیڈول کے مطابق یہ آج کی آخری ریل گاڑی تھی۔ پھر اگلے دن دوپہر گیارہ بجے کے قریب ریل آتی جس نے حیدرآباد جانا تھا۔

میں پلیٹ فارم کے اِس بینچ پر اکیلا بیٹھا تھا، پلیٹ فارم پر کوئی مسافر نظر نہ آتا تھا۔ اللہ جانے لوگوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا یا کوئی اور ماجرا تھا۔ قلی پلیٹ فارم کے برآمدے میں لاوارث پڑے اونگھ رہے تھے۔ ٹکٹ والا دفتر خالی تھا۔ اور ٹکٹ دینے والا کرسی پر ٹیک لگائے نیند کے مزے لے رہا تھا۔ مجھے کمروں میں جھانکنے کی عادت نہیں ہے۔ اس لئے میں کسی کمرے میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن باہر سے اتنا ضرور دیکھ سکتا تھا کہ کمروں کی روشنی مدھم ہے اور اندر والے شخص نیند کے مزے اڑا رہے ہیں۔

دُور سے ریل گاڑی نے اپنی مخصوص آواز میں سیٹی بجائی اور پل بھر میں پلیٹ فارم پر آن کھڑی ہوئی۔

ریل گاڑی آکر رُکی تو پلیٹ فارم کی رونقیں بحال ہوگئیں۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ جیسے کسی نے بڑے بڑے چراغ جلا کر رکھ دیئے ہوں۔ قلی اُٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ ریل کے اندر سے نمودار ہوئے اور منٹوں میں پلیٹ فارم کے برآمدے میں رش پڑ گیا۔ جیسے شہر بھر کے لوگ یہاں جمع ہو گئے ہوں۔ قسمت ہی سمجھ لیں سوار ہونے والا اکیلا میں ہی تھا۔ جس ڈبے میں میری سیٹ تھی، اس میں اپنے مخصوص سامان کے ساتھ سوار ہوا۔

سامان کیا تھا؟ بس خود کا ہمسفر لئے گھومتا تھا۔ کہتے ہیں بندہ کہیں سفر پر جائے تو خالی ہاتھ نہ ہو۔ میں نے بھی اپنے تعلیمی سرٹیفکیٹ کے ساتھ، اسناد، ڈگریوں کی فائل اور ملتانی سوغات میں سوہن حلوہ، ملتانی کھسہ اور خشک میوہ جات تھے۔

میں ریل گاڑی میں سوار ہوا تو پہلے سے موجود مسافر سو رہے تھے۔

میری سیٹ کے ساتھ والی سیٹ ایک حسینہ کی تھی۔ وہ اُس وقت ڈری، سہمی اور بے چین سی تھی۔ رات کی مدھم روشنی میں اُس کا چہرہ سُرخ لال تھا اور جگنو کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ میں نے اپنا سامان رکھا اور اپنی سیٹ پر بیٹھنے لگا تو وہ کچھ اور محتاط ہو گئی۔ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ اُس کے نین سمندر میں غوطہ زن تھے۔ آنسوؤں کے قطرے آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

میں حساس طبیعت وارد ہوا ہوں۔ مجھے روتے چہرے بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔ اب پتا نہیں اس گل لالہ کو کیا غم تھا جو دِل کی وادی کو آنسوؤں کے سمندر سے نہلائے ہوئے تھی۔ خواہ مخواہ آنکھوں کو کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں نے اپنی نگاہیں اُس پر گاڑھ دیں۔

''لو جیرے..... پھول جھڑی کا یار آگیا۔''

اسی لمحے یہ تُرش لفظ میری سماعتوں سے ٹکرائے اور میری روح زخمی کرتے چلے گئے۔

یہ جملہ میری سماعتوں میں زہر گھولنے لگا۔ میں نے خون خوار نظروں سے آواز کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا۔ چار اوباش لڑکے ہنستے ہوئے نظر آئے۔ اُلجھے چہرے، رنگت ایسی کہ دیکھتے ہی منہ پر رومال رکھنے کو من کرے۔

''ارے! اپنی بہن کو میرے حوالے کر کے بھول ہی گئے سالوں۔ میں ہی تو تمھارا بہنوئی ہو۔ نہیں جانتے۔''

میں نے بھی واہیات گالی جڑ دی۔ میں خوبرو گبرو نوجوان تھا۔

وہ چاروں ایسے گھومے جیسے سچ مچ میں ان کی بہن کو لے جا رہا ہوں۔ ان میں ایک جوشیلا تھا جو صحت

مند دِکھتا تھا، میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے خطرہ بڑھتا دیکھا تو اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا۔ پستول اُن کی طرف سیدھا کیا ہی تھا اُن کی بولتی بند ہوگئی۔ وہ جدی پشتی بدمعاش نہیں تھے۔ آوارہ کتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں تن تنہا لڑکی کو دیکھ کر چوہے شیر بن گئے تھے۔ جب وہ کھسیانی بلی کی طرح ایک طرف ہوکر بیٹھ گئے تو میں بھی پُر سکون ہوکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر ساری کہانی مجھے سمجھ آگئی۔ میں نے اُس مہ جبیں کو مخاطب کیا۔

''محترمہ اب خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں کچھ بھی ایسا ویسا نہیں ہوگا۔'' لڑکی میری بات سمجھ گئی۔ ریل گاڑی رات کے اندھیرے میں اپنی دہشت جمائے پٹری پر دوڑتی رہی۔

سحر پھوٹ رہی تھی جب ریل گاڑی کی رفتار آہستہ ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے رکتے رکتے رُک گئی۔ شاید کوئی اسٹیشن آیا تھا۔ گرم انڈے، گرم انڈے کی صدائیں گونج اُٹھیں۔ ابھی گرم انڈے شور مچارہے تھے کہ گرما گرم چائے آن وارد ہوئی اور مسافر بلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔ اور اپنے حواس بحال کرنے لگے۔

انڈے تو میرے پسندیدہ تھے اور چائے انڈوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لیے میں گرم انڈوں کے ساتھ دو کپ چائے بھی لے لی۔ محترمہ حسینہ درد کے آنسو بہاتے بہاتے محافظ کو پاتے ہی سوگئی تھی اور نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اب جو شور ہوا تو جاگ اُٹھی۔ میں نے گرم انڈے اور چائے کا کپ پیش کیا۔ اُس نے سفید موٹے موٹے دیدے مجھ پر گاڑ دیے۔ اُس کی نظریں بتلاتی تھیں کہ بھوکی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو جنبش نہیں دے رہی تھی۔

''لے لو...... تمہارے لیے ہیں۔ اچھا...... یہ بھی لو۔''

میں نے سوہن حلوے کا ڈبہ کھول کر اُس کے سامنے کیا۔ اُس کی خوش ذائقہ خوشبو پھیل گئی اور میں نے دو قاشیں نکال کر ڈبہ اُس کے حوالے کر دیا۔ ہچکچاتے ہوئے اُس نے میری پیش کش قبول کر لی۔ اُس نے منٹ میں انڈہ اور چائے اپنے حلق سے نیچے اُتار لیے۔ واقعی وہ بھوکی تھی۔ میں نے اُس کے کھانے کے انداز سے اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے دو انڈے اور منگوا لئے اور چائے کا ایک کپ بھی۔ ناشتے میں یہی کچھ ہی مل سکتا تھا کیونکہ ریل گاڑی چلنے لگی تھی۔ میں بھی سست تھا نیچے اسٹیشن کی طرف اتر کر نہ گیا۔ ویسے بھی اس وقت وہاں کیا ہو سکتا تھا۔ ریل گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی اور میں نے سلسلہ گفتگو جوڑا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' اُس نے مجھے گھورا اور خاموش رہی۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

''کدھر سے آرہی ہو، کہاں جارہی ہو۔'' وہ خاموش رہی۔

میں حیدر آباد نوکری کے لئے انٹرویو دینے جا رہا تھا۔ دِل میں ہزاروں خواہشیں تھیں۔ گھر میں ماں اور چھوٹے بھائی میرے منتظر تھے۔ ابو دو سال پہلے فوت ہوگئے تھے اور تب سے میں چھوٹی موٹی نوکری کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ سرکاری نوکری کی تلاش جاری تھی۔ میں نے بی۔ اے کر رکھا تھا۔ پچھلے اسٹیشن پر وہ چاروں اوباش لڑکے اُتر گئے تھے۔ جاتے ہوئے مجھے گھور رہے تھے جیسے ان کا شکار میری وجہ سے رہ گیا ہو۔ مجھے حیدر آباد اُترنا تھا۔ وہاں سے رکشہ لے کر اپنے دوست کے پاس جانا تھا جو کینٹ میں تھا۔ وہ لڑکی کچھ بھی نہ بولی، اور میرا سفر بور سا ہوگیا۔ بے قراری مزید بڑھتی لیکن اسی لمحے حیدر آباد کا اسٹیشن آگیا تو میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور کن اکھیوں سے حسینہ کو دیکھتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ وہ نیند کی وادی میں کھو چکی تھی۔ میں اُسے سوتا چھوڑ کر اُتر گیا۔

زندگی میں ایسے بہت سے واقعات ہوتے ہیں، کچھ لمحے دِل پہ نقش ہو جاتے ہیں اور کچھ لمحوں بعد بھول جاتے ہیں۔ میں رکشہ لے کر دوست کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ ہم دونوں نے مل کر ناشتا کیا اور مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ جہاں انٹرویو تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص کرم کیا کہ دو سال کی خاک چھاننے کے بعد میرے صبر کا

پھل مل گیا۔ مجھے نوکری مل گئی اور میں سرکاری نوکر بن گیا۔

مجھے نوکری کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ وہ لڑکی اب بھی میرے خیالوں میں رہتی تھی۔ اُدھر میری ماں میرے سر پر سہرا سجانے کے خواب سجائے ہوئے تھی۔ لیکن میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے دِل میں ایک کسک سی تھی۔ کوئی تھا جو مجھے شادی سے روکتا تھا۔ میں ہر ماہ گھر کا چکر لگاتا تھا۔ چھوٹے بہن بھائی بڑے ہو رہے تھے۔ گزر بسر اچھا ہو گیا تھا۔ اب کی بار گھر گیا تو ماں نے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر پلان بنا رکھا تھا۔ قصہ مختصر مجھے شادی پر رضامند کر لیا۔

☆......☆

میری خالہ کراچی رہتی تھی۔ امی نے اُس سے بات کر رکھی تھی۔ میری خالہ کی ہمسائی تھی جس کا خاوند دو سال قبل فوت ہو گیا تھا۔ اُس کی صرف ایک بیٹی تھی جو کنواری تھی۔ خالہ نے امی سے بات کر کے اس لڑکی کو میرے لئے پسند کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب لو میرج کی بیماری عام نہیں ہوئی تھی۔

میں ڈیوٹی پر آتے ہوئے چھوٹے بھائی اور امی کو ساتھ لے آیا، میں نے حیدرآباد اتر جانا تھا اور انہوں نے کراچی خالہ کے پاس جانا تھا۔

امی خالہ کے ہاں ایک ہفتہ رہ کر آئیں اور بات پکی ہو گئی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یوں سمجھیں ماں نے بھاگم بھاگ میں میرے سر پر سہرا سجا دیا تھا۔ ہماری برادری اتنی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی خیر خبر لینے والا تھا۔ محلے والے، چند عزیز جمع ہوئے اور سادگی کے ساتھ شادی ہو گئی۔ میری بارات ریل گاڑی سے کراچی گئی اور ریل گاڑی سے ہم دلہن لے کر گھر پہنچے۔

حجرہ عروسی سجایا گیا تھا، مہمان اپنی خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے تھے اور جب میں مسہری پر آ کر اپنی راج کماری کا گھونگھٹ اٹھایا تو بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سامنے وہی شہزادی بن ٹھن کر، ماتھے پر جھومر سجائے مخملی آنکھوں سے **مجھے تک** رہی تھی۔ دونوں طرف یک بارگی میں **ایک ہی لفظ** نکلا۔ ''تم!''

پھر یہ تم، ہم میں بدل گیا اور ہم نے **میاں بیوی** کے رشتے سے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا۔

بہت دن بعد میں نے اپنی گل لالہ سے **پوچھا وہ** پہلی ملاقات کا قصہ اب تو سناؤ، کہاں جا رہی **تھیں اور** کدھر جا رہی تھیں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے لب ہلائے اور میں ہمہ تن گوش ہوا۔

میرا ددھیال شورکوٹ میں ہے، جب ابو فوت ہوئے ہم شورکوٹ میں ایک شادی میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ اچانک ابو کو سینے میں درد اُٹھا اور یہ درد جان لیوا ثابت ہوا۔ ابو جان اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔ ہم دادا جی کے گھر رہ گئے اور ابو منوں مٹی تلے چلے گئے۔ دو ماہ بعد کراچی میں ہمارے ہمسایوں کی فوتگی ہو گئی تو امی کراچی واپس چلی گئی اور مجھے دادا جی نے روک لیا تھا۔ پھر اُس دن ایک ماہ بعد دادا جی نے مجھے شورکوٹ سے ریل گاڑی میں سوار کیا، کوئی اور میرے ساتھ نہیں آ سکتا تھا اور میں نے بھی دادا جی کو کہہ دیا تھا کہ میں چلی جاؤں گی آپ پریشان نہ ہوں۔

شورکوٹ سے ریل گاڑی چلی، میں اپنی سیٹ پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اگلے اسٹیشن سے وہ چار اوباش لڑکے سوار ہوئے اور پھر رات اپنے سائے ہر سو پھیلا چکی تھی۔ لوگ دھیرے دھیرے سوتے گئے، لیکن میں خوف میں ڈوبی تھی۔ پھر ملتان آیا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے روپ میں محافظ بھیج دیا۔ بس یہی کہانی تھی۔''

گل لالہ کہتی جا رہی تھی اور میں سنتا جا رہا تھا کہ اتنے میں امی کمرے میں آ گئیں۔ راز اب راز نہیں رہا تھا۔ میں آج خوشگوار زندگی گزار رہا ہوں۔ اُسی پلیٹ فارم پر جب جاتا ہوں تو مجھے بے پناہ پیار آتا ہے۔ کیونکہ اسی پلیٹ فارم سے میری زندگی کی خوشیاں جڑی ہیں۔

☆☆☆

ناول

حمیرا خان

# زہراب



**اُس نوجوان کی سرگزشت جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا**

کمرے میں دو لوگ موجود تھے لیکن وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چودہ بائی چودہ کے اس کمرے میں ایک طرف دیوار کے ساتھ بڑا سا صوفہ رکھا تھا جس کے آگے ٹیبل پر شیشے کا جگ اور گلاس رکھا تھا کمرے کے عین درمیان



میں دروازے کے سامنے والی دیوار کے پاس ایک کرسی تھی اور کرسی کے آگے ایک بڑی سی میز رکھی گئی تھی میز پر بھاری شیشے کی شیٹ کے نیچے سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ میز کے ایک طرف اسٹینڈ پر پاکستان کا جھنڈا اور دوسری طرف اسی میز پر کچھ فائلز، پین ہولڈر اور کیلنڈر کے علاوہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کچھ اور چیزیں رکھی ہوئی تھیں جبکہ کرسی کے پیچھے دیوار پر قائداعظم کا پورٹریٹ لگا تھا کمرے میں داخل ہونے والے ہر انسان کی پہلی نظر جناح کی اس تصویر پر ہی پڑتی تھی۔ یہ کمرہ دراصل جیلر ریاض کا آفس تھا اور اس وقت کمرے میں موجود دو انسانوں میں سے کرسی پر بیٹھا شخص خود جیلر ریاض تھا، ریاض کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی لیکن اپنی قابل رشک صحت کے ساتھ وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا بالوں میں سفیدی بھی کہیں کہیں ہی جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ بالوں کی اس سفیدی نے اس کی شخصیت کو اور پرکشش ، بارعب اور باوقار بنا رکھا تھا۔ جیلر کے سامنے مشتاق کھڑا تھا مشتاق ایک ہسٹری شیٹر تھا، کھلتی ہوئی گندمی رنگت گھنے براؤن بال، چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد اور چہرے کے دلکش خدوخال کی وجہ سے وہ اس عمر میں بھی خاصا ہینڈسم دکھتا تھا۔ کچھ لمحے فائل کے کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد جیلر مشتاق کی طرف متوجہ ہوا" میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں ، یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دو گے بلکہ شاید ٹھیک سے سننے کی زحمت بھی نہ کرو لیکن یہ میری ڈیوٹی ہے اور ایک انسان ہونے کے ناطے میرا فرض بھی ہے کہ تم سے یہ سب کہوں" جیلر ریاض نے ٹیبل کی دوسری طرف کھڑے مشتاق پر نظریں جمائے ہوئے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا، ریاض کے چہرے پر چھائی بے نیازی اسے اپنی بات کے سچ ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔

"کوشش کرنا کہ دوبارہ ایسا کوئی کام نہ کرو جو تمہیں یہاں آنا پڑے۔"

جیلر نے اپنی بات پوری کرتے ہی مشتاق کو جانے کا اشارہ کر دیا اور مشتاق جواب میں کچھ بھی کہے بنا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتا وہاں سے چلا گیا۔ مشتاق کے جانے کے بعد جیلر اپنی کرسی سے اٹھا اور آفس میں اِدھر اُدھر ٹہلنے کے انداز میں چلنے لگا، اس کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا جب مشتاق جیسا کوئی انسان جیل سے رہا ہوتا جس کے بارے میں ریاض کو معلوم ہوتا کہ رہا ہونے والا وہ شخص بہت جلد پھر کسی جرم کی سزا میں جیل میں ہوگا ریاض مایوس ہونے لگتا۔ یا شاید یہ تھا کہ یہ بات اسے بہت زیادہ اداس کر دیا کرتی تھی اور حد سے بڑھی ہوئی اداسی ہمیشہ ہی مایوسی کی راہ ہموار کیا کرتی ہے۔ چلتے چلتے جیلر کی نظر کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی قائداعظم کی تصویر کی طرف اٹھ گئی، تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوئے۔ تصویر میں موجود محمد علی جناح ہمیشہ ہی اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکال لایا کرتے تھے۔ جناح کی اس ملک کے حصول کے لیے کی گئی کوشش اسے اکساتی تھی کہ وہ بھی کوشش کرتا رہے، بنا تھکے بنا مایوس ہوئے بنا ہار مانے کوشش کرتا رہے، اس ملک کے لوگوں کو بہتر بنانے کی بہترین کوشش۔

☆......☆

سر سے فارغ البال اور چھوٹے قد مگر مضبوط جسم والا وہ آدمی بہت دیر سے ہونڈا سٹی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا منتظر نگاہوں سے جیل کے مین گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا اس دوران وہ گیٹ کئی بار کھلا اور بند ہوا لیکن جس کا اسے انتظار تھا وہ ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اس شخص کا نام اسلم تھا، اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں گنجے سر کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھیں۔ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوتے ہوئے اسلم نے ٹائم پاس کے لیے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا تبھی جیل کا چھوٹا گیٹ ایک بار پھر کھلا اور اس بار باہر آنے والا شخص مشتاق تھا جسے دیکھتے ہی اسلم کے چہرے پر گرم جوش مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ تیز تیز قدموں سے مشتاق کی طرف بڑھنے لگا۔ اسلم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر مشتاق کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے اس کی شخصیت کو اور دلفریب بنا دیا۔ مشتاق ان لوگوں میں سے تھا جنہیں دیکھ کر ذہن میں یہ محاورہ سر اٹھانے لگتا ہے، کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی۔ اس وقت وہ قیدیوں کی وردی کی بجائے اپنے ان کپڑوں میں تھا جو اس نے گرفتار ہونے کے وقت پہنے ہوئے تھے ان کپڑوں میں اسے دیکھنے والا بھی یہ یقین نہ کرتا کہ یہ شخص کوئی مجرم ہے اور ابھی

ابھی جیل سے باہر آیا ہے۔قریب آنے پر دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔بچھڑے ہوئے دوستوں کے ملاپ کا یہ منظر خاصا دلچسپ اور مزاحیہ تھا کیونکہ اسلم کے مقابلے میں مشتاق ایک لمبا چوڑا انسان تھا،اسلم اس کے کندھوں سے بھی نیچے آرہا تھا اور گلے ملتے ہوئے اسلم کا سر مشتاق کے سینے پر تھا۔ایک دوسرے کا حال چال پوچھنے کے بعد دونوں گاڑی کی طرف بڑھے،اسلم نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی جبکہ مشتاق اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

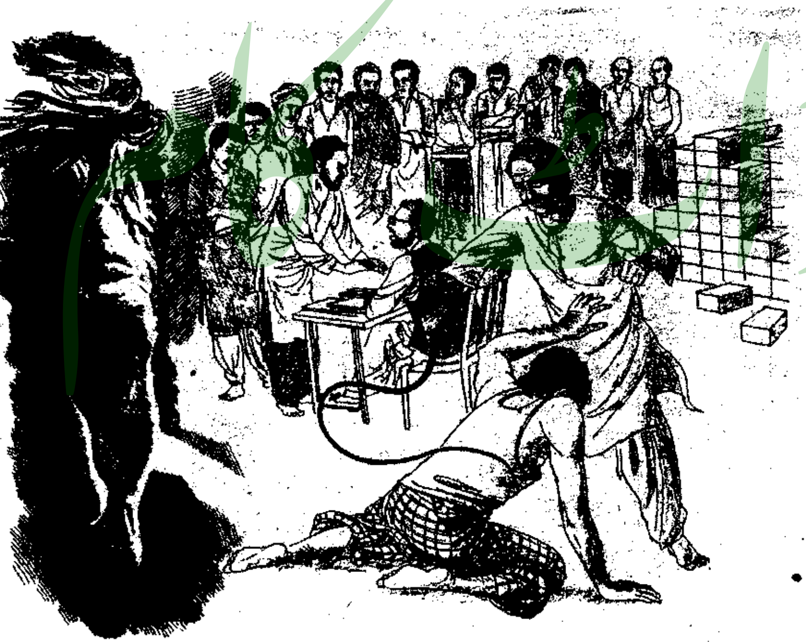
''لگتا ہے جیل کی روٹی تجھے راس نہیں آئی ،کافی دبلا ہو رہا ہے'' گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اسلم نے اپنے بے تکلف انداز میں مشتاق کی صحت پر تبصرہ کیا جس پر مشتاق کوئی جواب دینے کی بجائے مسکرا دیا۔باقی کا سفر باتوں میں کٹا اسلم مشتاق کو گزرے ہوئے دنوں کے حالات اور اہم واقعات سناتا رہا اور مشتاق اسے جیل کی باتیں بتاتا رہا۔دونوں دوست خوش گپیوں میں مصروف اپنی منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

☆......☆

مشتاق اور اسلم کافی پرانے دوست تھے دونوں کی ملاقات سردار کے اڈے پر ہی ہوئی تھی اور پھر چند دنوں میں ہی ان کی دوستی ہو گئی،مشتاق اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور ماں باپ کی وفات کے بعد اس دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا جبکہ اسلم کے گھر میں اس کی چھوٹی بہن ساجدہ اور بیوی نجمہ کے علاوہ چھ ماہ کا بیٹا اکرم بھی تھا۔مشتاق کی شادی کا ذکر ہوا تو اسلم نے بڑی خوشی سے اسے اپنی بہن ساجدہ کا ہاتھ تھما دیا اور اس طرح ان کی یہ دوستی رشتے داری میں بدل گئی،ساجدہ اور مشتاق کی شادی کے دو سال بعد نواب کی پیدائش ہوئی۔زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک سال پہلے اسلم کی بیوی دوسرے بچے کی پیدائش پر نا مناسب میڈیکل سہولتوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اس وقت کے بعد سے ساجدہ نواب کے ساتھ ساتھ اکرم کا بھی خیال رکھتے ہوئے تھی ویسے بھی ساجدہ کی نظر میں نواب اور اکرم میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ وہ اسلم اور نجمہ کی اولاد تھا جنہوں نے بھائی بھابی ہونے کے باوجود ساجدہ کو ماں باپ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔

☆......☆

اس میدان میں کئی لڑکے جمع تھے جن میں زیادہ تر کی عمریں دس سے بارہ سال کے درمیان تھیں،وہاں اس وقت گلی ڈنڈے کا کھیل کھیلا جا رہا تھا،مقابلہ یہ تھا کہ کون گلی کو سب سے زیادہ دور اور اونچا پھینک پاتا ہے اور کتنی بار۔گلی ڈنڈا پنجاب کا



ایک بہت ہی مقبول کھیل ہے اگرچہ کمپیوٹر اور ویڈیو گیمز نے اس طرح کے کھیلوں کو بہت پیچھے کر دیا ہے لیکن دیہاتوں میں جہاں ابھی تک ٹیکنالوجی اس حد تک نہیں پہنچی یا اپنائی نہیں گئی یہ کھیل اب بھی بڑے شوق اور جوش وخروش کے ساتھ کھیلے جاتے ہیں۔ اس وقت ڈنڈا نواب کے بائیں ہاتھ میں تھا عام طور پر ڈنڈے کو دائیں ہاتھ میں پکڑا جاتا ہے لیکن نواب کو ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کی عادت تھی، وہ مسلسل بڑی مہارت کے ساتھ کھیلے چلا جا رہا تھا اس کے ساتھی لڑکے ایسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر شکست صاف دکھائی دے رہی تھی ان کی باری تو آخر آ ہی جاتی تھی لیکن نواب کے مقابلے میں ان کا جیتنا آج بھی مشکل دکھائی دے رہا تھا، ہار کے اسی احساس نے ان کے دلوں میں نواب کے لیے حسد اور نفرت کا زہر بھر دیا تھا جبکہ نواب ان سب سے بے نیاز کھیلے چلا جا رہا تھا، نواب کی عمر دس سال تھی، ڈارک براؤن بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ سفید رنگت والا نواب حالات کے حساب سے نہ سہی لیکن شکل وصورت اور مزاج میں واقعی نواب لگتا تھا۔

''ہم جا رہے ہیں'' لڑکوں نے آپس میں گھسر پھسر کی اور پھر ان میں سے ایک لڑکے نے اعلان کیا۔

''ابھی کھیل ختم نہیں ہوا، تم لوگ نہیں جا سکتے'' نواب نے بے نیازی سے انہیں دیکھتے ہوئے اپنی مخصوص حکمیہ لہجے میں انہیں جواب دیا تو لڑکے اس کے انداز پر اور تلملا گئے۔

''ہاں تو تم کھیلتے رہو ہم اپنے گھر جا رہے ہیں ہمارے گھر پر ہمارے ماں باپ ہمارا انتظار کر رہے ہیں، تمہارا باپ تو ہے ہی نہیں تو تم کھیلتے رہو'' شکل سے ذرا تیز طرار دکھائی دینے والے لڑکے کے کہنے پر باقی کے سب لڑکے ہنس دیے۔ اس کے الفاظ اور مذاق اڑاتے انداز پر ہی نواب کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا بچوں کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اس نے کچھ بھی کہے بنا ہاتھ میں تھامے ڈنڈے سے اس لڑکے کے سر پر وار کیا، چوٹ اتنی شدید تھی کہ لڑکے کے سر سے خون بہنے لگا، خون دیکھ کر سبھی لڑکے بدحواس ہو گئے لیکن نواب اس پر ذرا بھی توجہ دیئے بنا اس لڑکے کی پٹائی کر رہا تھا جب دو لڑکوں نے اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا تو وہ لاتوں اور مکوں سے اس بدتمیز لڑکے کو مارنے لگا۔ نواب اس وقت اتنا جنونی ہو رہا تھا کہ سب مل کر بھی اس لڑکے کو نواب کے چنگل سے چھڑا نہیں پا رہے تھے، اسی میدان میں کچھ فاصلے پر فٹ بال کھیلنے والے کچھ بڑے لڑکے انہیں لڑتے دیکھ کر وہاں پہنچے اور انہوں نے نواب کو اس لڑکے سے دور کیا۔

یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ نواب غصے سے اتنا پاگل اور جنونی ہو گیا تھا جب بھی کوئی اس کے باپ کے حوالے سے کوئی غلط بات کرتا تھا وہ اسی طرح اسے سبق سکھایا کرتا تھا۔ ساجدہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ مشتاق دور کسی شہر میں کسی سیٹھ کے پاس ڈرائیور کی نوکری کرتا ہے مشتاق چھ مہینے میں ایک بار ضرور گھر کا چکر لگایا کرتا تھا لیکن پچھلے تین سال سے وہ گاؤں نہیں آیا تھا، ساجدہ اس بارے میں نواب کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے پائی تھی اور گاؤں میں اس بارے میں مختلف قسم کی افواہیں گرم تھیں۔ کسی کے مطابق مشتاق مر گیا تھا تو کسی کے خیال میں اس نے شہر میں دوسری شادی کر لی تھی تبھی اپنے خاندان کو بھولا ہوا تھا اور اتنے عرصے میں ایک بار بھی گاؤں کا رخ نہیں کیا تھا، کچھ لوگوں کا کہنا یہ بھی تھا کہ اسے پولیس نے کسی جرم میں گرفتار کر لیا تھا اور وہ اس وقت جیل میں تھا تبھی گاؤں نہیں آ سکا ورنہ بیوی اور بیٹے پر جان دینے والا مشتاق اتنا عرصہ ان سے دور رہ ہی نہیں سکتا تھا، غرض جتنے منہ اتنی باتیں، بڑوں کے درمیان یہ سب باتیں ہوتیں تو بچے بھی پیچھے نہ رہتے کھیل میں نواب سے ہارتے تو اس طرح کی باتوں سے اپنے غصے کا اظہار کرتے اور ایسا کرنے پر نتیجہ ہر بار یہی نکلا کرتا تھا جو کہ آج ہوا تھا۔

نواب کی لڑائی کی خبر اس کے گھر تک پہنچ چکی تھی ساجدہ یہ خبر سنتے ہی سب کام چھوڑ کر تقریباً بھاگتی ہوئی میدان میں پہنچی تھی، لڑکے کو وہاں سے لے جایا جا چکا تھا لیکن اس کے سر سے بہنے والا خون اب بھی میدان میں کئی جگہ پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ نواب کی اس حرکت پر ساجدہ کا غصہ آسمان پر جا پہنچا اس نے وہیں اسے مارنا شروع کر دیا باقی کی کسر لڑکوں کی لگائی بجھائی نے پوری کر دی۔ کچھ دیر پہلے کسی کے قابو نہ آنے والا نواب کوئی مزاحمت کیے بنا اس کمزور سی عورت کے ہاتھوں پٹ رہا تھا کیونکہ وہ عورت ساجدہ اس کی ماں تھی۔

☆......☆

ہنڈا سٹی کے سفر کا اختتام شہر سے بہت دور ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچ کر ہوا تھا گاؤں کیا تھا ساٹھ ستر گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں زیادہ تر گھر کچے تھے کسی کسی گھر میں کچھ پکی اینٹیں بھی لگی دکھائی دے جاتی تھیں لیکن ایسا ایک بھی گھر نہیں تھا جو مکمل طور پر پکی اینٹوں سے بنا ہوا ہو بستی کے زیادہ تر مرد اور عورتیں اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کیا کرتے تھے جبکہ ان کے بچے بھی ہوش سنبھالتے ہی اینٹیں بنانے کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے میں لگ جایا کرتے تھے۔ ہنڈا سٹی اس گاؤں کے آخری سرے پر جا کر رک گئی۔ وہاں ایک چھوٹی سی چار دیواری میں چار گھوڑے گھاس چرنے میں مصروف تھے۔ گاڑی کی آواز سن کر اصطبل کے ساتھ بنے چھوٹے سے کچے کمرے میں سے ایک شخص باہر نکلا اس کی عمر تیس سے پینتیس سال کے درمیان تھی، اس شخص کا نام عابد تھا آنکھوں کو تیز تیز حرکت دیتا عابد خاصا چاک و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ وہ چلتا ہوا گاڑی تک آیا اور پھر انہیں سلام کرتا ہوا اصطبل کی طرف بڑھا مشتاق اور اسلم اس کے ساتھ تھے دونوں نے گھوڑوں کا جائزہ لیا اور ان میں سے دو گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عابد کو انہیں باہر لانے کا کہا۔

''کوئی چا پانی باؤ جی؟'' عابد کے پوچھنے نے ان کی بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا

''کوئی چا پانی باؤ جی؟'' عابد نے گھوڑوں کی رسیاں کھولتے ہوئے پوچھا اور پھر ان کے منع کرنے پر اثبات میں سر ہلاتا گھوڑوں کو اس چار دیواری پر مشتمل اصطبل سے باہر لے آیا۔ مشتاق نے سفید رنگ کا جبکہ اسلم نے کالے والے گھوڑے کی لگام تھام لی اور جست لگا کر اس پر سوار ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بستی کے پچھلی طرف والے گھنے جنگل میں سفر کر رہے تھے۔

☆......☆

ان کا رخ جنگل کے آخری سرے سے ذرا پہلے بنے اڈے کی طرف تھا، راستے میں انہیں کسی جگہ پر بھی کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا ایسا نہیں تھا کہ جنگل میں کوئی پہریدار نہیں تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں میں سردار کے آدمی چھپے ہوئے تھے جن کے پاس لوڈ ڈ گنز تھیں اور کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ گولی چلانے سے دریغ نہ کرتے لیکن مشتاق اور اسلم گروہ میں خاص حیثیت رکھتے تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ وہ دونوں سردار کے سب سے زیادہ قریب تھے اور سردار کے بعد گروہ میں سب سے زیادہ اہمیت بھی رکھتے تھے اس لیے وہ بڑے آرام سے گھوڑے دوڑاتے اڈے تک پہنچ گئے۔ دن کا وقت ان لوگوں کے آرام کا وقت ہوا کرتا تھا اس لیے تقریباً بھی ساتھی اڈے پر موجود تھے۔ سب نے مشتاق کو گھیر لیا اور اس سے جیل کے حالات جاننے کے لیے سوالات کرنے لگے۔ سردار اس وقت شہر گیا ہوا تھا اس لیے وہ دونوں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے سردار کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

☆......☆

''اماں تو رومت تجھے مجھ پہ غصہ ہے تو مجھے اور مار لے لیکن رومت'' ساجدہ نواب کو مارتی ہوئی اور گھسیٹتی ہوئی گھر لے آئی تھی نواب نے اس دوران اف تک نہ کیا تھا لیکن اب وہی ساجدہ غصہ اترنے کے بعد تھپڑوں سے لال ہوئے نواب کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کا چہرہ چومتے ہوئے روئے چلی جا رہی تھی نواب کو مار سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی ساجدہ کے آنسوؤں سے ہو رہی تھی، خاموشی سے پٹنے والا نواب ماں سے نہ رونے کی درخواست کرتا ہوا خود بھی رو پڑا تو ساجدہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''کیوں کرتا ہے ایسے کام بتا؟ کتنی بار منع کیا ہے نا تجھے کہ مت جھگڑا کر کسی کے ساتھ'' ساجدہ اسے گلے سے لگائے لگائے کہہ رہی تھی جواب میں نواب نے اسے ساری بات کہہ سنائی۔

''دنیا کچھ بھی کہے گی تو، تو اس طرح غصے سے پاگل ہو جائے گا؟ دیکھ بیٹا اگر تجھے خود پر قابو نہیں ہوگا تو یہ دنیا تیرے غصے کا فائدہ اٹھائے گی اور تجھے اپنے طریقے سے چلائے گی۔'' نواب اب ساجدہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا اور ساجدہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے سمجھا رہی تھی۔

☆......☆

سردار کی واپسی شام ڈھلے ہوئی تھی اور اس نے اڈے پر پہنچتے ہی ان دونوں کو اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ وہ دونوں سردار کے

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کمرے میں داخل ہوا تو سردار اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے ملا۔ ''ایک کام کرنے کا پلان ہے تم ساتھ چلو گے یا ابھی آرام کر کے تھکن اتارو گے؟'' خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد سردار مشتاق سے کہنے لگا۔ ''آرام کیسا سردار، جب حکم کرو ساتھ چلنے کو تیار ہوں، بتاؤ کدھر اور کب جانا ہے'' مشتاق کا لہجہ اور الفاظ دونوں مودب تھے، مشتاق کی بات سن کر سردار مسکرانے لگا اور پھر اس نے ایک ایک کر کے پلان کی ساری تفصیل مشتاق کو سنا دی درمیان درمیان میں مشتاق سوال بھی کرتا رہا تھا اور کبھی سردار تو کبھی اسلم اس کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ بہت دیر بعد جب وہ دونوں سردار کے کمرے سے نکلے تو ان دونوں کا ذہن دو دن بعد آنے والی اس رات کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جب انہوں نے ڈاکا مارنے جانا تھا۔

☆......☆

اسی شام جب کہ ساجدہ نواب اور اکرم کے لیے کھانا بنانے میں لگی تھی ان کے دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی ساجدہ چولھا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی دروازہ کھولنے پر اسے حویلی کے ملازم کی صورت دکھائی دی تو وہ جیسے بنا کچھ کہے سنے ہی سارا معاملہ سمجھ گئی۔ ''چوہدری صاحب نے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو بلوایا ہے'' ملازم کی زبان سے ادا ہوئے اس فقرے نے ساجدہ کے خدشات کی تصدیق کر دی اس نے ملازم کو اپنے حویلی آنے کا کہہ کر رخصت کیا اور اندر آ گئی اس کی ایک روٹی رہ گئی تھی اس نے جلدی جلدی روٹی توے پر ڈالی اور اس کے پکتے ہی ساری روٹیوں کو رومال میں لپیٹ کر چنگیری میں رکھ دیا چنگیری ہاتھ میں اٹھائے اٹھائے وہ تین کمروں کے اس مکان کے سب سے چھوٹے کمرے کی طرف بڑھی جہاں اس وقت اکرم اور نواب موجود تھے، روٹی چارپائی پر رکھ کر وہ دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر باہر نکل آئی اور گھر سے باہر نکل کر دروازے کو کنڈا لگا دیا، وہاں چوری کا تو کوئی ڈر نہ تھا لیکن گاؤں میں گھومتے آوارہ کتوں کا گھر میں داخل ہونے کا خدشہ ضرور تھا۔ دونوں لڑکے لاابالی انداز میں قدم بڑھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ساجدہ کی باتیں سنتے ہوئے اثبات میں گردنیں ہلائے جا رہے تھے جو انہیں سمجھا رہی تھی کہ چوہدری کے سامنے کیا بات کرنی ہے اور کیسے کرنی ہے۔

☆......☆

حویلی میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھی بیٹھک کی طرف بڑھی جانتی تھی کہ چوہدری اس وقت وہیں ملا کرتا تھا۔ بیٹھک میں داخل ہو کر ساجدہ نے ایک نظر کمرے میں موجود افراد پر ڈالی، جہاں حسب توقع زخمی ہونے والا لڑکا اور اس کے ماں باپ موجود تھے۔ لڑکے کے ماں باپ غصے اور نفرت سے نواب کو گھور رہے تھے لیکن اس پر ان کی نظروں کا کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ بڑے اطمینان سے ماں کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ ''سلام چوہدری!'' ساجدہ نے باقی سب کو نظر انداز کرتے ہوئے چوہدری کو سلام کیا۔ ''ساجدہ میں نے تجھے پہلے بھی کئی بار کہا ہے اپنے پتر کو سمجھا یہ سب غنڈا گردی اس گاؤں میں نہیں چلے گی۔'' سلام کا جواب دینے کے بعد چوہدری سیدھا اس بات پر آ گیا جس کے لیے اس نے ساجدہ کو بلوایا تھا۔ ''چوہدری صاحب اس بچے کو بھی سمجھائیں کہ یہ نواب کے باپ کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں نہ کیا کرے اس سے نواب کو غصہ آ جاتا ہے۔'' نواب کو مار مار کر غصہ اتارنے والی ماں اب اپنے بیٹے کی طرفداری کے لیے ڈٹ گئی تھی۔

''اچھا! تیرے نواب کو غصہ آئے گا تو جو چاہے گا وہ کرے گا؟ چاہے گا تو کسی کا خون بھی کر دے گا'' چوہدری نے طنزیہ انداز میں کہا اس کے الفاظ نے ساجدہ کا دل دہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کی زبان سے بے ساختہ اللہ نہ کرے نکلا تھا۔

''دیکھ ساجدہ آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اپنے لڑکے کو قابو میں رکھ دوبارہ بھی ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا پھر تجھے یہ گاؤں چھوڑ کر جانا ہو گا، اور سن لڑکے'' ساجدہ سے بات کرتے ہوئے چوہدری نے نواب کو مخاطب کیا۔

''میرا نام نواب ہے'' نواب کو چوہدری کا سن لڑکے کہہ کر بلانا بہت برا لگا تھا بھی وہ بولا تھا، اس کی بات پر چوہدری کے چہرے پر ناگواری کی شکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

''اپنے بیٹے کے تیور دیکھ رہی ہے تو؟ مجھے آثار اچھے دکھائی نہیں دیتے یہ لڑکا بڑا ہو کر کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا'' چوہدری ساجدہ سے کہہ رہا تھا ساجدہ کے چہرے پر پریشانی دکھائی دینے لگی لیکن نواب کا اطمینان جوں کا توں تھا وہ اب بھی بے خوفی سے چوہدری کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اس کی یہ دیدہ دلیری چوہدری کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، خیر پسند تو اسے خود نواب بھی نہیں تھا لیکن جب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہر بات کا جواب دیتا تو چوہدری اس کے اس انداز سے

خائف ہو جاتا اور اس کے دل میں نواب کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات میں اضافہ ہو جایا کرتا۔

''تم بے فکر رہو چوہدری آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' ساجدہ نے بات بڑھتے دیکھ کر چوہدری سے نرم لہجے میں کہا چوہدری بھی شاید بات ختم کرنا چاہ رہا تھا اس لیے دو چار اور باتیں سنا کر اس نے دونوں خاندانوں کو وہاں سے چلتا کیا۔

☆......☆

ساجدہ نواب اور اکرم کو لیے باہر نکلی تو جانے کہاں سے عالیہ نکل کر یکدم ان کے سامنے آ گئی ''آؤ نواب میں تمہیں اپنی نئی گڑیا دکھاؤں ابا آج ہی لایا ہے شہر سے۔'' پانچ چھ سال کی گڑیا جیسی خوبصورت عالیہ نواب کا ہاتھ تھامے ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں گھر جا رہی ہوں تم دونوں جلدی گھر آ جانا ابھی روٹی بھی کھانی ہے تم نے۔'' ساجدہ اکرم اور نواب کو عالیہ کے ساتھ چھوڑ کر خود حویلی کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ عالیہ انہیں لیے خوش خوش چلتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی جہاں اس وقت اس کی سب سے پکی سہیلی رانی بھی اس کی گڑیا دیکھنے آئی ہوئی تھی۔

''جب میرا ابا آئے گا تو میں اس سے کہوں گا وہ شہر سے تیرے لیے اس سے بھی بڑی گڑیا لے کر آئے۔'' نواب کو وہ گڑیا اچھی تو لگی تھی لیکن چونکہ لانے والا چوہدری تھا اس لیے وہ کھل کر اپنی پسند کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔

''اس سے بھی بڑی؟'' عالیہ نے اس کی بات سن کر حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں اس سے بھی بہت بڑی اور خوبصورت۔'' نواب اس کی حیرت دیکھتے ہوئے اسے گڑیا کی کچھ اور خوبیاں بتانے لگا، بولنے والی گڑیا چلنے والی گڑیا جانے کون کون سے گڑیا تھیں جو اس نے عالیہ کو لا کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''تیرا ابا آئے گا نا نواب'' عالیہ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھی، اسے نواب کے ابا کے آنے نہ آنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کی دلچسپی تو ان گڑیوں میں تھی جو نواب کے ابا کے آنے پر ہی اسے مل سکتی تھیں۔ ''ہاں آئے گا نا اور بہت جلد آئے گا پھر تو کہے گی تو میں تیرے لیے گڑیا کا گھر اور اس کے کپڑے جوتے بھی منگوا دوں گا۔'' عالیہ کے لہجے میں شک کی جھلک نواب کو ناگوار تو گزری تھی مگر کیا کرتا کہ شک کرنے والی عالیہ تھی کوئی اور ہوتا تو ایسی بات کہنے پر اب تک نواب سے مار کھا رہا ہوتا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اسی وقت عالیہ کا بڑا بھائی وسیم کمرے میں داخل ہوا تھا اور اب ان کی طرف گھورتے ہوئے اپنی بہن سے پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں بڑے بھیا میں نواب کو اپنی گڑیا دکھا رہی تھی، یہ دیکھیں کتنی پیاری ہے نا'' عالیہ کی عمر کا تقاضا یہی تھا کہ اسے اس وقت گڑیا کے سوا کچھ نہ سوجھ رہا تھا نہ تو اس نے وسیم کے لہجے میں موجود غصے کو محسوس کیا تھا اور نہ ہی نواب کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر دھیان دیا تھا۔

''تم دونوں بھاگو ادھر سے'' وسیم نے غصے سے ان دونوں سے کہا نواب نے اس بدتمیزی کے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر عالیہ کو دیکھ کر کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل دیا جس کے چہرے پر وسیم کی بات سے پریشانی دکھائی دینے لگی تھی۔ اکرم اور نواب خاموشی سے کمرے سے نکل کر باہر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے ان کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا جہاں ساجدہ ان دونوں کی منتظر تھی۔

☆......☆

''تجھے کتنی بار کہا ہے ان آوارہ لڑکوں سے دور رہا کر تجھے میری بات کی سمجھ نہیں آتی۔'' ان کے کمرے سے نکلتے ہی وسیم عالیہ کو ڈانٹنے لگا تھا جواب میں عالیہ نے زور شور سے رونا شروع کر دیا تو وہ چپکے سے وہاں سے نکل بھاگا۔ جانتا تھا کہ عالیہ ماں باپ کی کتنی لاڈلی ہے اور اسے ڈانٹنے پر وسیم کو بہت بری طرح جھڑکیاں ملنی تھیں۔ عالیہ کے رونے کی آواز سن کر ملازمہ وہاں آ گئی تھی اور اب عالیہ کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن لاڈ پیار میں پلی عالیہ کے لیے وسیم کا اونچی آواز میں بات کرنا ناقابل برداشت تھا اور رو تو وہ اس لیے بھی رہی تھی کہ وسیم نے نواب کو ڈانٹ دیا تھا اور اب اس کا دل اس خدشے میں مبتلا ہو رہا تھا کہ کہیں نواب ناراض ہو کر اس کے لیے گڑیا منگوانے کا پروگرام ہی ختم نہ کر دے۔ تھک ہار کر ملازمہ عالیہ کا ہاتھ پکڑے چوہدرائن کے پاس چلی گئی، عالیہ کے پیچھے پیچھے رانی بھی تھی۔

''رانی تو ابھی تک اپنے گھر نہیں گئی، شام ڈھلنے لگی ہے تیری ماں تیرا راستہ دیکھتی ہوگی چل اب جا بلکہ تو اسے چھوڑ آ اکیلی جاتی ڈرے گی اندھیرے میں'' عالیہ کا رونا بند ہوا تو چوہدرائن کی توجہ رانی کی طرف گئی اسے جانے کا کہتے ہوئے چوہدرائن کو اچانک خیال آیا کہ باہر اندھیرا پھیل رہا ہے تو ملازمہ سے رانی کو چھوڑ کر آنے کے لیے کہنے لگی، اس کی اس بات پر عالیہ نے بہت تشکر بھری نظروں سے چوہدرائن کو دیکھا تھا واقعی اسے گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

''اماں رانی میرے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟'' رانی کے جانے سے عالیہ اکیلی اور اداس ہوگئی تھی تبھی ماں سے پوچھ رہی تھی جواب میں چوہدرائن اسے سمجھانے لگی کہ رانی وہاں کیوں نہیں رہ سکتی چوہدرائن کی بات پر عالیہ خاموش تو ہوگئی تھی لیکن مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

☆......☆

کھانا کھانے کے بعد دونوں لڑکے اپنی چارپائی پر سونے کے لیے لیٹ گئے اور ساجدہ ان کے ساتھ ہی دوسری چارپائی پر پڑ گئی۔ نواب اور اکرم تو پڑتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے لیکن ساجدہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی عرصے سے اس کی طبیعت خراب چلی آ رہی تھی اس بیماری نے اسے کمزور اور نڈھال کر دیا تھا ایک تو بیماری دوسرا مشتاق کا جیل جانا اسے توڑ گیا تھا وہ اب تک گاؤں والوں سے اور نواب سے یہ بات چھپانے میں کامیاب رہی تھی کہ مشتاق ایک ڈاکو تھا۔ چونکہ وہ بہت دور دوسرے صوبے میں اپنی کارروائیاں کیا کرتا تھا اس لیے یہ بات اب تک پردے میں رہ سکی تھی لیکن آخر کب تک ساجدہ اب تھکنے لگی تھی۔ اسلم بھی پچھلے عرصے میں صرف ایک بار گھر آ سکا تھا، کبھی کبھار اس کا فون آ جاتا اور اتنے دن بعد بھائی کی آواز سننے والی ساجدہ کا دل ہی نہ کرتا کہ وہ اسے اپنی بیماری کا بتا کر پریشان کرے اس لیے وہ اسے سب اچھا ہے کی خبر سنائے جاتی اور جب وہ موبائل نہ رکھنے کی وجہ پوچھتی تو وہ اسے ٹال دیتا۔ اسلم اور مشتاق ہمیشہ کسی نہ کسی پی سی او سے ہی اسے فون کیا کرتے تھے انہوں نے موبائل فون نہیں رکھے ہوئے تھے اس لیے ساجدہ خود سے ان سے رابطہ نہیں کر پاتی تھی۔ بھائی اور شوہر کے بارے میں سوچتے ہوئے ساجدہ کا دھیان آج کے واقعے کی طرف چلا گیا۔ نواب دن بہ دن غصیلا اور جھگڑالو ہوتا جا رہا تھا ساجدہ اس کی طرف سے بہت پریشان تھی لیکن ایسا کوئی نہیں تھا جس سے وہ اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتی۔ اکرم نے نیند میں پانی مانگا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل آئی گلاس میں پانی لے کر واپس کمرے میں آئی تو اکرم دوبارہ سو چکا تھا اس نے اسے جگا کر پانی پلایا، پانی پی کر اکرم پھر سے لیٹا اور سو گیا۔ ساجدہ بھی اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''نہ جانے مشتاق کب گھر آ سکے گا اور بھیا کو بھی تو بہت زیادہ وقت گزر گیا گھر کا چکر لگائے کئی دن سے تو ان کا فون بھی نہیں آیا خدا کرے کہ سب خیر ہو'' اپنے بھائی اور شوہر کی خیر مانگتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں شرمندگی کا احساس ابھرا تھا لیکن اس نے شرمندگی کے اس احساس کو جھٹک دیا تھا اور ایک بار پھر خود سے باتیں کرنے میں لگ گئی۔

اسلم نے اسے جو بتایا تھا اس کے حساب سے اب تک مشتاق کو گھر آ جانا چاہیے تھا لیکن نہ تو وہ آیا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی فون ہی آیا تھا۔ ساجدہ دوبارہ اپنی جگہ پر لیٹ گئی لیکن دل کی بے چینی چین نہ لینے دے رہی تھی وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی، کمرے میں دونوں لڑکوں کی سانسوں کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔

☆......☆

رات کا تیسرا پہر تھا سارا گاؤں خاموشی اور اندھیرے کی چادر اوڑھے سو رہا تھا ایسے میں گھوڑوں کی ٹاپوں اور گاڑی کی آواز نے اس سکوت میں خلل ڈال دیا اس سے پہلے کہ گاؤں والے سنبھل پاتے سردار اور اس کے آدمی گاؤں کو گھیر چکے تھے۔

سب سے پہلے انہوں نے گاؤں کے چھوٹے سے تھانے پر قبضہ کیا اور ان کے ساتھیوں نے گاؤں کے نمبردار کے گھر پر جا کر انہیں قابو کیا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نمبردار اور اس کے بیٹے ملازموں کے ساتھ مل کر ان پر فائرنگ کریں گے اور مقابلے کی کوشش کریں گے۔ ہر ہر چیز کی منصوبہ بندی کی گئی تھی چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھا گیا تھا، سردار کا اصول تھا کہ جہاں واردات کرنی ہو وہاں پہلے اپنے بندے بھیج کر اچھی طرح معلومات حاصل کرو اور پھر کارروائی کرو۔ سردار کے آدمی بھیس بدل کر گاؤں کا جائزہ لیتے اور پھر ان کی دی گئی معلومات کی روشنی میں سارا پلان ترتیب دیا جاتا تھا ویسے تو وہ لوگ یوں بھی اگر اچانک کسی گاؤں پر دھاوا بول دیتے تو بہت کم لوگ ہی ایسے تھے جو ان سے مقابلہ کرنے کی

جرات کرتے لیکن پھر بھی سردار کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ ہر ہر گھر سے لوٹ مار کر کے ایک کامیاب ڈاکے کے بعد وہ لوگ واپس لوٹ گئے تھے، جاتے ہوئے ان کے پاس سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ کافی سارے پیسے بھی تھے اس گاؤں کے لوگ ان کی توقع سے بڑھ کر امیر ثابت ہوئے تھے آج کا دن ان کے لیے بہترین ثابت ہوا تھا اور گاؤں والے ایک بار پھر ظلم اور بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔

☆......☆

ڈاکے سے واپس آ کر سب شراب میں مست ہو کر جیت کا جشن منانے میں لگ گئے تھے جبکہ مشتاق سردار کے کمرے میں چلا آیا اور اس سے گھر جانے کی اجازت مانگنے لگا، سردار بھی اس دن بہت خوش تھا اس لیے اس نے بہ خوشی مشتاق اور اسلم کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ سردار کے پاس سے آ کر دونوں نے اپنا مختصر سا سامان باندھا اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس بار بھی بستی تک کا سفر انہوں نے گھوڑوں پر ہی طے کیا تھا۔

☆......☆

اس رات کی صبح ساجدہ سے اپنے بستر سے نہ اٹھا گیا، اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی، ہمسائی نے حکیم سے دوا تو لا دی تھی لیکن دوائی کا اثر بھی تو ہوتے ہوتے ہی ہوتا ہے۔ اس دن اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بچوں کے لیے کھانا پکا سکتی ہمسائی نے تینوں وقت کا کھانا انہیں کھلایا اور ساجدہ کے لیے بھی کھانا رکھ گئی۔ اس بیماری میں یہ تنہائی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی تنہائی کے علاوہ بے بسی کا احساس بہت شدید تھا۔ بھائی کو اس نے ہمیشہ گھر سے دور ہی دیکھا تھا شادی کے بعد مشتاق کی بھی یہی روٹین رہی لیکن پھر بھی وہ خود کو تنہا محسوس نہیں کرتی تھی کیونکہ اس کی ماں جیسی بھابی نجمہ ہر اچھے برے وقت میں اس کے ساتھ تھی، یوں تو وہ آج تک نجمہ کے جانے کے غم سے باہر نہ نکل پائی تھی لیکن آج اس یاد میں بھی روز کے مقابلے بہت زیادہ شدت تھی۔ ساجدہ کو وہ دن یاد آیا جب نجمہ دنیا سے گئی تھی اس نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں جیسے اس تصور سے بچنا چاہتی ہو مگر آنکھیں بند کرنے کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا، دو آنسو بڑی خاموشی سے ساجدہ کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے گالوں کو بھگوتے چلے گئے۔ ''اور اگر میں بھی مرگئی تو بچوں کا کیا ہوگا؟'' اس سوال نے اس کی بے چینی کو بڑھا دیا۔

☆......☆

چوہدرائن نے کھانا اور پھل ٹرے میں رکھے اور ٹرے ملازمہ کے ہاتھ میں تھما دی ملازمہ کچن سے نکل رہی تھی کہ تبھی چوہدری کچن میں داخل ہوا۔

''یہ ٹرے کہاں جا رہی ہے؟'' چوہدری کے پوچھنے پر چوہدرائن نے ساجدہ کی بیماری کے بارے میں بتاتے ہوئے کھانا اور پھل بھیجنے کی وجہ بتائی۔ چوہدری کو وہ خاندان کچھ خاص پسند نہ تھا اس لیے اسے اس بات پر بھی اعتراض ہوا اس کا کہنا تھا کہ ساجدہ کا بھائی بشیر اور شوہر مشتاق دونوں مشکوک کردار کے انسان تھے کئی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ جرم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں ایسے لوگوں سے چوہدری کی فیملی کو دور رہنا چاہیے لیکن چوہدرائن کی سوچ کچھ اور تھی۔

''دیکھ چوہدری ساجدہ بن ماں باپ کی ہے یتیموں کا ویسے بھی بڑا حق بتایا ہے اسلام نے، اور پھر وہ دونوں جیسے بھی ہوں ساجدہ ایک اچھی اور شریف عورت ہے، اتنے سالوں سے کسی بھی مرد کے سہارے کے بغیر رہ رہی ہے مگر مجال ہے جو گاؤں میں کسی کو اس کے بارے میں ایک بھی الٹی سیدھی بات کہنے کا موقع ملا ہو، اور ان سب باتوں کو چھوڑ چوہدری یہ سوچ کہ تم اس گاؤں کے چوہدری ہو اور گاؤں کا چوہدری سارے گاؤں کے لیے باپ کی طرح ہوتا ہے آج وہ بیمار بے سہارا پڑی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کا خیال رکھیں'' چوہدری کے اعتراض پر چوہدرائن نے ہر طرح کے دلائل کا ڈھیر لگا دیا تو وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

☆......☆

ملازمہ کچن سے ٹرے لے کر نکلی تو عالیہ اور رانی گاؤں کی کچھ اور بچیوں کے ساتھ صحن میں جامن کے درخت میں پڑے جھولے پر جھولے لے رہی تھیں، ملازمہ کو باہر کی طرف جاتے دیکھ کر عالیہ جھولا چھوڑ کر اس کی طرف دوڑی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' عالیہ نے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے ملازمہ سے پوچھا۔ ملازمہ کے یہ بتانے پر کہ وہ

نواب کے گھر جا رہی ہے عالیہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔
''میں بھی ساتھ چلوں؟'' عالیہ بس یونہی اس سے پوچھ رہی تھی ورنہ وہ تو ملازمہ تھی اس نے تو کبھی اپنے ماں باپ سے بھی کچھ نہیں پوچھا تھا عالیہ ہمیشہ وہی کرتی تھی جو دل میں ٹھان لیا کرتی تھی ابھی بھی یہی ہوا تھا ملازمہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ دواس کے ساتھ چلتی رہی۔ ملازمہ جانتی تھی چوہدری کو نواب کا گھرانہ کچھ خاص پسند نہیں اس لیے وہ بالکل پسند نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ عالیہ نواب کے گھر آئے لیکن اپنی چھوٹی بی بی کی ضد سے بھی اچھی طرح واقف تھی کہ اس نے عالیہ کو گود کھلایا تھا اس لیے خاموشی سے اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

☆......☆

نواب اس وقت اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا تھا اس نے دور سے ہی ملازمہ اور عالیہ کو آتا دیکھ لیا تھا اس لیے اٹھ کر اندر آ گیا ،نواب پر نظر پڑتے ہی عالیہ اس کی طرف دوڑی تھی ملازمہ سنبھل کر چلنے کی تاکید کرتی رہ گئی مگر وہ عالیہ ہی کیا جو کسی کی سن لے، جس وقت وہ نواب کے گھر میں داخل ہوئی اس گھر کا آنگن خالی پڑا تھا وہ بھاگتی ہوئی بڑے کمرے کی طرف گئی وہاں اکرم بیٹھا ساجدہ کے پاؤں دبا رہا تھا ساجدہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی عالیہ نے چاروں طرف دیکھا لیکن نواب کہیں دکھائی نہیں دیا تو سوالیہ نظروں سے اکرم کی طرف دیکھنے لگی۔ اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتا دیا کہ نواب سامنے والے چھوٹے کمرے میں ہے، ملازمہ کی آواز پر ساجدہ اٹھ بیٹھی تھی ملازمہ اسے چوہدرائن کی کہی باتیں بتانے میں لگ گئی اور عالیہ ان کی طرف توجہ دیئے بنا سامنے والے کمرے کی طرف بھاگ گئی وہاں ایک جھلنگا سی چارپائی پر نواب کو بیٹھے دیکھ کر عالیہ نے سکون کا سانس لیا۔
''تم ہمیں آتا دیکھ کے بھاگے کیوں؟'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں پوچھنے لگی۔
''میں کیوں بھاگوں گا میں کیا تم سے ڈرتا ہوں؟'' نواب کو عالیہ کی بات اچھی نہیں لگی تھی عالیہ کو بھی فوراً اس بات کا احساس ہو گیا اس لیے اس نے بات بدل دی اور اسے کھانے کے بارے میں بتانے لگی۔ نواب کو زوروں کی بھوک لگ رہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے اس طرح چوہدرائن کا کھانا بھیجنا اچھا نہیں لگا تھا اور اس نے یہ بات عالیہ سے کہہ بھی دی تھی جس پر لمحہ بھر کو تو عالیہ حیران ہی رہ گئی اس کے خیال میں اس میں برا لگنے والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔
''میری اماں چوہدرائن ہے اور جو چوہدرائن ہوتی ہے نا وہ ایسے ہی سارے گاؤں کے غریب لوگوں کی مدد کرتی ہے'' عالیہ نے اپنی طرف سے بڑی پتے کی بات بتائی۔
''مدد کرتی ہے یا بھیک دیتی ہے'' نواب نے غصے سے سوال کیا۔
''بھیک تو فقیر بابا کو دیتے ہیں۔'' عالیہ نے بڑی معصومیت سے کہا تو غصے میں ہونے کے باوجود نواب کو ہنسی آ گئی وہ نواب کی بات اور اس کا غصہ سمجھنے کے لیے بہت چھوٹی تھی۔
''اچھا تو جب تم بڑی ہو کر چوہدرائن بن جاؤ گی تو تم بھی اپنی اماں کی طرح سارے گاؤں والوں کا خیال رکھا کرو گی۔'' نواب مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا اور جواب میں عالیہ نے زور و شور سے ہاں میں گردن ہلا دی اس کے اس انداز پر وہ پھر سے ہنس پڑا۔
''اب تم ناراض تو نہیں ہو'' اسے ہنستا دیکھ کر عالیہ کی یہ سوال کرنے کی ہمت ہو گئی تھی۔
''ناراض تو میں ہوں لیکن تم سے نہیں تمہارے ابا سے، یاد نہیں ہے اس دن کیسے تمہارے ابا نے مجھے اور اماں کو بلا کر ڈانٹا تھا'' نواب نے اس دن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔
''لیکن تم نے بھی تو صادق کا سر کھول دیا تھا'' عالیہ نے نواب کو اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہا لیکن وہ اڑ گیا کہ اس نے جو کیا تھا ٹھیک کیا تھا اگر صادق اس کے باپ کے بارے میں غلط سلط نہ بولتا تو نواب بھی اسے نہ مارتا۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو صادق ہے ہی بہت خراب لڑکا وسیم بھیا بھی کہہ رہے تھے کہ پورا لوفر ہے لوفر'' عالیہ نے وسیم کے الفاظ من و عن دہراتے ہوئے نواب کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی تو نواب کو اچانک یاد آیا کہ وسیم نے بھی تو انہیں ڈانٹ کر اپنے گھر سے بھگا دیا تھا اب اس بات کا عالیہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''لیکن میں نے تو تمہیں اپنی گڑیا دکھائی تھی اور وسیم بھائی نے تمہیں ڈانٹا تو میں بہت روئی بھی تھی'' وہ بے حد معصومیت سے اس دن کی بات بتانے لگی اس کی یہ بات نواب کے دل کو لگی اور اس نے بھی ناراضگی ختم کر لی۔

''تو اب تم مجھے اپنے ابا سے وہ ساری گڑیا منگوا دو گے نا؟'' نواب کو مانتے دیکھ کر وہ سیدھا اس بات پر آئی جس نے اتنے دن سے اسے پریشان کر رکھا تھا اور جواب میں نواب نے اسے گڑیا منگوا کر دینے کا وعدہ کیا تو وہ نئے سرے سے خوش ہو گئی تبھی ملازمہ اسے آواز دینے لگی تو عالیہ نواب کو گڑیا منگوانے کی تاکید کرتی ملازمہ کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی۔ عالیہ کو بھی کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس کے کمرے میں ڈھیر سارے کھلونے تھے چوہدری جب بھی شہر جاتا وہاں سے بھی اس کے لیے کئی چیزیں لایا کرتا لیکن بچوں کا دل کھلونوں سے بھر جائے ان کے دل سے کھلونوں کی ہوس چلی جائے تو وہ بچے ہی کیوں کہلائیں۔ اور پھر بولنے والی، چلنے والی، ایسی گڑیا تو کبھی اس کے ابا بھی نہ لائے تھے ہاں مگر اسے یقین تھا کہ نواب کا ابا ایسی گڑیا ضرور لے آئے گا کیونکہ وہ بہت دور بہت بڑے شہر میں رہتا تھا اور اماں کہتی تھیں کہ بڑے شہروں میں تو سب کچھ مل جایا کرتا ہے۔

☆......☆

اسی شام مشتاق اور اسلم اپنے گھر پہنچ گئے تھے ان کے آنے پر ساجدہ اور بچے بہت خوش تھے لیکن وہ دونوں ساجدہ کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گئے تھے۔ آخر دونوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے دن ہی ساجدہ کو قریب کے شہر میں ڈاکٹر کو دکھائیں گے تاکہ وہ جلد از جلد ٹھیک ہو جائے۔ وہ نواب اور اکرم کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لائے تھے دونوں بچے بہت شوق سے کھلونے دیکھ رہے تھے لیکن سارے کھلونے دیکھنے کے بعد نواب کی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی ان سب کھلونوں میں بہت اچھی اچھی چیزیں تھیں لیکن گڑیا ایک بھی نہیں تھی۔

''ابا تم گڑیا نہیں لائے؟'' آخر بے چین ہو کر نواب نے پوچھ ہی لیا اور اس کے اس سوال پر مشتاق کے ساتھ ساتھ بشیر اور ساجدہ بھی ہنس پڑے۔

''لو جی اب ہمارے بیٹے گڑیا سے کھیلیں گے۔'' مشتاق نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ نواب کو اس کی بات بری تو لگی لیکن کچھ کہے بنا وہاں سے اٹھ کر اپنے چھوٹے کمرے میں آ گیا اب وہ مشتاق کو کیا بتاتا کہ اسے وہ گڑیا اپنے لیے نہیں بلکہ عالیہ کے لیے چاہیے تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود شہر جائے گا اور عالیہ کے لیے ہر طرح کی ڈھیر ساری گڑیاں لائے گا یہی سب سوچتے ہوئے وہ وہیں لیٹا لیٹا سو گیا۔

☆......☆

اسلم اکرم کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا اس کمرے میں ساجدہ اور مشتاق اکیلے رہ گئے مشتاق ساجدہ کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا حال پوچھنے لگا۔

''شکر ہے آپ میری زندگی میں گھر آ گئے میں بچوں کے لیے بہت پریشان تھی کہ میرے بعد ان کا کیا ہوگا۔'' ساجدہ نے محبت سے مشتاق کا چہرہ تکتے ہوئے کہا تو ایسی بات کرنے پر مشتاق نے اسے نرمی سے ڈانٹ دیا لیکن نہ جانے کیوں ساجدہ کو لگ رہا تھا کہ اب اس کا وقت قریب آ گیا ہے لیکن مشتاق کے ناراض ہونے کے خیال سے اس نے دوبارہ یہ بات اس سے نہیں کی اس رات دونوں میاں بیوی رات گئے تک دکھ سکھ کہتے رہے تھے، اتنے سالوں کی باتیں تھیں ایک رات میں کہاں ختم ہونے والی تھیں۔ ساجدہ کو بولنے سے تھکن ہونے لگی تھی وہ مشتاق کے منع کرنے کے باوجود مسلسل بول رہی تھی آخر جب وہ بالکل ہی نڈھال ہو گئی تو اس نے مشتاق کے سینے پر سر رکھ کر سکون سے آنکھیں موند لیں اور مشتاق نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں سمیٹ لیا۔

☆......☆

آنے والی صبح اس خاندان کے لیے بے حد تاریک تھی۔ صبح کو مشتاق کی آنکھ کھلی تو وہ بستر سے اٹھ گیا، وہ نہا کر باتھ روم سے باہر آیا تو اسلم بھی جاگ گیا تھا لیکن ساجدہ اور دونوں بچے ابھی تک سو رہے تھے انہیں اسی طرح سوتا چھوڑ کر وہ دونوں گاؤں کی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد جب وہ گھر لوٹے تو آنگن میں دھوپ اتر آئی تھی دونوں لڑکے جاگ گئے تھے لیکن ساجدہ ابھی تک سو رہی تھی۔ پریشان ہو کر دونوں ساجدہ کے کمرے کی طرف دوڑے اور چیک کرنے پر پتا

چلا کہ ساجدہ کی روح نہ جانے کب اس دنیا کو خدا حافظ کہہ کر دوسری دنیا کی طرف سفر اختیار کر چکی تھی۔ اس اطلاع پر بچوں نے رونا شروع کر دیا رونے کی آوازیں سن کر آس پڑوس کی عورتیں بھی آ گئیں اس گھر میں تو کوئی عورت تھی نہیں اس لیے محلے کی عورتوں نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ مشتاق غم سے نڈھال تھا لیکن اسے دونوں بچوں کو بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا ان کا حال بہت برا تھا ماں کو کھو کر دونوں روئے چلے جا رہے تھے انہیں چپ کراتے ہوئے مشتاق نے خود بھی کتنی بار چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھے تھے کہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے ہم مرد کو انسان نہیں سمجھتے مرد کا رونا اور پھر مشتاق جیسے مرد کا رونا سماج کے لیے کسی بھی طرح قابل قبول نہ تھا آنسو مشتاق کی مردانگی کے لیے طعنہ اور گالی تھے۔ ایسے میں باہر کے سب انتظامات اسلم کو ہی دیکھنے پڑ رہے تھے اکلوتی لاڈلی بہن جس کو اس نے بہن سے زیادہ بیٹی سمجھا تھا آج یوں اچانک اسے چھوڑ کر چلی جائے گی اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ خود بھی بہت غم اور شاک میں تھا لیکن کسی کو تو یہ سب سنبھالنا تھا نا۔

☆......☆

دیکھتے ہی دیکھتے گھر عورتوں سے بھر گیا تھا گاؤں میں کون تھا جو ساجدہ کے کردار اور اخلاق کی وجہ سے اس کی عزت نہیں کرتا تھا، چوہدرائن خود تو نہ آئی تھی لیکن اس نے اسلم کو کہلوا دیا تھا کہ ساجدہ ان کے لیے بیٹی جیسی تھی اس کے کفن دفن کے انتظام سے لے کر کڑوی روٹی تک سب چوہدری کی طرف سے ہوگا اور اسلم چاہتے ہوئے بھی ان کے خلوص کو ٹھکرا نہیں پایا تھا کہ ساجدہ اکثر چوہدرائن کی تعریفیں کیا کرتی تھی وہ جانتا تھا چوہدرائن نے آخری دنوں میں ساجدہ کا بڑا ساتھ دیا تھا تو اب ان کی بات نہ ماننے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

☆......☆

ساجدہ کا جنازہ اٹھا تو عورتوں کے لیے بچوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا وہ دوڑ دوڑ کر ساجدہ کی چارپائی کے پائے سے لپٹے جاتے تھے۔ مرد جیسے تیسے ساجدہ کو لے کر گھر سے نکلے اور کلمہ پڑھتے ہوئے قبرستان کی طرف چل پڑے۔ قبرستان کے باہر ہی جنازہ گاہ بھی جہاں نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ چوہدری اور اس کے دونوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے تقریباً ہر گھر سے کوئی نہ کوئی اس نماز جنازہ میں ضرور شریک ہوا تھا اس لیے جماعت میں لوگ بہت زیادہ تھے۔ ساجدہ کو قبر میں اتارنے کے لیے اسلم آگے بڑھا تھا اور جب اوپر مٹی ڈالنے لگے تو اسلم اور مشتاق کے ہاتھ کانپ رہے تھے دونوں کے دل کی حالت بہت بری تھی۔ مٹی کو مٹی کے سپرد کر کے واپس لوٹتے سمے ان کے قدم بے جان تھے۔

☆......☆

اس رات بچوں کو سلانے کے بعد مشتاق اور اسلم دیر گئے تک ساجدہ کی باتیں کرتے ہوئے اسے یاد کرتے رہے تھے۔ مشتاق کو یہ غم تھا کہ وہ ساجدہ کو وہ زندگی نہیں دے سکا جو اس کا حق بنتی تھی، اور پچھلے کچھ سالوں میں خاص طور پر بیماری کے دنوں میں ساجدہ نے کتنے مشکل دن گزارے تھے دونوں کو اس بات کا بخوبی احساس تھا دونوں کے دلوں میں کئی دکھ کئی پچھتاوے تھے جو ان کے دل کو بے قرار کیے ہوئے تھے۔ ساجدہ کی زندگی میں جن باتوں پر ان کا کبھی دھیان بھی نہیں گیا تھا آج وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یاد آئے جا رہی تھیں۔ بہت دیر بعد دونوں اپنے اپنے بیٹے کے ساتھ سونے کے لیے لیٹ گئے، اسلم دن بھر کی بھاگ دوڑ سے تھکا ہوا تھا اور وہ کہتے ہیں نا کہ نیند تو کانٹوں کے بستر پر بھی آ جاتی ہے تو ایسا ہی ان کے ساتھ ہوا تھا آخر دونوں نیند کی وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

☆......☆

اگلی صبح بھی اپنے ساتھ بے حد اداسی لے کر آئی تھی ساجدہ کے بنا گھر خالی خالی لگ رہا تھا حالانکہ کتنے دنوں سے وہ اپنے بستر تک محدود تھی لیکن عورت کی گھر میں موجودگی ہی گھر کو گھر بناتی ہے اب جب کہ ساجدہ چلی گئی تھی تو ان کا گھر صرف مکان بن کر رہ گیا تھا۔ اگلے دن تسبیح وغیرہ پڑھنے کے لیے عورتیں مرد آتے رہے تھے، وہ دن بھی اسی طرح کی مصروفیات کی نظر ہو گیا، تیسرے دن رسم قل ادا کرنے کے بعد انہوں نے واپسی کا سوچا تو بچوں کا مسئلہ اٹھا ساجدہ کے جانے کے بعد اب بچوں کو گاؤں میں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے اس ماحول سے دور رہیں جس میں وہ دونوں رہتے تھے ان کی اور ان کی بیویوں کی بھی یہی خواہش تھی کہ نواب اور اکرم پڑھ لکھ جائیں یہاں بھی دونوں

گاؤں کے سکول میں پڑھنے کے لیے جایا کرتے تھے۔لیکن اب صورت حال کچھ ایسی بن گئی تھی کہ بچوں کو ساتھ لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔دونوں نے مشورے سے یہی فیصلہ کیا کہ بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے جایا جائے۔بچے ابھی اس فیصلے سے ناواقف تھے بلکہ انہیں ان باتوں کا دھیان ہی نہیں تھا ابھی تو وہ ماں کو کھونے کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے اور ماں کے بنا زندگی گزارنا سیکھ رہے تھے،اور ماں کے بنا زندگی گزاری تو جا سکتی ہے مگر زندگی جینا بھلا کہاں ممکن ہوتا ہے مگر جیسے تیسے زندگی تو چلتی ہی رہتی ہے ان کی بھی چل رہی تھی۔

☆......☆

بچوں کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرنے کے بعد اب ان کی وہاں رکنے کی کوئی وجہ نہیں رہ گئی تھی مشتاق اور اسلم نے دونوں بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ اب وہ ان کے ساتھ چل کر رہیں گے بچے اس اطلاع سے تھوڑا بہل گئے تھے اور ان کے ساتھ جانے کی تیاریوں میں لگ گئے تھے،سامان جو ساتھ لے جانے قابل تھا کچھ زیادہ نہیں تھا صرف بچوں کے کپڑے جوتے اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں ہی تھیں باقی کا سامان ایک کمرے میں رکھ کر اسے تالا لگا دیا گیا اور اس طرح جانے کی تیاری مکمل ہوگئی اگلے دن صبح ان کا گاؤں سے جانے کا ارادہ تھا اس رات اس گھر میں چاروں نفوس جاگتے رہے تھے لیکن سب اپنی اپنی سوچوں میں اتنا گم تھے کہ جاگتے رہنے کے باوجود کوئی بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا،سب کے ذہن گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہے تھے،دل یادوں سے بوجھل تھے اور آنکھوں میں آنسو آئے جا رہے تھے۔وہ ایک مشکل رات تھی بے حد مشکل رات ایک بھائی نے اپنی بہن کھوئی تھی ایک شوہر نے اپنی محبوب بیوی اور دو بچے اپنی ماں سے جدا ہو گئے تھے نہ جانے قدرت کا یہ کیسا اصول ہے دلوں کو رشتوں اور محبتوں میں جکڑ کر ایک دوسرے سے دور کر دیتے میں جانے اس کی کیا مصلحت ہے یہ سب باتیں ہم انسانوں کی سمجھ سے بہت اوپر کی ہیں ہم اس پر سوچ سکتے ہیں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن آخر میں بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں جو اللہ کی مرضی یا اللہ جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے اور یہ بات ٹھیک بھی تو ہے خدا جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔

☆......☆

وہ رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی صبح اٹھتے ہی نواب نے کپڑے کی وہ پوٹلی اٹھائی جس میں اس نے کل اپنے سارے کھلونے باندھے تھے اور عالیہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔عالیہ اسے اپنے گھر کے باہر ہی مل گئی تھی نواب کے ہاتھ میں پوٹلی دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف آئی تھی شاید اسے لگا تھا کہ وہ وعدے کے مطابق اس کے لیے گڑیا لے آیا ہے کیونکہ اسے پتا چل گیا تھا کہ نواب کا باپ لوٹ آیا ہے۔عالیہ نے بہت کوشش بھی کی تھی کہ کسی طرح نواب کے گھر جائے لیکن اسے اس کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

''یہ کیا ہے؟''عالیہ نے اس کے پاس آتے ہوئے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا تو نواب نے خاموشی سے وہ پوٹلی عالیہ کی طرف بڑھا دی اور اسے بتایا کہ اس پوٹلی میں کوئی گڑیا نہیں ہے لیکن اس میں جو کچھ بھی ہے وہ اب عالیہ کا ہے۔نواب نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے اس بات پر عالیہ کی آنکھوں میں نمی پھیلی تھی وہ نواب کو جانے سے روکتی رہی لیکن ظاہر ہے وہ نہیں رک سکتا تھا عالیہ کو اللہ حافظ کہہ کر وہ چوہدرائن سے ملنا چاہتا تھا لیکن اسے رونا آرہا تھا اور وہ اب کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ حویلی کے اندر جانے کی بجائے وہاں سے اپنے گھر واپس آگیا جہاں سب اس کے منتظر تھے۔

☆......☆

عالیہ نواب کے جانے کے بعد بھی دیر تک روتی رہی تھی گھر والوں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا اور جب چوہدرائن نے عالیہ سے پوٹلی کے متعلق سوال کیا تو اس نے روتے روتے ساری بات بتادی چوہدرائن نے پوٹلی کھول کر دیکھی تو اس میں کھلونے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کسی بھی بچے کے لیے اس کے کھلونے اس کا خزانہ ہوا کرتے ہیں دنیا کا سب سے بڑا سب سے قیمتی بلکہ انمول خزانہ اور جب وہ اپنا یہ خزانہ کسی کے حوالے کر دے تو یہ اس کے خلوص کے اظہار کی انتہا ہوا کرتی تھی۔چوہدرائن کے نازک دل پر اس واقعے نے بہت گہرا اثر ڈالا تھا اس نے ملازمہ کو نواب کے گھر بھی بھیجا تھا لیکن

اس وقت تک نواب اپنے باپ اور ماما کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

آج بھی ڈرائیونگ سیٹ پر اسلم بیٹھا ہوا تھا اور برابر کی سیٹ پر مشتاق جبکہ دونوں بچے پچھلی سیٹ پر بیٹھے اداس نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ چاروں خاموش تھے کبھی کبھار مشتاق اور اسلم کے درمیان کسی فقرے کا تبادلہ ہو جاتا تو ہو جاتا لیکن بچے بالکل خاموش تھے وہ گاؤں سے کافی دور نکل آئے تھے تب اچانک ان کی گاڑی کے پیچھے ایک موٹر سائیکل نمودار ہوا، اور کوئی وقت ہوتا تو اسلم ضرور چوکنا ہو جاتا لیکن اس وقت اس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا اس لیے اسلم نے اس بات پر بالکل بھی دھیان نہیں دیا اسلم نے اس وقت بھی اس موٹر سائیکل پر دھیان نہیں دیا جب وہ پسنجر سیٹ والی سائیڈ پر گاڑی کے عین برابر آ گیا لیکن وہ موٹر سائیکل کھڑکی سے باہر دیکھتے مشتاق کی نظروں میں آ گیا تھا دونوں موٹر سائیکل سوار بھی اسے کچھ مشکوک لگے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں بشیر سے کچھ کہہ پاتا موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے شخص نے اپنا ہاتھ مشتاق کی طرف کیا اور گولیاں چلا دیں، یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مشتاق کی چھاتی سے بہتا لہو گاڑی کی سیٹ بھگو گیا تھا۔ اسلم کو اس وقت صرف ایک ہی خیال آیا تھا کہ اسے جلد از جلد اس موٹر سائیکل کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہیے۔ پستول اس کے پاس بھی تھی لیکن اس وقت اس کے لیے ان انجانے دشمنوں پر گولی چلانے سے زیادہ اہم تھا بچوں اور مشتاق کو کسی محفوظ مقام تک لے جانا اس نے فل سپیڈ میں گاڑی دوڑا دی اور موٹر سائیکل سواروں سے جان چھڑانے کے لیے ان پر فائرنگ بھی کی۔ کچھ دیر وہ ان کی گاڑی کا تعاقب کرتے رہے لیکن پھر اسلم کی فائرنگ کی وجہ سے انہوں نے گاڑی کا پیچھا چھوڑ دیا یا شاید ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور اب گاڑی کا پیچھا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اچھا طرح اطمینان ہونے کے ساتھ ہی اسلم نے گاڑی روک دی تھی اور جلدی سے اتر کر مشتاق کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے گاڑی سے نیچے سڑک پر لٹا دیا تھا وہ اس کے بہتے لہو کو روکنے کا کچھ انتظام کرنا چاہتا تھا لیکن مشتاق ان سب باتوں سے بہت دور جا چکا تھا دونوں بچے بھی گاڑی سے اتر آئے تھے اور اب خوفزدہ نظروں سے کبھی خون میں لت پت مشتاق کو تو کبھی زرد پڑتے چہرے کے ساتھ سڑک پر بیٹھے اسلم کو دیکھ رہے تھے۔

☆......☆

اسلم نے مشتاق کو بازوؤں میں اٹھا کر واپس اس کی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے سیٹ بیلٹ باندھ دی۔ اور بچوں کو پیچھے بٹھاتے ہوئے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس نے بچوں کو یہی بتایا تھا کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے مشتاق بے ہوش ہو گیا ہے اور وہ اسے لے کر ہسپتال جا رہے ہیں جہاں ڈاکٹر مشتاق کو بالکل ٹھیک کر دیتے۔ وہ اس جھوٹ سے بہلے تھے یا نہیں لیکن انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اسلم کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا ایک کیا سے کیا ہو گیا تھا گاڑی چلاتے ہوئے اس کی نظریں بار بار پسنجر سیٹ کی طرف اٹھ جاتیں اور ہر بار مشتاق کو خون میں ڈوبا دیکھ کر بشیر کی آنکھوں سے جھلکتے غم و غصے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے حد تیز ڈرائیونگ کرتا ہوا بستی کی طرف بڑھتے جا رہا تھا کہ اب کسی ہسپتال میں جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دونوں لڑکے سہمے ہوئے اور پریشان تھے۔ خوف کی شدت سے رونا بھول کر وہ ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی صورتیں تکے جا رہے تھے۔

☆......☆

اسلم ان راستوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا اس نے بستی تک پہنچنے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا تھا جس پر شاذ و نادر ہی کوئی گاڑی گزرا کرتی تھی اور وہاں پولیس سے ٹکراؤ کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور کسی سے بھی مڈبھیڑ ہوئے بنا وہ بستی کے آخری سرے پر موجود اصطبل تک پہنچ گیا تھا۔ عابد گھوڑوں کے آگے چارہ ڈال رہا تھا گاڑی کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اسلم کو دیکھ کر اپنا کام وہیں چھوڑ کر باہر آ گیا لیکن پسنجر سیٹ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا پہلی نظر میں ہی وہ جان چکا تھا کہ مشتاق اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' عابد کی زبان سے بس یہی جملہ ادا ہو پایا تھا۔

''بعد میں بتاتا ہوں پہلے ہمارے سفر کے لیے گھوڑوں کا انتظام کرو'' اسلم کی بات پر عابد نے حیرت سے اسے دیکھا تھا وہ اس وقت عابد کو کوئی پاگل دیوانہ لگ رہا تھا اگر اس کی بات کا مطلب وہی تھا جو کہ عابد سمجھ رہا تھا تو وہ واقعی پاگل ہو چکا تھا۔ وہ ایک لاش کو گھوڑے پر لاد کر لے جانے کی بات کر رہا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ تم اس لاش کو۔'' عابد نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسلم نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی مشتاق کے لیے لاش کا لفظ ہی اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا اگر چہ یہی حقیقت تھی لیکن ہر حقیقت قبول کرنا آسان نہیں ہوا کرتا۔

''جو کہا ہے وہ کرو'' اسلم کا انداز اور الفاظ اتنے قطعی تھے کہ عابد کو کچھ اور کہنے کی جرأت نہیں ہو سکی تھی، اس نے خاموشی سے دو گھوڑے نکال کر اس کے حوالے کر دیے تھے اسلم نے ایک گھوڑے پر دونوں لڑکوں کو سوار ہونے میں مدد دی اور پھر گاڑی کی طرف بڑھا، مشتاق جیسے کیم شحیم انسان کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھانا اتنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا لیکن عابد کی مدد سے اس نے یہ کام کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی جنگل میں چھپے اس کے ساتھیوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دو گھوڑے جنگل میں بڑھتے چلے جا رہے تھے جن میں ایک پر دس اور بارہ سال کی عمروں کے دولڑکے تھے اور دوسرے پر اسلم خون میں لت پت مشتاق کو اپنے آگے بٹھائے ہوئے بیٹھا تھا اور ظاہر ہے ان کے گھوڑوں کا رخ اڈے کی طرف تھا۔

☆......☆

جس وقت اسلم دونوں لڑکوں اور مشتاق کی لاش کے ہمراہ اڈے پر پہنچا سب کے سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے وہ سب جاننا چاہتے تھے کہ مشتاق کے ساتھ کیا ہوا تھا کسی نے سردار کو بھی ان کی آمد کی خبر کر دی تھی وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ اسلم نے ساری بات سردار کے گوش گزار کر دی۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کس کا کام ہے؟'' سردار نے اسلم سے پوچھا۔

''یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن شاید یہ وہی اسلم کیس والے لوگوں کا کام ہے شاید وہ مشتاق کے باہر آنے کے منتظر تھے اور ہمارے پیچھے تھے موقع ملتے ہی انہوں نے اپنا وار کر دیا'' اسلم نے اپنا اندازہ بتایا تو سردار پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگا۔

''جلد از جلد پتا کرو کہ یہ کس کا کام ہے اور بدلے کے لیے تیار رہو'' سردار نے اپنے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بنا حکم دیا۔

''میں اپنے باپ کے قاتل سے خود انتقام لینا چاہتا ہوں۔'' نواب کے اس فقرے پر سب نے گردنیں موڑ کر دس سال کے اس خوبصورت بچے کی طرف دیکھا تھا جس کی طرف وہ سب ابھی تک صرف ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حیرت کے پہلے تاثر کے بعد سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی لیکن نواب کی اس بات پر سردار نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا تھا، جتنی دیر سردار اسے دیکھتا رہا تھا اتنی دیر نواب سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا تو سردار کے چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' سردار نے دلچسپی سے نواب کی طرف دیکھتے ہوا اس سے پوچھا تھا۔

''میرا نام نواب ہے نواب مشتاق'' نواب نے بنا جھجکے اپنا تعارف کروایا تھا۔

''ٹھیک ہے نواب اپنے باپ کے قتل کا بدلہ تم خود ہی لو گے لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ ٹریننگ لینی ہوگی کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟'' سردار کے اس سوال پر نواب کا جواب ہاں میں تھا۔

''اسلم آج سے نواب تمہارے حوالے اسے اچھے سے ٹرینڈ کرو'' نواب کا جواب ملتے ہی سردار اسلم سے مخاطب ہوا تھا جو حیرت اور پریشانی سے اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا اسلم اور باقی سب کا خیال یہ تھا کہ سردار کو ایک بچے کی بات کو اتنی سنجیدگی سے لیتے ہوئے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ سردار کا یہ فیصلہ اور نواب پر اعتماد کس حد تک ٹھیک تھا۔

**اس سنسنی خیز ناول کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمایئے**



پلیٹ فارم نمبر کی پہلی خصوصی کہانی

# پلیٹ فارم سے جیل تک



جاوید راہی

**اُس مجرم کی کہانی، جس کی سفاکیت کی داستان، پلیٹ فارم سے شروع ہوئی تھی**

حیدر آباد سے امجد بوبی۔ سی۔ او بی بی سی کرائم نیوز کی وساطت سے مجھے معلوم ہوا کہ انتہائی سفاک ٹارگٹ کلر عامر عرف عمر رہائشی شکار پور جس نے ایک لڑکی سمیت آٹھ افراد کو قتل کر ڈالا تھا اور جس کے خلاف 2013ء سے مختلف تھانوں میں درجنوں مقدمات درج تھے۔ مفروری کے دوران ایس ایچ او تھانہ پھلیلی رانا پرویز اختر کو مخبری ہوئی کہ عامر عرف عمر ڈکیتی قتل و غارت گری کی نیت سے جڑیل شاہ کالونی کے آس پاس دیکھا گیا ہے۔ انسپکٹر رانا پرویز وقت ضائع کیے بغیر ہمراہ پولیس پارٹی کے کالونی جڑیل شاہ پہنچا تو عامر عرف عمری لوٹ مار میں مصروف تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ جوابی فائرنگ سے عامر شدید زخمی ہو گیا جس کو اسلحہ سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ عابدہ قائم خانی بیورو چیف سندھ سے کافی معلومات لے کر میں نے تھانہ پھلیلی جانے کا پروگرام بنایا اور لاہور سے حیدر آباد کے لیے بزنس کلاس میں ٹکٹ بنوایا۔

دوسرے دن چار بجے سے پہلے اسٹیشن جانا تھا رات مکمل تیاری کر لی اور تقریباً دو بجے دوپہر اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ گاڑی کا پتا کیا، قرا قرم ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔

ہم لوگ طویل انتظار کو اب اپنی زندگی کا حصہ تصور کرنے لگے ہیں۔

اپنا مختصر سامان سنبھالے میں فسٹ کلاس کے ویٹنگ روم کے اندر آیا تو وہاں فلم کا یونٹ قیام پذیر تھا۔ فلمی کے لباس میں ریمبو صاحب اور دیگر لوگ مکمل قابض تھے۔ جن لوگوں کے لیے یہ ویٹنگ روم مختص تھا وہ اِدھر اُدھر کھڑے تھے جبکہ شوٹنگ والے دو دو سیٹوں پر جوتوں سمیت پاؤں پسارے خراٹے بھر رہے تھے۔ پورے ویٹنگ روم میں چرس بھرا دھواں سرگرم عمل تھا۔ خواتین اور بزرگ زمین پر اپنے اپنے سامان کی حفاظت کے لیے باامر مجبوری گاڑی کے انتظار میں تھے۔

شاید وہ کوئی انتظامی امور کا ورکر تھا۔ چائے کی بڑی سی کیتلی لیے اٹھا تو میں نے خالی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے قدم بڑھائے مگر فوراً دوسرے نے اپنی ٹانگیں جوتوں سمیت اس پر پھیلا دیں۔ میں کھسیانا سا ہو کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ میرے سمیت کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ کوئی احتجاج کرے۔ ریلوے انتظامیہ اور فلم میکر کے پاس شاید وفاقی وزیر صاحب کی طرف سے کوئی ایسا حکم ہو یا باقاعدہ محکمہ ریلوے سے فلم کی شوٹنگ کے لیے فسٹ کلاس ایئر کنڈیشنڈ



ویٹنگ روم کرایہ پر اُٹھا رکھا ہو۔ ایک قلی سے پتا چلا کہ یہ شوٹنگ کئی دنوں سے جاری ہے اور مسافر شدید گرمی میں باہر دروازے میں زمین پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہیں۔ بہر کیف اس صورت حال سے نپٹنے کی بجائے گاڑی کے انتظار میں ہی اکتفا کیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی پلیٹ فارم پر رُکی اور میں اپنا سامان لے کر ٹرین میں سوار ہو گیا۔ بزنس کلاس میں قدم رکھتے پہ جسم ٹھنڈی ہوا میں نہا گیا۔ ویٹنگ روم کی بک بک سے جو بی پی شوٹ کر گیا تھا اب اعتدال میں آنے لگا۔ پورے کیبن میں ہم تین لوگ تھے۔ گاڑی چل پڑی اور میں اپنے مشن کے بارے میں سوچنے لگا۔

بہت اچھی سروس تھی، کچھ دیر باہر کے مناظر میں کھویا رہا پھر تکیہ اور کمبل لے کر اوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ کوئی بڑا اسٹیشن تھا جہاں ٹرین رُکی تھی باہر نکلا تو دیکھا کہ سکھر اسٹیشن تھا۔ بہت ساری آوازیں مگر ماحول پھیکا پھیکا۔

حیدر آباد پہنچ کر میں نے اپنا سامان سنبھالا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ مجھے تلاش تھی کسی ایسے شخص کی جو مجھے پھلیلی کا صحیح راستہ بتا سکتا۔ یہ کام ایک بزرگ رکشہ ڈرائیور نے کر دیا اور مجھے بھاؤ تاؤ کے بغیر اپنے رکشہ میں بٹھا کر پھلیلی کی طرف چل پڑا۔

سفر کی تھکاوٹ اور ہلکی بھوک نے مجھے بے چین کر دیا۔ بابا جی نے اپنا نام شاکر علی بتایا تھا۔ میں نے انہیں مخاطب کرتے کہیں سے چائے وغیرہ کے لیے کہا۔ ایک چھوٹے سے ڈھابے پر اس نے رکشہ روکا میں نے اُتر کر آرڈر دیا اور باہر کھلے آسمان کے نیچے پڑے تخت پوش پر آ بیٹھا۔ بابا جی کو بھی بیٹھنے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد پراٹھے، انڈے کا آملیٹ اور چائے

آ گئی جو ہم نے ختم کرتے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ پھلیلی تھانہ حیدر آباد کے اندر ہی تھا۔ پھلیلی تھانہ پہنچ کر ایس ایچ او سے رابطہ ہوا جنہوں نے کافی حد تک راہنمائی کی اور مجھے عامر عرف عمری تک رسائی کروادی۔

☆......☆

عمری انتہائی نگرانی میں زیرِ علاج تھا۔ پہلے تو اس نے کوئی بھی سوال جواب کرنے سے خاموشی اختیار کر لی پھر میرے سمجھانے پر اور اپنی شناخت دکھانے پر گفتگو کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔

''عامر تم خود ہی شروع کرو اپنی داستان، میں توجہ سے سنتا ہوں۔'' میں نے لکڑی کا سٹول کھینچ کر اس کے قریب کرتے کہا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''میں شروع سے محنتی تھا، گھر والوں نے مجھے اسکول داخل کروا دیا۔ میں دل لگا کر محنت سے پڑھتا تھا مگر کوئی بات میرے پلے نہیں پڑتی تھی اور میں پڑھائی سے اُکتا گیا۔ اسکول جاتا اور حاضری کے بعد آنکھ بچا کر نکل بھاگتا، آخر کب تک۔۔۔ گھر والوں کو میری اس حرکت کی خبر ہوگئی اور مجھے گھر سے کافی سزا ملی۔ رات تو جوں توں کر کے کاٹی، صبح اسکول کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ رات بھر ذہن میں بنایا ہوا پلان اب پوری طرح میرے رُوبرو تھا۔ بس اب اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتے میں نے اسکول بیگ دیوار سے دوسری طرف اچھالتے خود کو کتابوں کے بوجھ سے آزاد کیا اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کوئی پتا نہیں تھا کہ میری منزل کیا ہے؟ بس جانا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ لوگ اُتر چڑھ رہے تھے میں بھی زیادہ رش والے ڈبے میں گھس گیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ کراچی سٹی اسٹیشن پر سارے لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ میں اکیلا ایک طرف بیٹھا اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا رہا پھر ہمت کر کے اس طرف چل پڑا جہاں کئی بوگیاں بے ترتیب رُکی ہوئی تھیں مگر ڈبوں میں نقل و حرکت موجود تھی۔ کبھی کبھار کوئی باہر جھانک کر جائزہ لیتا اور پھر چہرہ اندر گم ہو جاتا۔ میں دو تین ڈبوں کے قریب سے گزر کر باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ میرے کان میں آواز گونجی۔

''اوئے کیا بات ہے؟''

میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا تو ٹرین کے ڈبے کے داخلی گیٹ میں ایک آدمی مجھ سے مخاطب تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا بھاگ اُٹھوں مگر پھر یہ خیال جھٹک کر میں واپس پلٹتا ہوا اس ڈبے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اوئے کدھر جانا ہے؟'' اس بار میں نے اس آدمی کا جائزہ لیتے جواب دیا۔

''باہر کی طرف جانا ہے۔'' جواباً میں نے اِدھر اُدھر جائزہ لیتے اس کی بات کا جواب دیا۔

وہ ڈبے سے اُتر کر نیچے میرے قریب آ کھڑا ہوا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بغیر ٹکٹ آئے ہو؟'' جواباً میں نے دھڑلے سے سر ہلا دیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''شکار پور۔'' میں نے بغیر جھوٹ بولے اُسے سچ سچ بتا دیا۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک دوسری جانب سے پولیس کے کئی اہلکار نمودار ہوئے۔ ڈبوں سے کئی لوگ بھاگم بھاگ برآمد ہوئے۔ مجھ سے باتیں کرنے والا بھی ایک طرف بھاگ پڑا اور میں بھی گھبرا کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ کچھ تو پولیس نے پکڑ لیے اور ہمارے سمیت کئی اِدھر اُدھر نکل گئے۔

☆......☆

وہ ایک ڈھابہ نما ہوٹل تھا۔ زمین پر چٹائیاں پڑی تھیں، لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں وہ بیٹھ گیا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کھانا کھاؤ گے؟''

بھوک تو مجھے بھی شدید تھی مگر میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کھانے کا کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا ''پولیس کا چھاپہ تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''ڈبوں میں جوا ہوتا ہے۔ پہلے والا انچارج

بدل گیا ہے۔ نیا آنے والا کچھ روز تک ٹھیک ہو جائے گا۔" میرے لیے یہ سب کچھ ناسمجھ میں آنے والا معاملہ تھا۔ اس لیے میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو نا؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہاں کوئی رشتہ دار ہے؟"

"نہیں۔" میں نے نظریں نیچی کرتے جواباً بتایا۔

"تو کہاں جاؤ گے؟"

"پتا نہیں۔ جہاں مقدر لے جائے۔"

"اچھا تم کھانا کھاؤ" اس نے سالن کی پلیٹ میرے آگے سرکاتے کہا اور خود بھی کھانے میں مصروف ہو گیا۔

چائے آگئی تو اس نے میرا نام دریافت کیا۔

"عامر۔" میں نے اپنا نام بتایا۔

"میرا نام ممتاز ہے عرف عام میں مِمّی کے نام سے مشہور ہوں۔" اس نے چائے کا کپ اپنے ہونٹوں کو لگاتے اپنے بارے میں بتایا۔

"گھر سے بھاگے کیوں ہو؟"

"پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا اور گھر والے تشدد کرتے تھے۔ سو گھر سے بھاگ آیا۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے جواب دیا۔

"اب آگے کیا ارادہ ہے۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے پوچھا۔"

"کچھ بھی نہیں۔ واپس تو اب جانا نہیں۔ یہاں ہی رہ کر کام دھندا تلاش کروں گا۔"

"میرے ساتھ کام کرو گے؟"

"کیا کام؟"

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا، چلو اب چلیں۔ میں نے پکڑے جانے والے اپنے ساتھیوں کو رہا کروانا ہے۔"

میں اُٹھ کے اس کے ساتھ اس ڈھابے سے باہر نکل آیا۔ اب مِمّی کا رخ دوبارہ واپس اسٹیشن کی طرف تھا۔

پولیس ریلوے چوکی اسٹیشن کی عمارت کے کونے پر واقع تھی۔ "عمر تم ادھر ٹھہرو میں آتا ہوں" مِمّی نے مجھے عامر کی بجائے عمر کہہ کر مخاطب کیا۔ یا تو وہ عامر کہنے کی بجائے مجھے عمر کہہ کر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا جیسے وہ میرا نام بھول گیا ہو عامر کی بجائے عمر کہہ دیا میں نئے نام پر چُپ ہو گیا۔ میں عامر کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ مجھے عمر بن کر رہنا تھا۔"

اسی عرصے میں تھانہ چھلیلی کا ایس ایچ او رانا پرویز اختر دو ملازموں کے ہمراہ ہسپتال کی وارڈ کے دروازے پر آتا دکھائی دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ قریب آکر رانا صاحب بڑی محبت سے ملے اور عامر کے بارے میں پوچھا کہ "آپ سے صحیح صحیح بات کر رہا ہے یا؟"

"ہاں آپ کے کہنے کے مطابق ٹھیک ہے۔" میں نے انہیں مطمئن کرتے جواب دیا۔

"راہی صاحب! یہ بڑا سخت جان ہے ہم نے تو سمجھا تھا کہ یہ مر گیا ہے مگر اتنی گولیاں لگنے کے باوجود آپ کے سامنے بے فکر پڑا ہے۔" ایس ایچ او صاحب نے عامر کی طرف اشارہ کرتے کہا اور جاتے جاتے اسے تاکید کی کہ ان کو سب سچ سچ بتانا۔ اس نے سر کے نیچے رکھی بوتل درست کرتے کہا۔ "جی سر" پھر وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"میں ریلوے چوکی سے ذرا ہٹ کر جا کھڑا ہوا۔ زیادہ دیر نہ لگی اور وہ ریلوے چوکی سے باہر آتا دکھائی دیا۔ میں چلتا ہوا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"یہ سب کچھ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا چلتا رہتا ہے۔" مِمّی نے ہنستے ہوئے بتایا۔ اس کا رخ اسٹیشن کی عمارت کے اندر جانے والے راستے کی جانب تھا۔ میں نے چلتے چلتے سوال کیا۔

"وہ جو لوگ پکڑے گئے تھے ان کا کیا بنے گا؟"

"تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے سب آجائیں گے۔" ریلوے لائن عبور کرتے مِمّی ان کھڑے ڈبوں میں سے ایک پر چڑھ گیا۔ مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا کہا۔

ٹرین کے ڈبہ میں کئی اور لوگ بھی تھے اور تاش کے پتوں کا تبادلہ جاری تھا۔ چھوٹے بڑے نوٹوں کی آنی جانی جاری تھی۔ اسی طرح مِمّی دوسرے ڈبوں میں جا کر جائزہ لیتا اور کہتا (کھری ہو گئی ہے) بے فکر سے کھیلو۔ کھری کا جملہ میرے دماغ میں اٹک کر رہ گیا

تھا۔ آخر کار میں نے بھی سے پوچھ ہی لیا یہ کھری کا کیا مطلب ہوا؟

''یار عمر کھری کا مطلب یہ ہے کہ انچارج چوکی سے بات طے ہوگئی ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا ہم اُسے حصہ دینے جایا کریں گے۔'' میں آہستہ آہستہ اس کام میں ماہر ہوگیا۔ لڑائی جھگڑے میں میرے قدم سب سے آگے ہوتے تھے۔ زندگی کے دِن تیزی سے پیچھے بھاگ رہے تھے اور میں آگے آگے۔ گھر سے نکلے بہت سے سال بیت گئے۔ گھر والے یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں مرکھپ گیا ہوں۔ مر ہی گیا تھا۔ دِن رات گناہوں کی دلدل، جوأ، شراب، لڑائی، مارکٹائی، رنڈی بازی غرض ہر وہ کام جو ایک بُرا آدمی کرتا ہے، بھی کو اب میں استاد جی کہنے لگا تھا۔ اس نے مجھے اپنے کاموں پر مقرر کر دیا تھا جو بہتر لگتا میں کرتا۔ جوئے کی لت میں پڑ کر میں ہر کام کرنے کو تیار رہتا تھا۔

کچھ روز پہلے میں صادق کے آگے بارہ ہزار روپے ہار گیا اور وہ تقاضا تو نہیں کر رہا تھا کیونکہ ہار جیت میں ہم کھیلنے والے ایک دوسرے کا بھرم ہر ممکن بحال رکھتے ہیں۔ مگر میں صادق کو ہاری ہوئی رقم واپس لوٹانا چاہتا تھا۔ پسٹل چلانے کا ماہر تھا اور ہر وقت اپنے پاس رکھتا۔

اخبار کی خبر پر میری نظر ٹکی ہوئی تھی، دو ڈاکو ڈکیتی کے دوران تین لاکھ روپے چھین کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ خبر کی مکمل تفصیل میری آنکھوں کے سامنے تھی اور ذہن ڈکیتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

آخر کار میں نے ڈکیتی کا فیصلہ کرلیا۔ اب فیصلہ اس بات کا کرنا تھا کہ علاقہ کون سا منتخب کروں۔ بھی استاد سے مخفی رکھتے میں نے واردات کا پروگرام بنایا تھا۔ سو دِن ڈھلتے میں ڈکیتی کی نیت سے نکل پڑا، میرا رُخ صدر کی جانب تھا۔ ڈاکہ زنی پر سوچا اور ڈکیتی کے لیے کھڑا ہوا۔ شروع دِن سے میں اپنے دل کی مانتا آیا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ ڈکیتی کرو، سو میں نکل آیا ڈکیتی کے لیے۔ کافی دیر تک مجھے اِدھر اُدھر گھومتے مگر کوئی بھی ایسا مقام نظر نہ آیا جہاں میں واردات کرتا۔ چرچ کے ساتھ ہی کرسچن آبادی تھی اور کھاتے پیتے لوگ تھے۔ میں نے سب گھروں میں سے ایک گھر منتخب کیا اور چھوٹا گیٹ عبور کر گیا جیسے میں گھر کا مالک ہوں۔ سامنے والے دروازے کو ہلکا سا اندر کی طرف کیا تو وہ کھل گیا۔ جس کمرے میں داخل ہوا وہ شاید ٹی وی لاؤنج تھا مگر کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پورا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید کوئی کچن میں تھا، میں دبے قدموں چلتا ہوا اس طرف ہوگیا۔ لڑکی تھی جو کچھ پکانے میں مگن تھی اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مارے خوف کے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے اُسے مخاطب کرتے کہا کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے بس نقدی اور زیور وغیرہ دے دو جہاں پڑے ہیں۔ اگر تم نے کوئی حرکت کی یا شور مچایا تو میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔ ڈر کے مارے اس کی آواز بھی گلے میں اٹک چکی تھی وہ سہمی ہوئی کچن سے نکل کر میرے آگے آگے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

''سب لوگ کدھر ہیں؟''

''وہ چرچ گئے ہیں۔'' بتاتے اس نے کمرے کا دروازہ کھولتے الماری کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پسٹل کا منہ اس کی طرف ہی رکھتے الماری کھولی۔ اندر والے حصے میں بنے چھوٹے سے لاکر کا ہینڈل گھما کر اسے کھولا۔ اس میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ کچھ زیورات بھی پڑے تھے۔ میں نے جلدی جلدی وہ سنبھالے اور اسے کمرے میں بند کرتے تیزی سے نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھا اور گھر کا چھوٹا گیٹ عبور کرتے باہر سڑک پر پہنچ گیا۔ یہ دیکھے بنا کہ کدھر جارہا ہوں بس بھاگنے والے انداز میں بڑھا جارہا تھا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہورہی تھی۔ مجھے رکشہ کی تلاش تھی مگر جو بھی قریب سے گزرتا اسی میں سواری موجود ہوتی۔ آخر کار ایک رکشہ رُک گیا میں کلفٹن کہتے اندر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں مسلسل پیچھے کی جانب جائزہ لیتا

رہا۔ کافی دور نکل آنے پر میں نے رکشہ رکوایا اور اسے کرایہ دیتے فٹ پاتھ پر پیدل چل پڑا۔ سڑک کے کنارے چائے والے کا سٹال دکھائی دیا تو میں نے چائے کا آرڈر دیتے ایک سٹول سنبھالا اور اپنی کامیابی پر دل میں مسرور ہوتے لوٹا ہوا مال نکال کر جھولی میں رکھتے بڑے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے پہلے زیور نکالا۔ مجھے تو اندازہ نہیں تھا کہ وہ گولڈ ہے یا نقلی مگر لوٹے ہوئے روپے بتیس ہزار روپے نکلے۔ میں نے دوبارہ وہ سب سنبھالتے چائے والے کی طرف دیکھا جو کپ میری طرف لے کر آ رہا تھا۔ میں نے کپ اس کے ہاتھ سے لیا اور چائے پینے لگا۔ چائے پینے سے کچھ طبیعت سنبھلی اور اُٹھ کر اسے پیسے دیئے اور کچھ دور تک پیدل چلا۔ پھر رکشہ پکڑ کر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

رات بھر ڈکیتی کی کامیابی پر سوچتا رہا پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کام اتنا بُرا نہیں مگر حوصلہ چاہیے۔ کاش میں نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا اور آج اس حال میں نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ اِدھر ہسپتال میں کام کرنے والا اسٹاف اور ڈاکٹر میری طرف منہ کرنے کو تیار نہیں۔''

کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ کچھ پل وہ خود کو سنبھالتا رہا پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

''خود پر سے جوئے کا قرض اتارا اور باقی بچے روپوں کو بے دردی سے خرچ کر ڈالا۔ وہ زیور لے کر میں سُنار مارکیٹ گیا صرف ایک انگوٹھی اصلی تھی بقایا سب کچھ نقلی تھا۔ انگوٹھی کے ساڑھے بارہ سو روپے ملے اور بقایا نقلی زیور میں نے راستے میں پڑے نالے میں اچھال دیئے۔ یہ تھی میری پہلی ڈکیتی۔ اس کے بعد میں نے بہت سارے لوگوں کو لوٹا اور کوئی بھی پریشانی آڑے نہ آئی۔ موٹر سائیکل خرید لیا تھا اور چلانے میں بھی ماہر تھا۔ میں دور نکل آتا کوئی نہ کوئی شکار مل جاتا۔ پولیس میری تلاش میں سرگرداں تھی مگر ان کے ریکارڈ میں میرے بارے میں کچھ نہیں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اکیلا ہی وارداتیں کرتا تھا۔

ڈکیتی، جوا، عیاشی میری زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ فریدہ سے میری ملاقات کچھ اس انداز میں ہوئی۔ وہ شاید سٹوڈنٹ تھی مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ ٹیوٹا میں بطور ٹیچر ہے۔ میں کسی کام کی غرض سے صبح صبح رہائش سے نکل کر رنچھوڑ لائن کی جانب جا رہا تھا کہ میری نظر اس پر پڑی۔ تین اوباش لڑکے اس کو تنگ کر رہے تھے اور وہ ان کے نرغے میں پھنس کر پریشان کھڑی تھی۔ میں فٹ پاتھ سے اُتر کر دوسری جانب اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ تینوں اسے چھوڑ کر میری طرف گھوم گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بدتمیزی کرتے میں نے جھٹ پسٹل نکال لیا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھتے ان تینوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ پلٹ کر بھاگتے ہوئے گلی کے اندر گم ہو گئے۔ چند ایک راہگیر رُک چکے تھے جن کو میں نے دھمکا کر جانے کا کہا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کون تھے؟''

''پتا نہیں۔ بس میں تھے۔ میرے ساتھ ہی اُترے تھے اور مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔''

''آپ نے کہاں جانا ہے؟'' میں نے دریافت کیا

''اِدھر پاس ہی ووکیشنل میں بطور ٹیچر ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''چلیں میں آپ کو پہنچا دوں، کہیں پھر نہ آپ کو تنگ کرنے آ جائیں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے قدم آگے بڑھاتے میری پیشکش قبول کر لیا۔

''آپ پولیس والے ہیں؟'' اس نے قدم، بڑھاتے پوچھا۔

''بس یہی سمجھ لیں۔ جس ادارے میں کام کرتا ہوں وہ پولیس کا حصہ ہے۔'' میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے اس کی بات کا جواب دیا۔

''آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟''

''ہاں مگر آپ پہلے اپنا نام تو بتائیں۔''

''جی۔ فریدہ ہے میرا نام۔''

''جی میں عمر ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے اُسے اپنا نام بتایا۔ باتیں

کرتے اس کا ادارہ آگیا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔ شکریہ آپ کا۔'' فریدہ نے گیٹ کی طرف گھومتے کہا۔

''آپ سے دوبارہ ملاقات ہوسکتی ہے۔'' میں نے ہمت کرتے فریدہ سے پوچھا۔

اس نے جلدی سے ہاتھوں میں پکڑے رجسٹر سے کاغذ پھاڑ کر اس پر اپنا فون نمبر لکھا اور ادائے دلربا سے چلتی گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

شام کو میں نے ڈرتے ڈرتے اُسے کال کی۔ دوسری طرف سے وہ موبائل پر موجود تھی۔

''جی کون۔۔۔؟''

''عمر بول رہا ہوں۔'' میں نے دھڑکتے دِل سے جواب دیا۔

''اوہ آپ۔۔۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کیوں آپ کو یقین نہیں تھا کہ میں آپ کو فون کروں گا؟''

''بس یہی سمجھ لیں۔'' دوسری طرف سے فریدہ کی ہلکی سی ہنسی اُبھری۔

خواتین کے معاملے میں میرا تجربہ خاصا مضبوط ہو چکا تھا کہ کیسے لڑکی کو شیشے میں اُتارا جاسکتا ہے۔ میں خوب جانتا تھا۔ گفتگو کے دوران میں نے اس کا سارا تعارف لے لیا۔ باپ کباڑیا تھا، دو بہنیں ایک بھائی، والدہ اور بس۔ چھوٹی بہن میٹرک میں تھی۔ بھائی دونوں سے بڑا تھا جو والد کے ساتھ ہی کام پر ہوتا تھا۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں سیکیورٹی گارڈ تھا ایک سرکاری محکمہ میں۔ ٹیلی فون سے ملاقاتیں بڑھتے بڑھتے ملنے ملانے پر پہنچ گئیں اور یوں فریدہ میری زندگی کا حصہ بن گئی۔ پہلے میں ڈکیتیاں اپنے لیے کرتا تھا اب اخراجات فریدہ کی وجہ سے تجاوز کر گئے۔ اس نے سونے کی چین کی فرمائش کر دی۔ میرے لیے یہ بات معمولی تھی مگر دوران ڈکیتی مزاحمت پر میرے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ قتل کا پتا مجھے دوسرے روز اخبار میں چھپنے والی خبر سے چلا جو میری سٹوری بیان کر رہی تھی۔

کئی روز تک میں انڈر گراؤنڈ ہوگیا۔ بیماری کا بہانہ کر کے میں نے ممی کو مطمئن کر دیا اور فون پر ہی فریدہ سے بات چیت ہوتی رہتی۔ اسے میں نے بتایا کہ ''میں شکار پور آیا ہوا ہوں کام کے سلسلے میں۔ مجھے دو چار دن لگ جائیں گے اور آتے ہوئے تمہارے لیے چین بھی لیتا آؤں گا۔''

''تمہیں یاد ہے میری چین۔۔۔؟''

''کیوں نہیں؟ تم کچھ کہو اور میں انکار کر دوں'' میں نے رومانٹک انداز میں بات کا جواب دیا۔

مجھے چار دِن ہوگئے تھے اندر بند ہوئے۔ پولیس اس ڈکیت کو ہر حال میں گرفتار کرنے میں لگی ہوئی تھی اور ڈکیت گھر کے کمرے میں پڑا آرام کر رہا تھا۔ پڑے پڑے اُکتا کر میں نے چارپائی کو چھوڑا اور تیار ہو کر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ عظمی مجھے پلیٹ فارم پر مل گیا۔

''کیسی ہے اب طبیعت؟'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

''پہلے سے بہتر ہوں۔'' میں نے زبردستی آواز میں نقاہت بھرتے جواب دیا اور ہم دونوں ڈبوں کی طرف چل پڑے۔ جوا عروج پر تھا میں بھی شامل ہو گیا۔ سونے کی چین خریدنے کے لیے رکھے ڈکیتی اور قتل کے سارے روپے ہار گیا۔

افسردہ سا اُٹھ کر میں نیچے اُتر آیا، میرا رُخ ٹی سٹال کی طرف تھا۔ چائے کا کپ لے کر خالی پڑے بینچ پر بیٹھتے چائے پینے لگا۔ چائے پینے کے دوران آتے جاتے مسافروں کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ لاہور جانے والی ایکسپریس کی بوگیاں اسٹیشن پر آگئی تھیں اور قلی اپنی اپنی سواریوں کو سامان سمیت لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میرے سامنے سے گزرنے والا جوڑا جو نیا شادی شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی نے خاصا گہنا پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے والے دولہا صاحب بھی خاصے مالدار لگ رہے تھے۔ قلی نے بزنس کلاس کی ایئرکنڈیشنڈ بوگی کا نمبر دیکھا اور دونوں کو سوار ہونے کا اشارہ کیا پھر تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اُتر آیا۔ میں نے ہاتھ سے پسٹل کا جائزہ لیا اور خود کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ میں

اس ٹرین میں سفر کے دوران نو بیاہتا جوڑے سے ڈکیتی کروں گا۔

چلتی ٹرین سے اُترنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اتنی مدت سے اسٹیشن پر رہتے یہ کام خاصا سیکھ رکھا تھا۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنا میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ جیب میں تھوڑے سے روپے پڑے تھے اس لیے بے فکری تھی۔ آخر کار ٹرین رینگنے لگی تو میں نے ان کی پچھلی بوگی کی ریلنگ تھامے خود کو ڈبے میں سوار کرلیا۔

حیدر آباد پہنچ کر گاری رُکی، میں نے پلیٹ فارم پر اُترتے اس ڈبے کا جائزہ لیا جس میں وہ سوار تھے۔ پلیٹ فارم کے دوسری جانب ان کا کمپاؤنڈ تھا جو دونوں کے لیے بک کروایا گیا تھا۔

اندر سے چٹخنی لگا کر ایک سے دوسری بوگی میں جانے کا راستہ بند کردیا گیا۔ میں نے ڈبے میں داخل ہوتے سب سے پہلے چٹخنی نیچے گراتے ہینڈل کا جائزہ لیا تو وہ ہلکے سے اشارے سے کھل گیا جسے میں نے آہستگی سے بند کیا اور ڈبے سے نیچے اُتر آیا اور ساتھ والی بوگی میں سوار ہوگیا۔ ٹرین فراٹے بھرتی اپنی منزل کی طرف اُڑی جارہی تھی اور میں ڈکیتی کا پلان اپنے ذہن میں بنا رہا تھا۔ گہری تاریکی اور ٹرین کی آواز کے سوا سب اپنی جگہ درست چل رہا تھا۔ ڈائنگ کار کے بند ہوتے ہی میں نے سوچ لیا کہ اب اس کمپاؤنڈ کے اندر داخل ہوکر جائزہ لوں سو میں نے اُٹھ کر واش روم کا دروازہ کھولا کچھ دیر یونہی رکا رہا پھر باہر نکل کر میں درمیانی راستے سے ہوتا ہوا اس ڈبے کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا۔ تھوڑا سا اندر کی طرف زور لگایا تو دروازہ کھل گیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اندر پہنچ کر دوبارہ اسے بند کیا اور سب کیبنوں کا جائزہ لیا سب کے دروازے بند تھے۔ پورا ڈبہ خوشگوار ٹھنڈ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب مسافر اپنے اپنے کیبن میں بند تھے میں بے دھڑک چلتا ہوا ان دونوں کے کمپاؤنڈ کے سامنے رُک گیا۔ چند پل کھڑا آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر میں نے پسٹل نکالتے آہستگی سے دستک دی۔ دوسری دستک پر دولہے میاں کا سر باہر نکلا تو میں نے برق رفتاری سے اسے اندر کی طرف دھکا دیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ اپنی دلہن والی سیٹ پر اس کے اوپر جا گرا۔ وہ اچانک ایسی صورتحال پر تڑپ کر اُٹھی اور مجھ پر نظر پڑتے سہم کر اپنے میاں کے پیچھے دُبک گئی۔ میں نے اندر سے ٹک لگاتے اسے سب کچھ نکالنے اور زیور اُتارنے کا حکم دیا۔

دونوں میرے پسٹل کی زد میں فوراً زیور اور نقدی کانپتے ہاتھوں سے میرے سپرد کرتے میرے کہنے پر اوپر والی برتھ پر چڑھتے اور کمبل اوڑھ لیے جیسے گہری نیند پڑے سو رہے ہوں۔ میرا دھیان باہر کی جانب تھا اور ہر طرح سے میں نے خود کو تیار کر رکھا تھا۔ مجھے انتظار تھا ٹرین کی رفتار کم ہونے کا۔ نان سٹاپ گاڑیاں بڑے اسٹیشنوں پر رُکتیں یا کوئی کراسنگ ہوتی تو پل بھر کے لیے رینگتی پھر رفتار بڑھنے لگتی، شاید ایسی ہی کوئی وجہ تھی کہ ٹرین کی سپیڈ ذرا کم ہوئی تو میں نے باہر نکلنے کی مکمل تیاری کرتے چیتے کی سی پھرتی سے ان کا کمپاؤنڈ چھوڑ دیا اور تیزی سے قدم اُٹھاتے ٹرین کا دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ آگے کوئی اسٹیشن آنے والا تھا جس کے باعث رفتار میں ذرا کمی واقع ہوئی تھی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنے ہاتھ مضبوطی سے جماتے خود کو باہر کی جانب جھکاتے چھلانگ لگائی اور نیچے کود گیا۔

پیروں کو سختی سے زمین پر جما دیا، ٹرین مجھے پیچھے چھوڑتی آگے بڑھ گئی۔ چاروں جانب تاریکی اور گہرا سناٹا تھا۔ ٹرین کی سرخ بتی بتدریج دور ہوتی جارہی تھی۔

ریلوے لائن سے تھوڑے فاصلے پر سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ میں تیزی سے اُٹھا اور بھاگتا ہوا سڑک کی جانب چل پڑا۔ مجھے اُدھر سے کوئی سواری یا لفٹ ضرور ملنے کا امکان تھا۔

سڑک پر پہنچ کر میں کراچی کی بجائے مخالف سمت کی طرف جا کھڑا ہوا، زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک منی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے رُکنے کا اشارہ کیا تو ڈرائیور نے قریب آکر بریک لگا لیے۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے گردن باہر نکالتے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

میں نے بڑی لجاجت سے لفٹ مانگی کہ اگلے شاپ پر اُتار دیں مہربانی ہو گی۔ اس نے اندر ڈرائیور سے پوچھا پھر دوبارہ میری طرف گھومتے پیچھے بیٹھ جانے کی اجازت دے دی۔ پچھلے حصہ میں تھر یشر لدا ہوا تھا۔ میں اُچک کر مزدا میں جا بیٹھا ایک کونے میں کچھ سامان پڑا تھا۔ تھوڑی سی خالی جگہ پر میں آلتی پالتی مار کر پیٹھ باڈی کے ساتھ لگاتے لمبا سانس بھرتے اپنی کامیاب ڈکیتی کے بارے میں سوچنے لگا۔

لاکھ سے اوپر رقم اور طلائی زیورات میرے پاس تھے اور میں بے فکری سے ٹیک لگائے اپنی جرأت پر نازاں تھا۔ ایک آدھ بار سوچا کہ کوئی ساتھی بنالوں اپنے ساتھ ڈکیتی کے لیے پھر یہ سوچ کر یہ اس خیال کو دِل سے جھٹک دیا کہ جب میں اکیلا سب کام سرانجام دے ڈالتا ہوں تو حصہ دار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

مزدا میں بیٹھے بیٹھے نیند نے مجھے آدبوچا۔ ڈرائیور کے ساتھی کی آواز پر میری آنکھ کھلی، رات، دن کے اُجالے میں چھپ چکی تھی میں اُٹھ کر نیچے اُتر آیا۔ مزدا ہوٹل کے آگے کھڑا تھا۔ میں نے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کا شکریہ ادا کیا اور ان کو سلام کرتا آگے چل پڑا۔

کوئی چھوٹا سا قصبہ نما شہر تھا، اِکا دُکا دوکانیں کھلی تھیں۔ ایک دوکان پر لگے بورڈ پر اس شہر کا نام رسول نگر لکھا تھا۔ لوکل ٹرانسپورٹ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میر پور جانے والی ویگن میں ابھی گنجائش تھی۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔ میر پور کا فاصلہ تھوڑا سا تھا اور میں اسٹیشن پہنچ گیا۔

ٹرین کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر موجود ٹی سٹال سے چائے اور کیک پیس لیے اور بینچ پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ جس آسانی سے میں نے ڈکیتی کی تھی اس کا مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ جب سے میں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا یہ میری سب سے بڑی ڈکیتی تھی۔ ٹرین آنے پر میں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں آبیٹھا۔ مجھے دروازے والی اکیلی سیٹ ملی تھی۔

وقت مقررہ پر ٹرین چل پڑی اور میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکاتے آنکھیں بند کر لیں۔ کراچی کی طرف میرا سفر شروع ہو گیا تھا۔ میری خوش بختی تھی جو مجھے ان دونوں میاں بیوی کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا ورنہ میں یوں بے فکری سے سفر نہ کر رہا ہوتا۔ کسی بھی صورت حال کے بغیر میں کراچی پہنچ گیا۔ آتے ہی میں نے فریدہ کو فون کر کے بتایا کہ مجھے کسی کام کے سلسلے میں اچانک حیدرآباد آنا پڑا تھا۔ اگر کہو تو میں گھر آ کر تمہاری چین، لاکٹ اور بالیاں دے جاؤں جو میں نے یہاں سے خریدی ہیں۔ میرے منہ سے یہ سن کر وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی اور مجھے فوراً آنے کا کہا۔ میں نے جلدی سے نہا کر الماری سے اس کی پسند کا سوٹ نکالا اور پہن کر گھر کو لاک کرتے باہر آ گیا۔ راستے سے میں نے پھل وغیرہ لیا اور رکشہ میں بیٹھ کر اسے اڈریس بتایا تو رکشہ ڈرائیور نے رکشہ آگے بڑھا دیا۔ مختلف راستوں کو پیچھے چھوڑتے وہ فریدہ کے گھر کے سامنے والی گلی میں آرکا۔ میں نے پھل وغیرہ سنبھالتے اسے کرایہ دیا اور فریدہ کے مکان کی طرف پیدل چل پڑا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ سارے گھر والے اب مجھے کوئی غیر نہیں سمجھتے تھے کیونکہ فریدہ نے سب کو میرا وہ کارنامہ بتا کر گھر والوں کو میرے حق میں کر دیا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے دوران میں نے چپکے سے چین، لاکٹ اور بالیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ وہ بے صبری سے ان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر رُک کر میں نے اجازت لی اور واپسی کے لیے چل پڑا۔

فریدہ کے والدین، خاص کر بھائی انتہائی تنگ دِل تھے۔ بظاہر تو وہ سب میرے، اپنے گھر آنے پر خوش نظر آتے مگر ان کی تیز نظریں جب تک میں فریدہ کے قریب بیٹھا رہتا تھا ہمارا طواف کرتی رہتیں۔ فریدہ کباڑیے کی بیٹی کے ناتے سے بڑی باریک بین تھی جب سے ہم ملے تھے اس کی فرمائشیں جاری تھیں۔ میں نے بھی دِل میں بٹھا لیا تھا کہ شادی اسی سے کروں گا۔ اس کے دل میں کیا تھا اس کی مجھے بھی خبر نہیں ہونے پائی تھی۔

# یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

**Click on http://paksociety.com to Visit Us**

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



زیور اڑھائی لاکھ کا بکا تھا مگر ڈکیتی کا نشہ ایسے لگ چکا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ کر نکل پڑتا۔ میرے شاہانہ اخراجات پر کبھی جب کوئی سوال کرتا تو میں جوأ جیتنے کا کہہ کر صاف بچ نکلتا۔

آرام باغ کے علاقہ میں گھوم کر میں ڈکیتی کرنے کا جائزہ لے رہا تھا کہ میری نگاہ ایک ریسٹورینٹ پر پڑی جس کے اندر دو تین لوگ بیٹھے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا منیجر سامنے لگاٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ماحول اور باہر کے حالات مجھے سازگار لگے۔ میں مین گیٹ عبور کر کے سیدھا منیجر کے پاس جا رُکا اور اسے پسٹل کی زد میں لیتے دھیمی آواز میں حکم دیا کہ سب کچھ نکال کر میرے حوالے کر دو۔ وہ اس اچانک حملے سے بوکھلا گیا اور جھٹ دراز میں پڑے کرنسی نوٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیے۔ کسی کو کوئی خبر نہیں ہوئی تھی کہ کیا چل رہا ہے۔ میں کرنسی سمیٹ کر مڑنے لگا تو اس نے بیرے کو بلانے والی گھنٹی بجادی۔ میں اس بارے تیار نہیں تھا اور بوکھلا کر میں نے اس پر فائر داغ دیا۔ گولی سیدھی اس کے ماتھے پر لگی اور وہ بغیر آواز نکالے کاؤنٹر پر ڈھیر ہو گیا۔

ریسٹورینٹ میں موجود گاہک اور ریسٹورینٹ کا عملہ جہاں تھے کی مثال وہیں ساکت ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے میں تیزی سے باہر نکلا اور جدھر منہ اُٹھا بھاگ پڑا۔ گلیوں، بازاروں سے ہوتا ہوا بڑی سڑک پر نکل آیا۔ ایک طرف خالی کھڑے رکشہ میں بیٹھ کر اسے چلنے کا کہا۔

''کدھر؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''کینٹ۔'' میں نے خود پر کنٹرول کرتے اعتدال میں اسے جواباً کہا۔ وہ بغیر کچھ کہے سُنے آگے بڑھ گیا۔

میرے ہاتھوں سے دوسرا قتل ہو چکا تھا۔ پہلے والے قتل کی تو کسی کو خبر نہ ہوئی تھی مگر اس بار قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ ریسٹورینٹ میں کیمرہ لگا ہوا تھا جس میں میری ڈکیتی کرنے اور فائر مارنے کی ویڈیو ریکارڈ ہو گئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پولیس مجھ تک پہنچ جائے گی اگر میں گھر پر یا ریلوے یاڈ ہوتا تو پکڑا جاتا۔ میں فریدہ کو لے کر کیماڑی آیا ہوا تھا۔ ممی نے کال کر کے مجھے خبردار کیا کہ ''تمہیں پولیس تلاش کر رہی ہے۔ کیا۔ کیا ہے تم نے؟'' میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔

''کیا ہوا؟'' فریدہ نے یکدم مجھے پریشان ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں، بڑا نقصان ہو گیا ہے، آؤ چلیں'' میں اسے لے کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف آ گیا اور اس کیلئے رکشہ کروایا اور لوٹی ہوئی رقم میں سے پانچ ہزار کے نوٹ اسے دیتے گھر جانے کا کہا۔ وہ اس صورتحال سے خاصی نروس ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے کوئی سوال جواب نہ کیا اور رکشہ آگے بڑھ گیا۔

میرے لئے یہ معاملہ بڑا سنگین تھا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری طاقت ہوا ہو چکی تھی۔ گھر میں جا نہیں سکتا تھا اس لیے خود کو محفوظ کرنے کی فکر تھی۔ منوڑہ میں حفیظ نامی جوار یا جو میرا اچھا دوست تھا فی الوقت وہی میرے ذہن میں اُبھرا اور میں منوڑہ جانے کے لیے کلفٹن کی طرف چل پڑا۔

کلفٹن پر لوگوں کا ہجوم تھا، میں محتاط انداز میں چلتا ہوا منوڑہ جانے والی لانچ میں دوسرے مسافروں کے ساتھ آ بیٹھا۔ مجھے یوں لگ رہا جیسے ہر کوئی میری جانب متوجہ ہے اور مجھے گھور رہا ہے۔ لانچ کلفٹن کی عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی منوڑہ آ کر رُک گئی۔ اتفاقاً یا قدرت مہربان تھی مجھ پر کہ حفیظ لانچ میں سوار ہونے کے لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے وہ کھل اُٹھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔

''یار حفیظ میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے دو دِن تمہارے پاس رہنا ہے۔'' میں نے اسے ایک سائیڈ پر کرتے بڑی عاجزی سے کہا۔

''ارے عمر! دو دن کیا، دو ماہ بھی رہو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔'' کہتے وہ مجھے لے کر واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ منوڑہ کی آبادی کے آخر میں چھوٹا سا بوسیدہ مکان تھا اس کا۔ اندر آ کر کمرے میں مجھے بٹھاتے خود اندر اپنی فیملی میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو چائے کے برتن اس نے اُٹھا رکھے تھے۔ نہ

اس نے مجھ سے پوچھا اور نہ میں نے بتایا کہ میں کیوں اس کے گھر آیا ہوں۔

وہ رات تو میں نے بڑی پریشانی میں گذاری۔ دوسرے دن شام کو میں نے حفیظ سے اجازت مانگی تو اس نے اصرار کر کے مجھے ایک روز اور روک لیا۔ میں نے دل میں جو پروگرام ترتیب دیا تھا وہ کچھ اس طرح سے تھا کہ میں ہائی وے پہنچ کر کسی ٹرک کے ذریعے کراچی کو خیر آباد کہہ کر اندرون سندھ انڈر گراؤنڈ ہو جاؤں۔ حفیظ سے اجازت لے کر میں چھپتا چھپاتا ہائی وے پر پہنچ گیا۔

ایک دو ٹرکوں کو روکا مگر کسی نے بھی اپنا ٹرک نہیں روکا۔ مایوسی کے عالم میں چلتا ہوا ایک ڈھابے پر پہنچ گیا۔ یہاں چار پانچ ٹرک کھڑے تھے اور ان کے مالکان کھانے پینے میں مصروف تھے۔ میں چلتا ہوا اس ٹرک کے پاس آ گیا جس کو ایک لڑکا صاف کرنے میں مصروف تھا۔ اس پر دھاگے کی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے واقفیت نکالتے اسے لالچ دیا کہ مجھے شکار پور تک پہنچا دے۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا مگر جب میں نے پانچ سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دیا تو اس نے نظر بچا کر مجھے آہستہ سے کہا کہ ''جب ہم چلنے لگیں تو تم پیچھے سوار ہو جانا، باقی میں خود سنبھال لوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور ڈھابے سے نکال کر روڈ پر آہستہ رفتار سے آگے بڑھایا تو میں جلدی سے ٹرک پر سوار ہو گیا اور گانٹھوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھ گیا۔

ٹرک کا دھیان کنڈیکٹر اوپر کیبن میں موجود تھا اور کبھی کبھار جھانک کر میرا جائزہ لے لیتا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں بے ضرر ہوں تو وہ مجھ سے بے فکر ہو گیا۔

میں نے شکار پور کی بجائے حیدر آباد میں اُترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوپہر سے پہلے ٹرک حیدر آباد پہنچ گیا اور میں چپکے سے ایک جگہ اُتر کر جدھر منہ اُٹھا چل پڑا۔ بازاروں میں گہما گہمی تھی۔ ایک ریسٹورینٹ میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دیا اور اپنے اگلے پروگرام کو ترتیب دینے لگا۔ سب سے پہلا کام پولیس کی نظروں سے بچنا تھا۔ اس کا حل میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی جگہ کام تلاش کروں۔ بل ادا کر کے میں سڑکوں، بازاروں میں گھومتا ہوا ایک ماربل فیکٹری کے پاس آ رُکا۔ اندر کام جاری تھا، میں نے ہمت کر کے فیکٹری کے مالک سے بات کی کہ میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے معمولی سوالوں کا جواب میں اپنی عقل سے دے رہا تھا۔ آخر کار طے ہوا کہ مجھے مشین سے تیار مال اُٹھا کر باہر والے خالی پلاٹ میں ٹرانسفر کرنا تھا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے اور فیکٹری کے مالک نے مشینیں بند کرنے کا کہا۔ پہلی بار مشقت کی تھی۔ میرا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ یہاں اور بھی کئی ملازم تھے جو فیکٹری کے اندر ہی سوتے تھے۔

مجھے بھی سونے کی اجازت مل گئی۔ میں بھی زمین پر پڑے دوسرے کام کرنے والوں کے ساتھ ایک سائیڈ پر ہو کر لیٹ گیا۔ یہ چار لوگ تھے، دو مشین پر ماربل کاٹتے اور دو میری طرح تیار مال کو ٹرانسفر کرتے تھے۔ چاروں سے میری جان پہچان مزدور کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ ان کو کیا معلوم کہ میں ایک قاتل اور ڈکیت ہوں اور پولیس سے بچنے کے لیے ایک مزدور کی حیثیت سے ان کی فیکٹری میں کام پر لگ گیا ہوں۔ یہ اپنا کھانا خود ہی تیار کرتے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

ٹرک کے سفر اور ماربل اُٹھانے کی مشقت نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ کھانا کھاتے ہی میں بے خبر ہو کر سو گیا۔ تمام رات ایک کروٹ ہی پڑے رہنے سے پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کام شروع کر دیا گیا۔

معمولی تنخواہ پر کام کرتے مجھے دو ہفتے بیت گئے تھے اور کراچی کا معاملہ بھی تھوڑا دب گیا تھا۔ کسی کو میری اصلیت کا پتا چل چکا تھا۔ واپس لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فریدہ سے بھی میرا کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ڈکیتی کی لوٹی رقم آہستہ آہستہ کر کے ختم ہو رہی تھی اور ماربل فیکٹری میں کام کرتے اب میں اُکتا چکا تھا۔

ایک رات میں چپکے سے اُٹھ کر فیکٹری سے باہر نکل آیا۔ میں نے داڑھی بڑھا کر اپنا حلیہ قدرے بدل ڈالا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر ٹوپی دیکھ کر کوئی بھی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا کہ میں عامر عرف عمر ہوں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ فریدہ کی محبت نے میرے اندر بے چینی اُٹھا رکھی تھی۔ بس میں سوار ہو کر میں کراچی پہنچ گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی مجھے پہچان پاتا ہے کہ نہیں۔ میں اسٹیشن پر آ گیا۔ کنٹین والے سے چائے کا کپ مانگا، اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی۔ اسی دوران کئی چہرے ملے جن کے ساتھ میں ریل کے ڈبوں میں جوا کھیلتا تھا یہاں تک کہ مہی بھی میرے قریب سے گزر گیا۔

اِدھر اُدھر پھرتے رات ہوگئی اور میں نے فریدہ کے گھر جانے کی ٹھان لی۔ دستک دینے پر دروازہ کھولنے والی اس کی والدہ تھی جس نے نہ پہچانتے مجھ سے سوال کیا کہ ''کس سے ملنا ہے؟'' میں جواباً مسکرا دیا اور بتایا کہ ''میں عمر ہوں۔'' اُسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''آؤ۔۔۔! آؤ۔۔۔ اندر آ جاؤ۔''

فریدہ کی والدہ نے ایک طرف ہٹتے مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں اندر آ گیا۔ سامنے فریدہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اُسے بھی ویسا ہی لگا جو اس کی ماں کو محسوس ہوا تھا۔ بتانے پر وہ بھی شدید حیرت سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور جھٹ سوال کر دیا۔

''کدھر گم ہو گئے تھے؟ تمہارے بارے میں تو میں نے کچھ اور سُنا تھا۔''

''ارے نہیں یہ سازش تھی میرے خلاف اگر ایسا کچھ ہوتا تو میں یوں تیرے سامنے نہ ہوتا؟ میں تو تبلیغی جماعت کے ساتھ اندرون سندھ تبلیغ پر گیا ہوا تھا۔'' اسی دوران باہر دستک ہوئی تو فریدہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

فریدہ کا والد اور بھائی آئے تھے۔ ان پر بھی وہی اثر ہوا۔ پھر وہی سوال دونوں نے دہرایا۔ میں نے وہی جواب ان کو بھی دیا۔ اچھا بیٹھو! پھر فریدہ کچن میں چلی گئی اور اس کا بھائی اوپر چلا گیا۔ میرے سامنے فریدہ کا والد اور والدہ رہ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان میں نے فریدہ کے والد کو مخاطب کرتے سوال اُٹھایا کہ ''میرا تو کوئی بڑا ہے نہیں آپ دونوں کو اپنا بزرگ مانتے آپ سے فریدہ کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔''

میرے منہ سے یہ سُننا تھا کہ فریدہ کا والد آگ بگولہ ہو گیا کہ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی جو تمہاری زبان پر میری بیٹی سے شادی کا ذکر آیا۔''

کیسے اس کے رویے نے میرے اندر کا قاتل ڈاکو یکدم بیدار کر دیا۔ کچن سے چائے کے برتن اٹھاتے فریدہ آتی دکھائی دی۔ میں نے ایک بار پھر فریدہ کے والد کو مخاطب کرتے کہا کہ ''آپ سوچ لیں۔''

''کیا سوچ لوں؟ تم اُٹھو یہاں سے اور آئندہ کبھی بھی میرے دروازے پر دستک نہ دینا۔''

فریدہ کے والد کی آواز میرے اعصاب پر اس طرح ثبت ہوئی کہ میرے ہوش و حواس کھو گئے۔ پتا نہیں میں نے کب پسٹل نکالا اور کب گولیاں اس سے باہر آئیں۔ میرے سامنے فریدہ کٹے درخت کی مانند زمین بوس ہوگئی۔ گولیوں کی آواز پر اس کا بھائی بھی نیچے آ گیا تھا۔

''اگر فریدہ میری نہیں تو کسی کی بھی نہیں ہوسکتی۔'' کہتے میں پسٹل لہراتا گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ تینوں گم صم فریدہ کی لاش پر کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔

خالی رکشہ روک کر میں نے آگے بڑھنے کا کہا اور خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ فریدہ کے قتل نے مجھ پر وحشت طاری کر دی۔ میرے اندر انسانیت کی قدر ختم ہو چکی تھی اور میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اب میرے نزدیک انسانی جان صرف ایک گولی اور انگلی ٹریگر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ رکشہ میں نے آرام باغ کے ایریا میں چھوڑا اور خود پیدل ایک جانب چل پڑا۔

میری زندگی کا دھارا مجھے اپنی مرضی سے نامعلوم منزل کی طرف لے کر چل پڑا۔ فریدہ کے ساتھ گزرے لمحات میرے اندر اُبھر ڈوب رہے تھے۔ میں نے اس بے قصور کو اپنے قہر کی بھینٹ چڑھا دیا

تھا۔ صرف اس ایماء پر کہ اس کے والدین نے اس کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تمام وقت میں نے بے مقصد گھومتے گزار دیا۔ رات سرکاری پارک کے ایک کونے میں جھاڑی نما جھنڈ کے اندر سو کر گزار دی۔

صبح اُٹھ کر قریبی مسجد میں جا کر نہایا اور پھر ناشتے کے لیے ایرانی کے ہوٹل میں آ گیا۔ میں نے جو سلسلہ شروع کر دیا تھا وہ مجھے تباہی کے راستے پر لے کر چل پڑا تھا۔ کراچی میں رُکے رہنا پولیس کو دعوت دینا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دے۔ سو میں نے کراچی سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر لوکل بس میں سوار ہو گیا۔ جس بس کا میں نے انتخاب کیا تھا اس میں خاصا رش تھا۔ میں بھی گھس گھسا کر سواریوں میں گڈمڈ ہو گیا۔

ملیر پہنچ کر میں نے وہ بس چھوڑ دی اور دوسری بس میں سوار ہو گیا۔ اسی طرح میں نے تین بسیں بدل کر حیدرآباد جانے والی بس میں ٹکٹ لیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس کے اندر ابھی سواریوں کی گنجائش تھی اس لیے بس رُکی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھنے والا نوعمر سا لڑکا تھا جس نے بیٹھتے ہی موبائل نکال لیا اور شروع ہو گیا۔ گو کہ وہ دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا مگر میرے کان اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے اور توجہ باہر کی جانب تھی۔ وہ دوسری طرف کسی سے کہہ رہا تھا ایسے مال کی قیمت اگلے کی مرضی پر ہوتی ہے۔ اگر بحث کی جائے تو یہ سالے پکڑوا بھی دیتے ہیں۔ انیس نے کہا تھا کہ اگلی بار کسی اور سے بات کرے گا۔ اس کی گفتگو سے تو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی کوئی مار خور تھا پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے موبائل بند کرتے شاپر میں سے دو امرود نکال کر ایک میری جانب بڑھایا۔ میں نے شکریہ کہتے امرود اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ بس حیدرآباد کی جانب چل پڑی۔

گھنٹہ بھر ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ ایک جگہ کچھ سواریاں اُتریں اور وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ حیدرآباد جا رہے ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔

اس نے دوسرا سوال کر دیا۔

''کہاں رہتے ہیں آپ؟''

''میں ماربل فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور اُدھر ہی رہتا ہوں۔'' میں نے بڑے محتاط انداز میں جھوٹ بولا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اب میرا سوال اس کے سر پر بم بن کر گرا۔

''تو آپ نے میری گفتگو سن لی تھی۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''فکر نہ کرو میں اور تم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔'' پھر ہم دونوں کھل کر ایک دوسرے سے سوالات کا تبادلہ کرنے لگے۔ حیدرآباد تک آتے سرور اور میں آپس میں خاصے کلوز ہو چکے تھے۔ میں نے اسے یہ تو نہیں بتایا کہ میں ڈاکو اور قاتل ہوں مگر اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ وہ تین لوگ تھے جو چوری چکاری کرتے تھے اور سرور مال لے کر کراچی کے مختلف بازاروں میں فروخت کرنے کا کام کرتا تھا۔

اس نے بتایا کہ پہلے وہ رکشہ چلاتا تھا اور پھر اس کی واقفیت شہباز اور منظور سے ہو گئی جو پیشہ کے لحاظ سے مکمل چور تھے۔ سرور غریب آباد میں رہائش پذیر تھا جبکہ وہ دونوں حیدرآباد کی نواحی بستی میں رہتے تھے۔ سرور نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی جو میں نے خندہ پیشانی سے قبول کرتے ان کے ساتھ شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے جواباً اپنے دونوں ساتھیوں سے بات کر کے جواب دینے کا کہا۔

اس کے گھر میں اس کا والد، بھائی اور اس کے بیوی بچے تھے۔ گھر درمیانے درجہ کا تھا اس کے آخری حصہ میں دو کمرے الگ تھلگ بنائے گئے تھے۔ گھر اور کمروں کے درمیان دیوار بنا کر ایک چھوٹا سا دروازہ لگا کر اِدھر اُدھر جانے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ اس نے ایک چارپائی دیوار کے ساتھ لگاتے میرے لیے بستر ڈال دیا۔

دوسرے روز شہباز اور منظور بھی آ گئے۔ میرا دونوں سے تعارف ہوا۔ دونوں نے بڑی گرم جوشی سے مجھے قبول کیا اور یوں ہم چار ہو گئے۔ ہفتہ بھر ہو گیا

تھا مجھے سرور کے گھر رہتے ہوئے۔ نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کہی اور نہ ہی میں نے کوئی اظہار کیا۔ پھر منظور نے پروگرام بنایا کہ میں اس کے ساتھ چوری کے لیے نکلوں۔ میں نے تو کبھی چوری نہیں کی تھی۔ سو میں منظور کے ساتھ چوری کے لیے نکل پڑا۔ ایک ڈکیت اور قاتل چوری کرنے جا رہا تھا۔ رکشہ میں بیٹھتے منظور نے مجھے مخاطب کیا۔

''عمر بھائی! حوصلہ ہے نا؟''

میرے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر کر ڈوب گئی تھی۔ یہ کوئی پوش ایریا تھا جس میں منظور نے رکشہ چھوڑا تھا۔ شاید یہ کالونی نئی آباد ہوئی تھی کیونکہ گھروں کی آبادکاری اتنی نہیں تھی۔ کہیں کہیں روشنیاں تھیں ورنہ نامکمل گھر تعمیر کے مراحل میں ہی تھے۔ ایک ایسے ہی گھر کو منظور نے منتخب کیا جس کے ساتھ والے دو گھر ابھی زیرِ تعمیر تھے۔ پھر میری طرف گھومتے اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''عمر تیار ہو تم؟''

''ہاں تیار ہوں۔ بولو مجھے کیا کرنا ہے؟'' میں نے اپنا پسٹل ٹٹولتے جواباً اُس سے پوچھا۔

''پہلے تو جائزہ لینا ہے کہ کوٹھی کے اندر کوئی گارڈ وغیرہ تو نہیں اگر ہوا تو پھر ہمیں کوئی دوسرا گھر تلاش کرنا ہوگا۔'' منظور نے دھیمی آواز میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''ٹھیک ہے تم رُکو میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے دلیری کا مظاہرہ کرتے اُسے رُکنے کا کہا اور خود کوٹھی کے پچھواڑے کی طرف زیرِ تعمیر دیوار کے اوپر چڑھ کر اندر کا جائزہ لیا۔ گراج صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑی کے اوپر کپڑا پڑا تھا اور نیم تاریکی میں ڈوبی کوٹھی کے مکین اپنے اپنے کمروں میں بے خبر پڑے تھے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اندر کوئی سیکیورٹی گارڈ یا چوکیدار نہیں تو میں نے اُدھر کھڑے کھڑے اشارے سے منظور کو گرین سگنل دیا تو وہ بھی دیوار کے اُوپر آ گیا۔ پھر ہم کوٹھی کے اندر اُتر گئے۔

تمام دروازے بند ملے تو منظور نے کچن والے روشن دان کی گرل کھینچ کر اندازہ لگایا پھر اس نے مجھے بھی اشارہ کیا۔ ایک طرف سے اُس نے اور دوسری طرف سے میں نے پکڑ کر زور لگایا تو روشن دان کی گرل بمعہ فین کے ہمارے ہاتھ میں آ گئی۔ منظور میرے کندھے پر پاؤں رکھ کر اس روشن دان کے اندر کی طرف اُتر گیا۔ میں خبردار ہو کر دروازے کی طرف آ گیا۔ ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ مین دروازہ کھل گیا۔ منظور نے سر باہر نکالا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اندر آ گیا۔ پورے گھر میں ہُو کا عالم تھا۔ صرف فریج کی ہلکی سی آواز ڈائننگ ہال سے آ رہی تھی۔ صوفہ کی پشت پر پڑا بڑا سا کپڑا کھینچ کر منظور نے فرش پر بچھایا اور دیوار پر نصب ایل ای ڈی اُتار کر اس پر رکھی اور اِدھر اُدھر پڑا گھر کا سامان اکٹھا کرتے اس کے ساتھ رکھا اور پھر اس کو باندھ کر دوسرے صوفہ پر سے بھی کپڑا کھینچ کر اُتارا اور کچن میں آ کر اُدھر کا قیمتی سامان اس میں اکٹھا کرتے باندھا اور ایک گٹھڑی میرے سپرد کرتے باہر والے گیٹ کی طرف آتے اُسے آہستگی سے کھولا اور ہم باہر سڑک پر نکل آئے۔ ابھی کچھ قدم ہی اُٹھائے تھے کہ ایک کوٹھی کا گیٹ کھلا اور ایک گرج دار آواز آئی۔

''رُکو۔ کون ہو؟''

گھوم کر دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ کوئی گن مین تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں سنبھلتے اس نے فائر کھول دیا۔ فائر کی آواز پر آس پاس کی رہائشوں میں روشنیاں جاگ اُٹھیں۔ منظور کی ٹانگ پر لگنے والی گولی نے اسے زمین پر گرا دیا۔ میں نے تیزی سے اپنا بوجھ پھینک دیا اور اپنا پسٹل نکالتے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ میری پہلی گولی گن مین کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی اور وہ منہ کے بل زمین پر گرتے تڑپنے لگا۔ اسی اثناء میں کئی لوگ اسلحہ سمیت اِدھر اُدھر کے گھروں سے نکل آئے۔ میں نے لپک کر گن مین کی ریپٹر اٹھائی اور مقابلے کے لیے ڈٹ گیا۔ لوگ ہم پر ٹوٹ پڑے تھے۔ منظور لنگڑاتا ہوا زیرِ تعمیر گھر کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں دوسری جانب سے آنے والی گولیوں سے بچتا ہوا ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ فائرنگ کرنے والے انجان لوگ تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اس پورے ایریا میں ایک ہی

گھر نے گن مین رکھا ہوا تھا جس کو میری چلائی گولی نے زندگی سے آزاد کر دیا تھا۔ میں نے آواز دے کر منظور کو مخاطب، کیا کہ وہ بھاگ سکے گا۔ جواباً اس نے کہا کہ کوشش کروں گا۔ اسی اثناء میں دو نوجوان دلیری کا مظاہرہ کرتے ہماری جانب بڑھے اور قریب آتے ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔ میری وحشیانہ حس جاگ اُٹھی اور میں نے اندھا دھند ریپیٹر کے فائر کر کے دونوں کو قتل کر ڈالا۔ تین لاشیں زمین پر پڑیں تھیں اور لوگ ڈر کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ میں نے جلدی سے منظور کو سہارا دیا اور تیزی سے سڑک کی جانب گھوم گیا۔ گولیوں کی آواز سے پورا علاقہ گونج اُٹھا تھا۔ ابھی ہم کالونی کے کارنر پر ہی تھے کہ سامنے سے ایک لڑکا ریوالور تانے ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے ہٹنے کا کہا مگر اس نے فائر کر دیا۔ مجھے اس کی نوعمری پر ترس تو آیا اگر میں ذرا سا بھی چوک جاتا تو ہم دونوں وہیں ڈھیر ہو جاتے۔ ریپیٹر نے اس کا بھیجا اُڑا کر رکھ دیا۔ جدھر منہ اُٹھا ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ خالی کھڑے رکشہ میں بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے اسے چلنے کا حکم دیا۔ اس نے پوچھے بغیر رکشہ آگے بڑھا دیا۔ اس علاقہ سے کافی دور آنے پر منظور کو سنبھالتے اسے کرایہ دیا اور تھوڑی دور پیدل چل کر دوسرا رکشہ رکوایا۔ غریب آباد کا بتا کر بیٹھ گئے۔ اسی طرح دو اور رکشے بدل کر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ جب ساتھیوں نے ساری کارروائی سُنی تو سب کے رنگ اُڑ گئے۔ چار قتل اور وہ بھی میرے ہاتھوں۔ اب سب سے بڑی پریشانی منظور کی ٹانگ میں لگے کارتوس کے چھرے تھے۔ ان کو نکالنا بے حد ضروری تھا۔ اُدھر شہر بھر میں ڈکیتی کے دوران ہونے والے چار قتل پولیس کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے۔ پورے شہر کی ناکہ بندی ہو چکی تھی۔ اس لیے، منظور کو لے کر کسی ہسپتال میں جانا یا کسی ڈاکٹر کو اپنے پاس لے کر آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آخر کار میں نے ان کو مشورہ دیا کہ تم میں سے ایک جا کر سرجیکل سٹور سے نشتر، چمٹی اور آیوڈین سپرٹ وغیرہ لے آئے۔ چھوٹے چھوٹے چھرے ہیں خود ہی کوشش کر کے نکال لیتے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔'' کہتے ایک ساتھی گھر سے نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا شاپر تھا۔ ہم نے مل کر نشتر وغیرہ کو گرم پانی میں کافی دیر تک پکایا پھر بڑی احتیاط سے نشتر اور چمٹی سے چھرے نکالے اور آیوڈین سپرٹ سے ان زخموں کو صاف کر کے ان پر پلاسٹر لگا دیا۔ درد کے لیے وہ سیرپ لایا تھا، میں نے منظور کو اُسی پر اکتفا کرنے کا مشورہ دیا۔ چوری تو ناکام ہو گئی۔ اب ہمیں بہت سے دِن انڈر گراؤنڈ رہ کر بات ٹھنڈی ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

رات کو ہم میں سے کوئی ایک ساتھی گھر سے نکل کر سامانِ خورد و نوش لے آتا اور ہم دن رات ڈش پر ڈرامے، فلمیں وغیرہ دیکھتے رہتے۔ اسی طرح بارہ دن گزر گئے۔ منظور اب ہر طرح کے خطرے سے باہر تھا۔ ایک دو بڑے زخموں کے سوا سارے زخم ٹھیک ہو چکے تھے۔ پاس پڑے سارے پیسے اب نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس لیے میں ہمت کر کے گھر سے نکلا اور گھومتا ہوا صدر بازار کی طرف نکل آیا۔ بینک میں لوگوں کا رش تھا۔ میری نظر کسی ایسے شکار کی تلاش میں تھی جو آسانی سے قابو آ جاتا۔ آخر کار ایک آدمی جو اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب ہاتھ سے ہموار کرتا بینک سے باہر نکلا اور پیدل ہی ایک طرف چل پڑا، میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے اپنی جیب میں رقم سنبھالی ہوئی تھی۔ میرا اور اس کا فاصلہ درمیانی حد تک تھا۔ وہ بازار چھوڑ کر چھوٹی سے گلی میں گھوم گیا۔ بس یہی وقت تھا میرے پاس۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے بے خبر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بالکل اس کی بغل میں پہنچ کر میں نے پسٹل کی نالی اس کے ساتھ لگاتے اسے خبردار کیا کہ اگر ذرا سا بھی کوئی ہنگامہ کیا تو اِدھر ہی ڈھیر کر دوں گا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا اور خوفزدہ ہوتے آہستہ آواز میں بولا ''لے لو سب کچھ مجھے چھوڑ دو۔'' کہتے اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھے کرنسی نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے جھپٹ کر اس

کے ہاتھ سے پکڑتے اُسے کرخت آواز میں کہا آگے چلتے رہو۔ گھوم کر دیکھا تو گولی سے اُڑا دوں گا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں وقت ضائع کیے بغیر گلی میں واپس سڑک کی طرف گھوم گیا اور بغیر راستہ کا تعین کیے جدھر منہ اُٹھا بھاگ پڑا۔ خوش بختی سے خالی گزرتا رکشہ نظر آ گیا۔ ہاتھ سے اُسے رکوایا اور ہسپتال کا کہہ کر بیٹھ گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے مجھے کوئی ایمرجنسی ہو۔ کافی نوٹ تھے ہزار ہزار کے۔ میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر رکشے والے کو دیا اور تیزی سے اُتر کر ہسپتال کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور پھر باہر آ کر رکشہ لیا۔ اسٹیشن کا بتا کر بیٹھ گیا۔ اسی طرح دو تین رکشے بدل کر گھر پہنچ گیا۔ راستے میں رقم گنی، پورے تیس ہزار تھے۔ پانچ الگ کرتے میں نے بقایا سنبھالتے ان کو پانچ ہزار کی ڈکیتی بتائی۔ اسی طرح تیسرے چوتھے دن میں اکیلا ہی نکلتا اور کوئی نہ کوئی واردات کر کے صحیح سلامت لوٹ آتا۔

اسی دوران میں نے شکار پور جانے کا ارادہ کیا اور ایک رات چپکے سے ٹرین میں سوار ہو کر شکار پور پہنچ گیا۔ اپنے شہر آ کر عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ ایک ہوٹل میں کمرہ لیا، چوری چھپے گھر والوں کو دیکھ لیتا مگر ان کے سامنے جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ اسی طرح شام کو اپنے گھر کی گلیوں سے ہو کر واپس آ رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار لڑکا سڑک پر اِدھر اُدھر لوگوں کو جھکے دیتا بُری طرح موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ میں بھی اس سے بڑی مشکل سے بچا۔ ابھی میں سنبھلا ہی تھا کہ وہ دوبارہ پھر میری طرف لپکا۔ یکدم میرے اندر کا قاتل کروٹ لے کر بیدار ہو گیا۔ میرے پسٹل سے نکلی گولی نے اسے موٹر سائیکل سمیت کٹے درخت کی طرح سڑک پر لوٹ پوٹ کر دیا۔ یکدم ٹریفک رُک گئی۔ میں پسٹل لہراتا ہوا اسے تڑپتا چھوڑ کر لوگوں کی بھیڑ میں گڈ مڈ ہو گیا۔ سامان تو میرے پاس تھا نہیں اس لیے رکشہ پکڑ کر ہائی وے روڈ پر آ گیا۔ ایک ٹرک والے سے بات کر کے واپس حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔

میری سفاکیت کا اب یہ عالم ہو چکا تھا کہ اگر ہوا تیز چلتی تو میں اسے بھی روکنے کی کوشش کرتا۔ حیدر آباد آ کر میں نے خود کو روپوش کرنے کا وہی پرانا حل نکالا اور مہندی بنانے والے کارخانے میں بطور لیبر بھرتی ہو گیا۔ رہائش بھی مجھے کارخانہ کے کوارٹر میں مل گئی۔ مجھے اِدھر آئے بیس، اکیس روز ہو چکے تھے اور میں بہت کم باہر آتا جاتا تھا۔ حیدر آباد پولیس مجھے تلاش کرنے میں سرگرداں تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ میری کوئی بھی تصویر وغیرہ ان کے پاس نہیں تھی اور نہ ہی میں پولیس کی نظروں میں آیا تھا۔ ڈکیتی کے مقابلوں میں غیر پولیس والوں نے اگر دیکھ کر میرا حلیہ پولیس کو دوران موقع واردات بتا دیا ہو تو وہ میرے علم میں نہیں تھا۔ اب میں حیدر آباد میں دن دہاڑے بھی لوگوں کو اسلحہ کے زور پر روک کر ڈکیتیاں کرنے لگا تھا۔

آج بھی میں پھلیلی تھانہ کی حدود میں ناکہ لگا کر لوگوں کو لوٹ رہا تھا کہ کسی لٹنے والے نے تھانہ پھلیلی کے انچارج رانا پرویز کو فون پر بتا دیا کہ کوئی ڈاکو ناکہ لگا کر لوگوں کو لوٹ رہا ہے۔ پولیس پارٹی نے وقت ضائع کیے بغیر مجھے گھیر لیا۔ جتنا بھی مقابلہ کر سکا کیا پھر رانا پرویز ایس ایچ او تھانہ پھلیلی مجھے للکارتا ہوا اس بات کی پروا کیے بغیر میرے سامنے آ گیا۔ میں نے سیدھا فائر اس پر کیا۔ شاید میرے پسٹل کی آخری گولی تھی جو میں نے ایس ایچ او پھلیلی تھانہ پر داغ دی۔ اس نے جواباً مجھ پر فائر کھول دیا۔ میری چلائی گولیاں پولیس موبائل گاڑی پر لگیں مگر ملازم بچ گئے۔ اس اندھا دھند فائرنگ سے مجھے آٹھ گولیاں لگیں۔ پتا نہیں میں بچتا ہوں یا مرتا ہوں مگر اب میری دُعا ہے کہ مجھ جیسے گندے ناسور کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ میرے ہاتھوں قتل ہونے والے لوگ میرے تصور میں آ کر مجھے ہر وقت خوفزدہ کرتے ہیں۔ میں اگر پڑھائی سے اُکتا کر یوں گھر سے نہ بھاگا ہوتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ کہہ کر عمر خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

پلیٹ فارم نمبر کی دوسری خصوصی کہانی



# نہلے پہ دہلا



وقاص حسین

حق دار کو اس کا حق دلانے کے لیے دوستوں نے وہ سب ممکن کر دکھایا جو کبھی ممکن نہ ہوسکتا تھا

گھڑی کے نینوسیکنڈ اور دل کی دھڑکن تقریباً ایک ہی سپیڈ کے ساتھ چل رہی تھی جیسے جیسے ٹرین کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ دل کی گھبراہٹ بڑھ رہی تھی اور دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ گرمی کے موسم میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ یہ سب مجھ اکیلے کے ساتھ نہیں ہو رہا تھا بلکہ میرے ساتھ موجود دس لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن پھر بھی ہم ہمت باندھے ہوئے تھے ڈر ہر ایک کے دل میں تھا لیکن اپنے مقصد سے ہٹنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ اس سفر کے اختتام کے بارے میں ہر کوئی اچھے سے جانتا تھا کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم ہر قسم کے انجام سے باخبر تھے۔ ہمیں خبر تھی کہ ہم میں سے کوئی جان سے ہاتھ بھی دھو سکتا ہے یا پھر تین چار افراد کی جان بھی جا سکتی ہے یا پھر ہم دس کے دس سلاخوں کے پیچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سب کے باوجود بھی ہمیں آج یہ سفر ہر حال میں کرنا تھا کیونکہ یہ ہمارے لیے آخری موقع تھا اگر ہم یہ کھو دیتے تو کسی کے جینے کا مقصد کھو جاتا کوئی جیتے جی مر جاتا یا پھر ایک دن خودکشی کر لیتا اور وہ ہماری زندگی تھا اور زندگی کو کون کھونا چاہتا ہے؟ اس پلیٹ فارم پر آنے سے پہلے ہم نے جو کچھ دن گزارے تھے اس میں ہم نے اپنی تمام جمع پونجی اور دماغ سارے کا سارا صرف کر دیا تھا۔ ہمیں اس سفر کے آخر میں جینا تھا مرنا تھا یا سلاخوں کے پیچھے جانا تھا یا اپنے مقصد میں سرخرو ہونا تھا ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ہم ان ٹرینڈ اور نان پروفیشنل تھے۔

ٹرین کے پریشر ہارن نے سب کے دل کی دھڑکنوں کو بڑھا دیا تھا۔ اور کچھ کی تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ ان کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

ٹرین آ کر لاہور پلیٹ فارم پر رک گئی۔ اور اب اسے آدھے گھنٹے بعد یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ مسافروں میں ہلچل شروع ہوگئی تھی۔ ٹرین رک چکی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد ٹرین کے ساتھ ڈبے جوڑنے کا عمل شروع ہو گیا۔ لاہور سے دس ڈبے اور لگے تھے اور پھر ٹرین نے آگے روانہ ہونا تھا۔

ڈبے لگ چکے تھے اور اب ہر مسافر اپنے ڈبے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ہر ایک کو سوار ہونے کی جلدی تھی کہ کہیں ٹرین میں چڑھنے سے رہ ہی نہ جائے۔ اور پھر باری باری ہم سب نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور ایک دوسرے سے آئی کنٹیکٹ کیا تھا۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب کے سب ٹرین میں داخل ہونے لگے



تھے۔ گھبراہٹ ہر ایک کی آنکھوں سے عیاں ہو رہی تھی لیکن کوئی بھی اپنے قدم پیچھے ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ٹرین نے ہارن دیا تھا اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ ہم میں سے کچھ گھبرائے کچھ اطمینان سے تو کچھ بغیر کسی پرواہ کیے کھڑے اور بیٹھ چکے تھے۔ ہم لوگ اپنی منزلوں سے بے خبر بس ایک ہی پوائنٹ کو سوچے جا رہے تھے۔

☆☆☆

عائز کی کہانی سن کر تقریباً سبھی شاک میں تھے اور ہر ایک کے لہجے اور چہرے سے اس کے لیے ہمدردی جھلک رہی تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہمدردی کے بول اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے اور اس کا فیوچر ہمدردی سے نہیں چل سکتا تھا۔

عائز پچھلے ایک ہفتے سے یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا۔ اور کال کرنے پر کال اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد اس کا نمبر بھی بند ہو گیا۔ اور گروپ کے سبھی لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ اور پھر آج سب نے مل کر اس کے ہوسٹل جانے کا پروگرام بنایا تا کہ معلوم کیا جا سکے کہ آخر کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ جو وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ اور اس نے اپنا نمبر بھی بند کر دیا ہے۔ اور پھر جب اس کے کمرے میں پہنچے تو اس کی حالت دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ اس کی حالت ایک ہفتے میں ہی اتنی گر گئی تھی کہ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ برسوں سے بیمار ہو۔ جسم کو ہاتھ لگایا تو ایسا

محسوس ہوا جیسے آگ دہک رہی ہو۔
سب اس کو ڈاکٹر کے پاس جانے کا اصرار کر رہے تھے لیکن وہ کسی کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔اور پھر مناہل اور صادق اس کو زبردستی کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے۔انجکشن اور دوا نے اسے ایک گھنٹے میں کافی پرسکون کیا تھا۔عائز سے اس سب کی وجہ پوچھ رہے تھے اور وہ بس وقفے وقفے سے رو رہا تھا۔جس سے سب لوگ پریشان ہورہے تھے۔وہ جو پہاڑ کی طرح مضبوط حوصلہ رکھتا تھا اس کے ساتھ ایسا کیا ہوگیا کہ اس کی حالت اتنی ابتر ہوگئی۔تین گھنٹے گزر چکے تھے۔عائز ایک ہی حالت میں بیٹھا ہوا تھا اور گہری سوچ میں گم تھا۔اور اب وہ سب کچھ سنانے کے لیے اپنا حوصلہ اور الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔اور پھر اس نے بولنا شروع کیا۔

میں جسے پچھلے پندرہ سال سے ایکسیڈنٹ سمجھتا رہا تھا وہ حقیقت میں قتل تھا۔سبھی کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔کیونکہ عائز نے انہیں بتایا تھا کہ اس کے امی ابو کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور اس کے ابو موقع پر دم توڑ گئے تھے جبکہ اس کی امی کی ڈیتھ ہسپتال جا کر ہوگئی تھی۔جب وہ صرف سات سال کا تھا۔اس نے بتایا تھا کہ اس نے امی ابو کے ساتھ جانا تھا لیکن اسکول میں فائنل کے امتحانات چل رہے تھے۔اس لیے امی ابو اس کو اپنے ساتھ نہیں لے کر گئے تھے۔وہ اکیلے ہی چلے گئے تھے ان کو تایا سے بہت ضروری کام تھا۔اس لیے ان کو مجھے چھوڑ کر جانا پڑا۔

اور اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایکسیڈنٹ نہیں قتل تھا۔اس بات نے ان سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔اور سبھی عائز کی طرف سوالیہ نظروں سے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔وہ ایک بار پھر بولا تھا۔

میں ایک ہفتہ پہلے اپنی کوٹھی پر گیا تھا تو وہاں کوئی اور ہی لوگ موجود تھے۔(ماں باپ کے مرنے کے بعد عائز ہوسٹل منتقل ہوگیا اور کوٹھی ملازموں کے حوالے کر دی گئی تھی۔عائز چھٹیوں میں اپنے گھر جاتا ورنہ ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔میں نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے ہم نے یہ کوٹھی دو مہینے پہلے خریدی ہے۔مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔کوٹھی تو میری ہے پھر انہوں نے کس سے خرید لی۔معلوم کرنے پر پتا چلا کہ میرے تایا نے یہ کوٹھی ان کو تین کروڑ میں فروخت کی ہے۔ایک کروڑ ادا کر چکے ہیں اور باقی اگلے مہینے ادا کرنے ہیں۔میں نے تایا کو کال کی تو انہوں نے کال اٹینڈ ہی نہیں کی۔میں نے چار پانچ بار کال ملائی لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔اور پھر میں نے اپنے ملازم کو کال کی جو یہاں پر رہتا تھا۔وہ Basically رحیم یار خان کا اور تایا کے گاؤں کا ہی تھا۔اس نے بتایا کہ میرے تایا نے کوٹھی فروخت کر دی تھی اور مجھے بتانے سے منع کیا تھا اور پھر اس نے کال کاٹ دی شاید کوئی آ گیا تھا۔میں پریشانی کی حالت میں واپس ہاسٹل آ گیا اور بار بار تایا کو کال کر رہا تھا اور وہ اٹینڈ ہی نہیں کر رہے تھے۔اور پھر جب انہوں نے کال اٹینڈ کی تو کاٹ کھانے کو دوڑے۔میں نے جب پوچھا تو کہنے لگے کون سی کوٹھی اور کس کی کوٹھی۔وہ تمہارے باپ کے کمائے ہوئے پیسوں سے نہیں بنی تھی وہ پیسے میں نے ہی دیے تھے۔اس پر تمہارا کوئی حق نہیں تھا۔اور جو میں تمہیں اتنے سالوں سے پڑھا رہا ہوں وہ بھی میرا احسان سمجھو۔اور دوسرا میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع کروا دی ہے اس کو بھی میرا احسان سمجھو۔اس سے اپنا کوئی کاروبار شروع کر لو اور دوبارہ مجھے کال کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔مجھے تو ان کی بات پہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایسا کچھ بھی کر سکتے ہیں۔میں تو سکتے کے عالم میں تھا۔

بینک سے پتا چلا کہ کچھ دن پہلے میرے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ جمع ہوئے تھے۔اور پھر دو دن بعد مجھے اس ملازم کی کال آئی جسے سن کر میرا ہر رشتے پر سے اعتبار اُٹھ گیا۔اور مجھ سے جینے کی اُمید بھی چھن گئی۔

اس نے بتایا کہ اس نے کچھ دن پہلے چوہدری اور اس کے بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی ہے جو کچھ اس طرح تھی۔وہ بول رہا تھا کہ اس کمینے کی قسمت اچھی تھی کہ اس وقت بچ گیا اگر تب ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ مر گیا ہوتا تو اب اس کا یہ جھنجھٹ ہی نہیں ہوتا۔مطلب یہ کہ میرے ماں باپ کا ایکسیڈنٹ ایک

سوچی سمجھی چال تھی۔ان کو تایا نے زمین بانٹنے کے بہانے بلایا تھا اور ایکسیڈنٹ کروایا تھا۔اور میری ماں جب بچ گئی تو ڈاکٹرز کے ساتھ مل کر زہر کا انجکشن لگوا کر مروا دیا تھا۔اور اس سب کو ایکسیڈنٹ کا رنگ دے کر ساری زمین پر قبضہ جما لیا۔ساتھ ہی میرے والد کے کاروبار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔اور مجھے ہوسٹل داخل کروا دیا۔اور اب وہ لوگ رحیم یار خان میں کوئی فیکٹری لگانا چاہتے ہیں۔اس لیے میرے والد کے کاروبار کا سودا بیس کروڑ میں طے کر دیا اور اب پندرہ بیس دن تک اس سے پیسے لینے کے لیے آنا ہے اور ساتھ ہی پیپر ورک بھی کرنا ہے۔‘‘

سبھی حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کوئی اس حد تک بھی گر سکتا ہے کہ اپنے بھائی کو ہی مروا دے۔وہ اب یہ سوچ رہے تھے کہ اتنے ذلیل انسان نے عائز کو کیسے چھوڑ دیا۔شاید اس لیے کہ لوگوں کو کہیں شک ہی نہ ہو جائے کہ اس کا ہی ہاتھ تھا اس کے ماں باپ کے ایکسیڈنٹ کے پیچھے۔

جبران نے عائز کا بیگ پیک کیا تھا اور اس کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔کیونکہ کوئی بھی اُس کو وہاں ہوسٹل میں اکیلا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔سب نے مل کر فیصلہ کیا اور جبران اُسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

ہر ایک نے اپنے ماں باپ سے بات کی لیکن کوئی بھی پرائے معاملے میں کودنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔اور پھر وہ بھی اُس بندے کے ساتھ جس کا سیاسی اثر و رسوخ بہت زیادہ ہو۔بلکہ انہوں نے بچوں کا حقیقت سے سامنا کروایا کہ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔اور یہ حقیقت بھی تھی۔

لیکن بچوں کو کون سمجھائے اور وہ بھی آج کی نسل کو۔

جب سب اپنے بڑوں سے ناکام ہو گئے تو وہ سب مل کر کچھ ایسا سوچنے لگے جس میں بڑوں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ان کا ہر دن سوچوں میں گم گزرتا کہ آخر کار وہ انجینئرنگ کے سٹوڈنٹ کریں تو کیا کریں۔

’’میں نے سب سن لیا ہے‘‘ ’’جے‘‘ جو کچھ جے 7 نے کہا وہ بھی۔یار وہ دراصل ایک بہت خوبصورت حسین پری چہرے کو دیکھ لیا تھا۔بس اس کے حسن میں ڈوب گیا تھا۔اور میں نے سنا ہی نہیں کہ کیا پکار رہے ہو۔‘‘

’’تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔تم لوگ جانتے ہو۔تم لوگ کیا کہہ رہے ہو۔جو تم لوگ کہہ رہے ہو اور کرنے کا سوچ رہے ہو وہ ایک دم بیوقوفی ہے۔تم لوگ یہ سوچ رہے ہو کہ ویٹر بن کر اُس کے کمرے میں گھس جاؤ گے اور اسے بے ہوش کر کے رقم نکال کر لے اڑو گے۔یہ کوئی فلم نہیں چل رہی اور نہ ہی تم لوگ کوئی ہیرو ہو۔بائیس کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں۔جس کو بغیر سیکیورٹی کے وہ رکھے گا۔کم از کم بھی پانچ سے دس لوگ ہوں گے اس کے ساتھ اور وہ بھی اسلحہ سے لیس۔اور ہم سے معمولی سی بھی غلطی ہوئی تو اس کا مطلب ہے ہم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔‘‘

’’اچھا تو تم کیا چاہتے ہو فیضان کہ ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور اپنے دوست کے لیے کچھ بھی نہ کریں۔‘‘ مریم تلخی سے بولی تھی فیضان کی بات سن کر۔

’’یار وہ سامنے میڈم آ رہی ہے آؤ اسے I Love You بول کر آتے ہیں۔‘‘ یاسر نے جبران کو مخاطب کر کے کہا۔

مناہل نے غصے سے یاسر کی طرف دیکھا تھا اور بولی تھی کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔ہر وقت مذاق ہر وقت مذاق۔‘‘

اور یہ ایک گھنٹے سے تم لوگ کیا کر رہے ہو مذاق ہی تو چل رہا ہے۔تم لوگ تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے آگے حلوہ ہو سب۔وہ سوچو جو ممکن ہو بچوں والی باتیں مت کرو۔ہم روم سروس بن کر جائیں گے۔ان لوگوں کے کھانے میں بیہوشی کی دوائی ملا دیں گے یا اغوا کر لیں گے۔تم لوگ فلم بنا رہے ہو جو سب تمہاری مرضی سے ہو گا۔وہ سوچو جو ممکن ہو سکے۔‘‘ یاسر نے منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

کل عائز کے ملازم کا پھر فون آیا تھا کہ چوہدری کچھ دنوں تک لاہور آ رہا ہے اور وہ باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے دوسری پارٹی سے ساری رقم نقد لینی ہے کیونکہ اگر بنک سے ٹرانسفر کرواتے تو اس پر اچھا خاصا ٹیکس لگے گا۔اس ٹیکس سے بچنے کے لیے انہوں نے پارٹی سے نقد رقم کا کہا تھا۔

اور اب جب سے ان کو یہ پتا چلا تھا تو اب سب یہ کہہ رہے تھے کہ یہ سنہری موقعہ ہے رقم دوبارہ حاصل کرنے کا۔ لیکن ان کے پاس کوئی پلان نہیں تھا۔ اور وہ جو سوچ رہے تھے وہ سننے میں تو بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس پر عمل کرنا تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ ہر کوئی اپنا پلان بتا رہا تھا لیکن اس کو فالو ناممکن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ہر کوئی اپنی جگہ سنبھال چکا تھا۔ j3 اور j ایک ساتھ ٹرین کے دروازے میں کھڑے تھے۔ جبکہ j2 اور j5 دوسرے ڈبے کے دروازے میں کھڑے تھے۔ j8 اور j7 اپنی سیٹ سنبھال چکی تھیں۔ اور j4 ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں گھوم رہا تھا۔ j9، j6 اور j10 اپنی سیٹ سنبھال چکے تھے۔ اب ہر کوئی اپنے اردگرد کی ساری معلومات ایک دوسرے کو بتا رہا تھا۔ دس افراد کی یہ ٹیم تین ڈبوں میں مختلف جگہ پر ڈیرہ جما چکی تھی۔ اور اب آگے کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے تھے کیونکہ عین موقعے پر آکر جو تبدیلی آئی تھی اس نے سارے کا سارا پلان ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ جو کچھ وہ سوچ کر آئے تھے یہاں سب اس کے الٹ ہو گیا تھا۔ پلان میں اتنی بڑی تبدیلی بھی آسکتی ہے ان کو اس بات کی امید نہیں تھی۔ اور اس تبدیلی کا ٹرین کے آنے سے صرف دس منٹ پہلے پتا چلا تھا۔ ایک پل کے لیے تو سب کی امید ٹوٹ گئی تھی۔ سب کچھ اب ناممکن سا لگ رہا تھا لیکن پھر سب نے ہمت اکٹھا کی تھی اور ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔ سب کچھ آنے والے وقت کے سہارے پر چھوڑتے ہوئے انہوں نے سفر کرنے کی ٹھان لی تھی۔

اب جبکہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ سنبھال چکا تھا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں ہر پل گزرنے کے ساتھ تیز اور تیز تر ہو رہی تھیں۔ وہ سب بس جیسے تیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اور اب ان سب کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

☆☆☆

چوہدری کو آئے آج دوسرا دن تھا۔ اور عائز کے ملازم کے ساتھ ان کا ایک دفعہ رابطہ ہوا تھا۔ اور اس نے پہنچنے کا بتایا تھا کہ ہم پہنچ گئے ہیں اور اب پارٹی سے دو دن بعد کی ملاقات ہے۔ وہ پیسے کا انتظام کر رہے ہیں کیونکہ چوہدری نے پانچ ہزار والے نوٹ مانگے تھے ان سے۔ اس وجہ سے ان کا ٹائم لگ رہا تھا رقم ارینج کرنے میں۔

عائز نے جبران کے کہنے پر اس سے کہا تھا کہ ہم سے آ کر ملے۔ تاکہ کچھ نہ کچھ پلان کیا جائے۔ کیونکہ آگے کا اگر کوئی پلان بنتا ہے تو اس کے ملازم کے بغیر تقریباً ناممکن ہے۔ ان کو ایک ایسے بندے کی ضرورت تھی جو چوہدری کے پل پل کی خبر دے۔

اور اگلے دن وہ بہانہ بنا کر ملنے چلا آیا تھا۔ اور پھر اس نے کافی ساری معلومات لی تھیں اور اس کو اپنے ساتھ ملانے کی بات کی تھی اور وہ فوری راضی ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اپنے مالکوں کا بدلہ لینے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں چاہے تو اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اور پھر جبران نے اس کو ایک سم دی تھی کہ اب اگلی بار سے تم نے اس سم سے ہم سے رابطہ کرنا ہے اپنی سم سے نہ کوئی کال کرو گے اور نہ ہی سنو گے۔ اور پھر اس نے اب تک کی سبھی معلومات دی تھی کہ پیسوں کا انتظام نہیں ہو رہا۔ دو چار دن لگیں گے۔ چوہدری اپنے بیٹے سمیت پانچ آدمیوں کے ساتھ آیا تھا اپنی گاڑی میں۔ گاڑی کا ڈرائیور شامل کر کے چھ بندے بنتے تھے۔ دو بندوں اور ایک چوہدری کے دوست نے ابھی آنا ہے۔ انہوں نے ہوٹل میں رہنے کا انتظام کیا تھا۔ اور پھر اگلے دو دن میں کچھ اور معلومات ملی تھیں جبران والوں کو۔ جو انہوں نے اس ملازم کے ذمے لگا دیا تھا۔

چوہدری اور اس کا بیٹا سارا دن گھومنے پھرنے میں گزارتے ہیں۔ کھانا وہ باہر سے کھاتے ہیں۔ ہوٹل سے تو وہ پانی کا ایک گلاس تک نہیں پیتے۔ اور دو آدمی اسلحے کے ساتھ ان کی گاڑی میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

اب جو انہوں نے اغوا اور کھانے میں کچھ ملا کر کھلانے والی پلاننگ کی تھی وہ سرے سے ہی ختم اور فلاپ ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے کچھ اور سوچنا تھا کیونکہ وہ دونوں پلان ناکارہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

"یار تمہارا دماغ چل گیا ہے جو تم ایسی باتیں کر رہے

ہو۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے یہ فلم نہیں جہاں ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی کر سکتے ہیں اس حقیقی زندگی میں ایسی باتیں ناممکن ہوتی ہیں۔ اور جو تم سوچ رہے ہو اپنے دل سے بتاؤ ایسا ممکن ہے؟" یاسر ہمیشہ کی طرح پھر بول پڑا تھا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے شاید ہمیں کامیابی مل جائے۔ اور تم نے عائز کی حالت دیکھی ہے جو اتنے دن گزرنے کے بعد بھی نہیں سنبھل رہی۔ اگر ہماری کوشش کامیاب ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی بدل سکتی ہے۔ اور پھر دوست ہوتے کس لیے ہیں اگر انہوں نے مشکل میں کام ہی نہیں آنا تو۔ بس تم ہمیں یہ بتاؤ تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں۔" جبران نے یاسر سے دوٹوک بات کی تھی۔

"اس کو تو تم رہنے ہی دو تو اچھا ہے۔ اس کو نہ کبھی کسی کا احساس ہونا ہے اور نہ ہی اس نے کبھی سیریس ہونا ہے۔ اس سے باتیں بنوا لو جتنی تم بنوا سکتے ہو۔" مناہل نے سخت لہجے میں کہا تھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مریم، عروج اور عنایہ گل بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور پھر مناہل بولی تھی کہ باقی کی پلاننگ شام کو کریں گے۔

"یار تم نے شامل ہونا ہے تو تمہاری مرضی ورنہ ہم تمہیں فورس نہیں کریں گے اور نہ ہی تم سے ناراض ہوں گے۔ جس نے بھی شامل ہونا ہے اپنی مرضی اور ذمہ داری سے شامل ہونا ہے۔ کچھ بھی اونچ نیچ ہو جاتی ہے تو وہ خود ذمہ دار ہوگا۔" جبران نے کہا تھا اور پھر سب اُٹھ کھڑے ہوئے تھے کیونکہ ان کی کلاس کا ٹائم شروع ہو گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ آج انہیں ایک اور خبر ملی تھی اور ان کی دم توڑتی امید پھر سے زندہ ہو گئی تھی۔ عائز کے ملازم کی آج کال آئی تھی۔ عائز کے ملازم نے بتایا تھا کہ کل رقم ملی ہے اور چوہدری نے ٹرین سے جانے کا ارادہ بنایا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم اپنی گاڑی پر جاتے ہیں تو ڈاکہ بھی پڑ سکتا ہے۔ اور بس وغیرہ میں جاتے ہیں تو بھی یہی خطرہ رہے گا۔ صرف ٹرین ہی محفوظ سفر ہے جس میں ڈاکہ نہیں پڑے گا۔ اور اب جبران اور باقی ساتھیوں نے ٹرین میں ان کو لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا جو کہ بالکل ناممکن نظر آرہا تھا۔ ٹرین میں اتنے لوگوں کے درمیان اتنی بڑی رقم لے کر رفو چکر ہو جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پیسے ہتھیانے کیسے ہیں یہ سب سے بڑا سوالیہ نشان تھا۔ جس کی طرف یاسر سب کو متوجہ کروا رہا تھا لیکن اس کے پوائنٹ کو کوئی بھی سیریس نہیں لے رہا تھا۔

"یار یہ امپوسیبل ہے اتنا بڑا پروجیکٹ ایک رات میں کبھی بھی مکمل نہیں ہوگا۔ ہم کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔" سلطان نے مناہل اور جبران کا پلان سن کر کہا تھا۔

"دنیا میں کچھ بھی امپوسیبل نہیں ہے۔ پوسیبل اور امپوسیبل صرف انسان کے دماغ میں ہوتا ہے۔ جو کام دماغ کو آسان محسوس ہوتا ہے وہ اس کے لیے پوسیبل ہو جاتا ہے اور جو مشکل نظر آتا ہے وہ امپوسیبل ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کے خود پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ اگر تم نے ایک بار ہار تسلیم کر لی تو جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاؤ گے۔ اس لیے اپنے ذہن کو مضبوط رکھو جو یہ کہتا ہے نہیں ہو سکتا اس کو وہ کر کے دکھاؤ اور ہمارے پاس آج رات کا ہی نہیں بلکہ کل دوپہر تک کا وقت ہے۔ اور ہم یہ کر سکتے ہیں۔ ہم ابھی نکلتے ہیں اور جس جس جو سامان کی ضرورت ہے وہ لے کر آتے ہیں۔ ہم دس لوگ ہیں مل کر یہ کام کریں گے تو وقت سے پہلے ہی سب کچھ تیار ہو جائے گا۔ اور باقی کا جو صبح کا کام ہے وہ صبح کریں گے۔ اب اُٹھو سب اور جس کے پاس جتنے پیسے ہیں وہ تیار کر لو کیونکہ اب ان کی بہت ضرورت پڑنے والی ہے۔"

☆☆☆

ٹرین نے شہر سے باہر آتے ہی سپیڈ پکڑ لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سب کے دل کی دھڑکنوں نے بھی سپیڈ پکڑ لی تھی۔

اور کچھ کے تو ہاتھ پاؤں بھی سُن ہو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ٹینشن سے کبھی وہ اپنے دانتوں سے ناخن چباتے کبھی پاؤں ہلاتے تو کبھی اٹھ کر چلنا شروع کر دیتے۔

"j !!....Me and j8 are moving.We start play......"

"Alert.....O.K رہنا اور کچھ بھی گڑ بڑ محسوس

ہوتو فوری جگہ چھوڑ دینا۔ "Best of luck"

مناہل اور عنایہ گل اپنی جگہ سے اٹھی تھیں جن کو اُٹھنے کے لیے j5 اور j3 نے کہا تھا کہ بی بی یہ جگہ ہماری ہے۔

مناہل اور عنایہ گل وہاں سے چلتی ہوئی آئی تھیں اور اپنے ٹارگٹ کے قریب والے برتھ کے پاس رک گئی تھیں۔دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور چہرے پر پریشانی نظر آرہی تھی اور متمناتی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔جیسے بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کررہی ہوں۔

"j8 and j7 You are looking natural.Carry on" 4j نے ٹکڑا لگایا تھا جس پر دونوں کو ہی بے تحاشا غصہ آیا تھا لیکن وہ بولی کچھ نہیں تھیں۔مناہل اور عنایہ گل بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں کہ سیٹ مل جائے اور ایسا کرتے ہوئے دو تین بار چھوٹے چوہدری یعنی چوہدری کے بیٹے سے نظریں ملی تھیں۔بیس پچیس منٹ کا سفر ایسے ہی گزر گیا دونوں نے دنیا جہان کی تھکاوٹ اپنے چہرے پر سجا لی تھی۔اور بار بار کبھی ایک پاؤں کا سہارا لے کر کھڑی ہوتیں اور کبھی دوسرے پاؤں پر سارا وزن ڈال کر کھڑی ہوتیں۔اور پھر مطلب پورا ہوگیا جس کے لیے یہ ساری ایکٹنگ ہورہی تھی۔مطلب چھوٹے چوہدری نے اپنے بندے کو سیٹ سے اُٹھا دیا اور ان کو بڑے تمیز دار لہجے میں بیٹھنے کا کہا۔اور پھر دونوں نے شکریہ ادا کر کے جگہ سنبھال لی تھی۔

اور پھر دس پندرہ منٹ کا سفر خاموشی سے گزرا تھا اور پھر چوہدری کے بیٹے نے بوتل نکالی تھی اور پینے لگا تھا۔اس نے ان دونوں سے پوچھا تھا لیکن دونوں نے انکار کردیا تھا۔دونوں بظاہر تو لاپرواہی دکھا رہی تھیں لیکن دونوں بڑے غور کے ساتھ پورے کیبن کا جائزہ لے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوکر چھوٹا چوہدری بولا تھا۔

"آپ لوگ کہاں جارہے ہیں۔" بڑے اخلاق سے سوال کیا گیا تھا۔

"وہ دراصل ہم خانیوال جارہے ہیں۔اس کی پھوپو اور میری خالہ کا اچانک انتقال ہوگیا ہے۔تو ہم لوگ گھر جارہے ہیں۔لاہور میں ہم دونوں پڑھتی ہیں۔اچانک اطلاع کی وجہ سے سیٹ نہیں مل سکی اور بس میں ہماری طبیعت خراب ہو جاتی ہے اس لیے مجبوراً ہمیں کھڑے ہوکر سفر کرنا پڑا۔" مناہل نے بڑی تفصیل سے جواب دیا تھا۔

چھوٹا چوہدری مناہل کی بات سن کر دکھ کا اظہار کرنے لگا تھا اور پھر بولا تھا۔"کوئی بات نہیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور ویسے بھی زیادہ فاصلہ نہیں ہے جلد ہی کٹ جائے گا۔"

"آپ بہت اچھے انسان ہیں ہر کوئی آپ کی طرح نہیں ہوتا۔وہ پچھلی سیٹ پر ہم بیٹھے تھے انہوں نے اٹھا دیا اور پھر مناہل اور عنایہ گل آہستہ آہستہ اپنے مطلب کی باتیں اگلوانے لگیں۔جس کی اس کو خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ انجانے میں کیا کیا بتائے جارہا ہے۔

☆☆☆

پوری رات سب نے جاگ کر اور کام کرتے ہوئے گزاری تھی۔کوئی ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔انہوں نے دس F M فریکوینسی کے ٹرانسمیٹر اور ریسیور ایک عدد ٹریکر تیار کیا تھا۔اور سب کچھ انہوں نے خود بنایا تھا PCB ڈیزائن سے لے کر سولڈرنگ اور پیک کرنے تک۔FM فریکوینسی کے ٹرانسمیٹر اور ریسیور بہت تھوڑی رینج کے بنائے گئے تھے۔اسی لیے جسامت میں چھوٹے اور نو وولٹ کی بیٹری کے ساتھ کافی لمبا پاور بیک اپ گیا تھا اور اس کو ہینڈ فری کے ساتھ آسانی سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

آپس میں رابطے کے لیے تو کانفرنس کال بھی ملائی جاسکتی تھی لیکن اس کے دو نقصان تھے ایک یہ کہ اگر کوئی ایک پکڑا جاتا تو سب کے سب کال ہسٹری سے پکڑے جاتے اور دوسرا سگنل بہت زیادہ ڈراپ ہونے کی وجہ سے ان کا ٹھیک طریقے سے رابطہ نہ ہو پاتا۔کئی جگہوں پر تو سگنل بالکل ہی جاتے رہتے ہیں۔ایسے میں ان کو آپس میں رابطے کے لیے ایک مؤثر ذریعہ چاہیے تھا جو انہوں نے تیار کرلیا تھا۔

سب نے کام ختم کیا تھا اور اب سب سونے کی

تیاری میں تھے کیونکہ اگلے کام کے لیے انہیں مارکیٹ کھلنے کا انتظار کرنا تھا جس کو ابھی تین چار گھنٹے تھے۔

ایک ساتھ دس موبائلوں نے شور مچایا تھا اور پھر سب نے باری باری اٹھ اپنے اپنے موبائل کے الارم بند کیے تھے۔ اب انہوں نے سب سے پہلے ناشتا کرنا تھا اور پھر اپنی اپنی سمت نکل جانا تھا۔ اور پھر اگلے دو گھنٹوں میں ہر حال میں واپس آنا تھا چاہے وہ کام ہو یا نہ ہو کیونکہ ٹائم بہت کم تھا ان کے پاس۔

☆☆☆

پلان اور سامان ریڈی تھا۔ جبران ان کو لیڈ کر رہا تھا۔ اب ان کا رخ اسٹیشن کی جانب تھا۔ اور جب وہ وہاں پہنچے تو ایک خبر ان کی منتظر تھی کہ عائز کا ملازم نہیں پہنچا تھا۔ وہ ملازم چوہدری کے کہنے پر چوہدری کے ڈرائیور کے ساتھ چوہدری کی گاڑی لے کر گاؤں چلا گیا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ انہوں کسی کو بھی نہیں دیکھا ہوا تھا نہ چوہدری کو نہ ہی اس کے بیٹے اور گارڈز کو۔ اس نے ٹرین میں بھی ان کی نشاندہی کرنی تھی۔ اور اب سب کچھ اُلٹ اور ختم ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے امید کے سہارے اور آنے والے وقت پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اک زوردار زناٹے کے تھپڑ کی آواز گونجی تھی پورے ڈبے میں اور سامنے کھڑے شخص کے گال پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا تھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے ٹکر مارنے کی۔''

مناہل کسی شیرنی کی طرح دھاڑی تھی۔

''اندھے ہو تم......نظر نہیں آتا تمہیں...... بے غیرت کہیں کے......''

''زبان سنبھال کے بات کرو لڑکی میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں اور تم سر پر سوار ہو رہی ہو۔ ایک تھپڑ تمہارے منہ پر بھی پڑ سکتا ہے۔''

''تم مار کے دکھاؤ......تم میرا لحاظ کر رہے ہو۔ میں تمہارا حشر نشر کر دوں گی۔ ایک تو تم نے جان بوجھ کر مجھے ٹکر ماری ہے اوپر سے اکڑ دکھا رہے ہو۔'' مناہل نے لڑکے کو پیچھے دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔ لڑکے کو دھکا دینے کی دیر تھی کہ وہ آگے بڑھا اور مناہل کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا تھا۔ بس پھر اس کے بعد جو ہنگامہ کھڑا ہوا تھا پورا ڈبہ وہاں آ کر جمع ہو گیا تھا۔

چھوٹا چوہدری سب سے آگے تھا اور اس نے آتے ہی لڑکے کے تین چار تھپڑ جڑ دیے تھے۔ اور پھر تھوڑی دیر میں لڑکے کے دو ساتھی اور بھی آ گئے تھے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے لڑکے کو اس ڈبے سے کھینچ کر لے گئے تھے۔ لڑکا کسی طور پر بھی وہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھا وہ لپک لپک کر مناہل کی طرف آ رہا تھا۔ چھوٹے چوہدری نے مناہل کو سیٹ پر بھیج دیا تھا اور اب آگے کھڑا ہو گیا تھا۔

مناہل واش روم کے لیے اُٹھی تھی جب واپس آ رہی تھی تو دوسری طرف سے آتے لڑکے نے جان بوجھ کر ٹکر ماردی تھی۔ بس پھر مناہل نے ذرا برابر آسرا نہیں کیا تھا۔ پلٹتے ہی زور کا تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

آپ نے بہت اچھا کیا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ چھوٹے چوہدری نے آتے ہی مناہل سے کہا تھا۔

آپ کا بہت شکریہ آپ نے ساتھ دیا۔ مناہل نے عاجزی سے کہا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں یہ تو میرا فرض تھا۔ چھوٹے چوہدری نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہوئے اس نے پہلے پیسوں والے بیگ کی طرف دیکھا تھا جو اپنی جگہ سے تھوڑا کھسک گیا تھا۔ اس نے اس کو سیٹ کیا تھا اور آرام سے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

خانیوال شہر کی حدود میں جیسے ہی ٹرین داخل ہوئی تھی مناہل اور عنایہ گل اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

آپ کا بہت شکریہ آپ نے ہمارا بہت ساتھ دیا اتنا تو کوئی اپنا کسی اپنے سے نہیں کرتا جتنا آپ نے ہم انجانوں کے لیے کیا۔'' مناہل نے شکریہ ادا کیا تھا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کے پیچھے ہی عنایہ گل تھی۔ ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر رکنے لگی تھی۔ مناہل نے پیچھے مڑ کر دیکھا چوہدری کا بیٹا ابھی بھی اس کو ہی دیکھ رہا تھا۔ مناہل مسکرائی اور ٹرین سے نیچے اتر گئی تھی۔

”j8 اور j7 بہت اچھے تم دونوں نے بڑا زبردست کام کیا۔ اب تم دونوں اسٹیشن سے باہر نکل جاؤ۔ وہاں j11 موجود ہے۔ وہ تم دونوں کو پک کرلے گا۔ لیکن ہمیں تم لوگوں کے ساتھ آگے جانا ہے۔ ہمارے ٹکٹ رحیم یار خان تک کے ہیں ہم دوسرے ڈبے میں سوار ہوجاتی ہیں۔“

”j7 ضد نہیں کرنی۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔ وہ کرو۔ باقی اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ تم بے فکر رہو اور تم لوگ بائی روڈ ہمارے ساتھ رہنا۔“ j نے ہدایت دی تھی۔ اور ٹرین نے بھی روانگی کی وسل دے دی تھی۔ اور اب آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

وقت اور سفر بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ لیکن کوئی بھی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ بلکہ ناممکن نظر آرہا تھا کہ کام بنے گا۔

چوہدری کے بیٹے سے جو معلوم ہوسکا تھا وہ یہ تھا کہ ابو دو ڈبے چھوڑ کر کیبن والے ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایمرجنسی میں سیٹ بک کروائی تھی جس کی وجہ سے ہمیں سیٹ اکٹھی نہیں ملی، وہاں ابو کے ساتھ ابو کا ایک دوست ہے باقی چار پانچ ہمارے ملازم ہیں جو دروازوں پر کھڑے ہوئے ہیں اور بھی اس نے بہت کچھ کہا کو جو لڑکیوں کو امپریس کرنے کے لیے بولا جاتا ہے اور مناہل اور عنایہ گل نے کافی حیرانگی کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

اب سچویشن یہ تھی کہ چھوٹے چوہدری کے ساتھ ایک اچھی جان والا بندہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک ایک آدمی ڈبے کے دونوں دروازوں پر کھڑا ہوا تھا جو بظاہر تو اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کا پورا دھیان چھوٹے چوہدری کی طرف تھا۔ اور اسی طرح چوہدری والے ڈبے میں بھی ایسا ہی تھا دونوں طرف کے دروازوں پر ایک ایک بندہ موجود تھا۔ ایسے میں کچھ بھی کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اور وقت تھا کہ ریت کی طرح ہاتھ سے نکلتا ہی جارہا تھا۔ ہر کوئی الرٹ تھا کہ کوئی چھوٹا سا بھی موقعہ ملے تو وہ ضائع نہ ہونے دیں گے۔

ٹرین ایک چھوٹے اسٹیشن پر رکی تھی اور آٹھ دس لوگ ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ دروازے پر رش ہونے کی وجہ سے سیٹوں اور برتھوں کے درمیان گزرنے والی جگہ پر کھڑے ہوگئے تھے۔

ٹرین نے اسٹیشن سے نکل کر جیسے ہی فل سپیڈ پکڑی تھی وہ آدمی جو درمیان میں کھڑے تھے وہ اب چھوٹے چوہدری کے کیبن میں داخل ہوگئے تھے۔ اور جو آدمی دروازے پر کھڑے تھے وہ بھی اس طرف بڑھنے لگے اور پھر اگلے ہی لمحے انہوں نے اسلحہ نکال لیا تھا اور اب چھوٹا چوہدری اور ملازم ان کے اسلحے کی نوک پر تھے۔ اور اب وہ پوچھ رہے تھے کہ باقی کا پیسہ کہاں ہے۔ انہوں نے ایک بیگ کھول کر دیکھ لیا تھا جو پیسوں سے بھرا ہوا تھا اور ساتھ ہی پوچھ رہے تھے تمہارا باپ کہاں ہے۔“

”j All الرٹ ہوجاؤ ٹرین میں اصلی چور آئے ہیں اور چھوٹے چوہدری والے کیبن میں ہیں اور جو لوگ باہر کھڑے ہیں وہ بھی چوروں کے ساتھی ہیں۔

”j تم اس ڈبے میں کھڑے موجود چوہدری کے ملازموں کو اس طرف متوجہ کرو میں چوہدری کے ڈبے کی طرف جارہا ہوں اور j5 تم اپنے کام کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بس یہی موقع ہے جس کے انتظار میں ہم تھے اب اسے ضائع مت کرنا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے j4 تم کرنے کا کیا سوچ رہے ہو۔“ j4 نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور تیزی کے ساتھ چوہدری والے ڈبے کی طرف جارہا تھا۔ ”j2 اور j3، j4 کو بیک اپ دو۔ وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔“

j4 جیسے ہی چوہدری والے ڈبے میں داخل ہوا تھا چوہدری کے دونوں ملازم جو دروازوں پر کھڑے تھے وہ اب چوہدری کے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ تشویش ان کے چہروں سے جھلک رہی تھی۔ ان کے پاس دوسرے ڈبے میں کسی نہ کسی کی کال آگئی تھی جو کام وہ کرنے کے لیے آیا تھا وہ ہوچکا تھا۔ چوہدری کے کیبن کا دروازہ کھلا انہوں نے چوہدری کو جلدی جلدی سب کچھ بتایا تھا۔ چوہدری کے کیبن میں بیٹھا آدمی باہر نکل آیا تھا اور اب وہ تیزی کے ساتھ دوسرے ڈبے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اور جیسے ہی وہ دوسرے ڈبے میں داخل

ہوئے تھے اسی لمحے چوہدری والے ڈبے کی لائیٹ چلی گئی تھی اور پورا ڈبہ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔j5 نے اپنا کام کر دیا تھا۔اب کھلے کیبن میں ایک چوہدری رہ گیا تھا جسے قابو کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔j2 اور j3 اتنی دیر میں اس کے سر پر پہنچ گئے تھے اور پھر انہوں نے چوہدری کی ہلکی سی بھی آواز نہیں نکلنے دی تھی اور اگلے ہی لمحے چوہدری زمین بوس ہو چکا تھا۔j4 نے پلاس سے بیگ کی زپ توڑی تھی جس پر چھوٹا تالا لگا ہوا تھا۔j4 نے چابی ڈھونڈنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے پاس وقت بہت کم ہے اور جیسے ہی چوہدری کے ملازمعں کو چوہدری کے اکیلے ہونے کا احساس ہوا وہ فوری وہاں سے بھاگ کر آ جائیں گے۔

j4 نے کندھے پر ڈالے کالج بیگ میں سے دو بڑے بڑے شاپر نکالے تھے اور چوہدری کے کیبن میں پڑے دونوں بڑے بڑے بیگوں کو اس میں خالی کر دیا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے شاپروں کے منہ بند کر کے کیبن سے باہر نکل آئے تھے اور کیبن کا دروازہ بند کر دیا تھا اور اب وہ جلدی جلدی اس ڈبے سے باہر نکلنے لگے تھے۔اور اب ان کا رخ واش روم کی طرف تھا جہاں پہلے سے j9 اور j10 موجود تھیں۔j2 اور j4 جلدی سے کندھے پر سے شاپر اتار کر پاتھ کے اندر رکھ دیے تھے۔j9 باتھ کے اندر چلی گئی تھی۔j10 باہر کھڑی تھی۔j2,j3 اور j4 فوری اپنی اپنی جگہوں کی طرف مو کر گئے تھے اور پھر اگلے ہی لمحے وہاں ڈبے کی لائیٹ پھر سے آ گئی تھی۔

جاب ڈن۔j4 نے میسج فارورڈ کیا تھا۔اب ہر کوئی اپنی اپنی جگہوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔اور پھر ڈبے میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی اور ٹرین آہستہ ہونے لگی تھی۔اور پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔آگے ٹرین کی پٹڑی ریپئیر ہو رہی تھی۔جس کی وجہ سے ٹرین آہستہ ہو گئی تھی۔چوروں نے رقم والا بیگ اُٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اور پھر اسلحہ لہراتے ہوئے جلدی جلدی اترنے لگے تھے۔باہر گاڑیوں پر ان کے آدمی موجود تھے۔

چوہدری کے بیٹے نے اپنے باپ اور پیسوں کا نہیں بتایا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے غصے سے اس کو گولی مار دی تھی۔چوہدری کے پیسوں کی پوری طرح سیکھری ہوئی تھی۔اور چوروں نے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں ٹرین نے لازمی آہستہ ہونا تھا۔چوہدری کے جو ملازم اس کو بچانے کے لیے بھاگے تھے سامنے دس بارہ بندوں کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر پیچھے ہی رک گئے تھے۔چوروں کے جاتے ہی لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔چوہدری کے بیٹے کے کندھے پر گولی لگی تھی اور خون نکل رہا تھا۔دو ملازم جن کو اچانک چوہدری کا خیال آیا تھا وہ چوہدری کے کیبن کی طرف بھاگے تھے۔اور پھر جیسے ہی انہوں نے کیبن کا دروازہ کھولا تھا خالی بیگ اور چوہدری کو اوندھے منہ دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔اور اب وہ بار بار چوہدری کو ہلانے لگے تھے۔

☆☆☆

''جاب ڈن!''j9 نے باتھ سے نکل کر پیغام دیا تھا اور پھر j9 اور j10 فتح سے سرشار مسکراتے ہوئے اپنی سیٹوں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔بہاولپور اسٹیشن پر جیسے ہی گاڑی رکی تھی ریسکیو کا عملہ اور پولیس کے بندے جلدی سے ٹرین میں داخل ہوئے تھے۔اور پھر اگلے کچھ لمحوں میں ریسکیو کا عملہ دو اسٹریچروں پر چوہدری اور چوہدری کے بیٹے کو ڈال کر جلدی سے باہر گاڑی کی طرف بھاگ رہا تھا۔j اور اس کے ساتھی ایک ایک کر کے اسٹیشن سے باہر نکل رہے تھے۔اب ان کا رخ لاری اڈے کی طرف تھا جہاں سے انہوں نے ملتان کے لیے روانہ ہونا تھا۔کیونکہ وہاں پر j7,j8 اور j11 سارے پیسے کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

آپ لوگوں کے ذہن میں کافی سارے سوال اٹھ رہے ہوں گے مثلاً جب ہم نے ان لوگوں کو پہلے دیکھا ہی نہیں ہوا تھا تو پھر چوہدری کے بیٹے کو کیسے پہچان لیا۔دوسرا یہ کہ آدھے پیسے تو چور لے گئے تو پھر سب پیسوں کے ساتھ انتظار کیسے؟؟

چلیں میں آپ کی کنفیوژن دور کرتا ہوں۔کہانی شروع سے سناتا ہوں۔ہمیں عائز کے ملازم کا جب فون آیا تو اس نے بتایا کہ کل پیسے مل جانے ہیں اور ہم پیسے ڈالنے کے لیے بیگ لینے کے لیے آئے ہیں اور

کل جیسے ہی پیسے ملیں گے۔تین بجے والی ٹرین سے روانہ ہو جائیں گے۔اور پھر جب سب مل کر بیٹھے پلان بنانے لگے تو ہمارے ذہن میں اچانک پلان بدل دینے کا آئیڈیا آیا اور پھر ہم نے عائز کے ملازم سے ایک بیگ کا رنگوں سائز شاعز ڈیزائین اور دکان کا ایڈریس لے لیا تھا۔اور پھر اس نے اُس دکان سے بیگ خرید لیا تھا۔اب اس کا وزن بڑھانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی جس کو نقلی نوٹوں سے پُر کیا گیا تھا اور ان کے اوپر ایک ایک نوٹ اصلی بھی لگایا گیا تھا تا کہ اگر کوئی کھول کر دیکھ بھی لے تو ان کو پتا نہ چلے۔ پلان بس یہ تھا کہ ہم نے بیگ بدلنا ہے۔کیسے؟ اس کا آئیڈیا کسی کو نہ تھا۔بس یہ پتا تھا کہ عائز کا ملازم ساتھ دے گا اور کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔

اور پھر جب ہم اسٹیشن پر آئے تو پتا چلا کہ عائز کا ملازم ساتھ نہیں آیا۔اب ہمارے لیے پریشانی بڑھ گئی تھی۔ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے چوہدری اور اس کے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا۔ان کی نشاندہی عائز کے ملازم نے ٹرین کے اندر کرنی تھی۔اور جب وہ نہیں آیا تو ہمارے لیے سب کچھ ختم ہو گیا۔لیکن ہم پھر بھی سوار ہو گئے تھے کہ اید کوئی راہ نکل آئے۔اور پھر راہ نکل آئی تھی۔ہمیں اچانک یاد آیا تھا کہ ان کے پاس بیگ ہے جیسا کہ ہمارے پاس۔بس پھر سب اس کا بیگ کو تلاش کرنے میں لگ گئے تھے۔اور پھر تھوڑی دیر میں ہی اس کو تلاش کر لیا تھا۔یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ بیگ چوہدری کے بیٹے کے پاس تھا۔اگر چوہدری کے پاس ہوتا تو ہم ہرگز اس کو ڈھونڈ نہ سکتے۔کیونکہ چوہدری کیبن کے اندر تھا اور کیبن کا دروازہ لاک تھا۔

مناہل اور عنایہ نے سیٹ کے بہانے چوہدری کے بیٹے سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔کہ تمہارے ساتھ اور بھی کوئی ہے اگر ہے تو کہاں چوہدری کے بیٹے نے شوخے پن میں پیسوں کے علاوہ کہ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ ہے اور وہ فلاں ڈبے کے فلاں کیبن میں ہے اور ایک ایک بندہ دونوں دروازوں پر موجود ہے۔اور پھر مناہل باتھ کے بہانے اٹھی تھی اور اس نے سب کو اپنے پلان کے بارے میں بتایا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔

سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک اچھے خاصے ہنگامے کی ضرورت تھی جو اسی طرح کا ہو سکتا تھا۔مناہل نے بات کی تو j6 فوری تیار ہو گیا تھا۔اور پھر جب ہنگامہ ہو رہا تھا۔ہر کوئی ان کی طرف متوجہ تھا۔اسی لمحے j1 اور j3 نے کام دکھا دیا تھا مطلب بیگ تبدیل کر دیا تھا۔

j11 مطلب کہ عائز جس کو گاڑی دے کر ہم نے ٹرین آنے سے پہلے ہی بسائی روڈ روانہ کر دیا تھا۔کہ جیسے ہی ہمارے ہاتھ پیسے لگیں گے ہم باہر پھینک دیں گے کیونکہ اندھیرے کی وجہ سے کسی کو کچھ نظر نہیں آئے گا دوسرا اگر ان کو پتا چل جاتا ہے تو تلاشی پر بھی ان کو کچھ نہ ملے۔

چوہدری کے بیٹے والا بیگ بڑی جلدی ہاتھ لگ گیا تھا اور ابھی باہر دن بھی موجود تھا جس کی امید نہیں تھا۔عائز سے رابطہ کیا تو اس نے اپنی لوکیشن بتائی۔اور پھر اس کو ایک جگہ بتائی جہاں پر ٹرین کی پٹری اور سڑک کچھ دور ساتھ ساتھ تھیں۔اب اگر بیگ باہر پھینکتے تھے تو کوئی نہ کوئی دیکھ لیتا اس لیے باتھ میں سے فلش کے ذریعے پیسوں کی گڈیوں کو باہر پھینکا گیا اور عائز نے سب اکٹھے کر لیے تھے۔

اور پھر جب دوسرے پیسے لوٹے تھے تو واش روم میں اس لیے رکھے تھے کہ اگر چوہدری کے بندے ڈھونڈتے تو ان کا خیال باتھ کی طرف نہ جاتا۔اور اگر جاتا بھی تو ایک لڑکی باہر کھڑی تھی اور ایک اندر تھی۔جس سے ان کو تسلی ہو جاتی کہ کوئی باتھ یوز کر رہا ہے اور پیسے فوری طور پر اس لیے باہر نہیں پھینکے کہ باہر مناسب لوکیشن نہ تھی جس پر عائز آسانی سے پہنچ سکتا اور پھر جیسے ہی عائز سے رابطہ اور مناسب لوکیشن آئی تھی j9 اور j10 نے پیسے باہر پھینک دیے تھے۔جس کو عائز نے اٹھا لیا تھا اور اصل نام اس لیے استعمال نہیں کیے گئے تھے کہ اگر کوئی ان کا چینل موبائل پر ٹیون کر لیتا تو ان کو خبر نہ ہوتی اور نہ ہی وہ نام جان سکتے۔

☆☆☆

# مسئلہ یہ ہے

## خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے منسلک ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

**88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی**

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ نماز کی پابندی رکھنا اور درود شریف بہت پڑھنا' انسان کی آدھی سے زیادہ پریشانیوں کا حل ہے۔ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ میرے جو بچے میری نصیحتوں پر عمل کرتے ہیں اللہ انہیں اس کا صلہ ضرور دے گا۔ رمضان کا بابرکت ماہ ہمارے درمیان ہے، مہمان ہے بس ایک ماہ کا لہٰذا جتنی نیکیاں سمیٹی جاسکیں سمیٹ لو ہمارے معاشرے میں نفسا نفسی کا دور دورہ ہے ہر شخص ہی پریشان ہے' ایسے میں جو لوگ اپنے پروردگار سے مدد مانگتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پورا رمضان قرآن پاک کی تلاوت ضرور کرو اور ترجمہ پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ سورۃ طہٰ آیات 26-25 بکثرت پڑھو یہ حضرت موسیٰ کی بہت خوبصورت دعا ہے جس کے معنی ہیں۔ ''اے میرے رب میرا سینہ کھول دے اور میرے کام میرے لیے آسان فرما۔'' اس دعا کو بہت پڑھو۔ 'یا حی یا قیوم برحمتک استغیث' استغفراللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔ اللھمہ اجرنی من النار' رب اغفر وارحم وانت خیر الرحمین' ان دعاؤں کا بہت ورد کرنا افضل ہے۔ اللہ نے مجھے توفیق دی کہ دانتوں اور زخموں کی دوا کے بعد ہائی بلڈ پریشر اور لو بلڈ پریشر کی دوائیں بھی تیار کر لی ہیں۔ برسوں کی محنت کے بعد اللہ رب العزت نے کامیابی دی ہے۔ دوا کے کوئی منفی اثرات نہیں ہیں اور مریضوں کو انشاءاللہ مکمل شفا ہوگی۔ آج کل کے حالات کی وجہ سے تقریباً ہر دوسرا شخص بلڈ پریشر کا مریض بن چکا ہے۔ پابندی سے استعمال مکمل شفا عطا فرمائے گا۔

آخر میں، میں اپنے بچوں سے یہی کہوں گا کہ پتا نہیں کس کس کو اگلے سال ماہ صیام دیکھنا نصیب ہو لہٰذا جتنی نیکیاں کمائی جاسکیں اسی ماہ میں کما لینی چاہئیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

□ تاجور ضیا۔ لاہور

o بابا جی میں بہت پریشان ہوں۔ والدین کی زندگی تک دکھ کیا ہوتے ہیں پتا ہی نہیں تھا اور اب سکھ اور چین کیا ہوتا ہے بھول چکی ہوں۔ بچے چھوٹے ہیں۔ شوہر ذہنی مریض ہیں۔ میں پڑھی لکھی ہوں نوکری کرتی ہوں مگر بابا جی لوگوں کے رویے مجھے تھکا رہے ہیں۔ پوری ایمانداری سے کام کرتی ہوں مگر ہر شخص مجھے مفت کا مال سمجھتا ہے۔ ہنسی مذاق نہ کرو تو دشمنی پال لیتے ہیں۔ کئی نوکریاں صرف اسی وجہ سے چھوڑنی پڑیں۔ بھائی پوچھتے نہیں' بہنیں اس خوف سے ملتی نہیں کہ کچھ مدد نہ کرنی پڑ جائے۔ بابا جی میں اتنے عزت دار گھر سے ہوں کہ کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلا سکتی اور یقین کیجیے کئی بار میرے گھر میں بچوں کو کھلانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں مجھے بتائیں میں اپنی زندگی کو شرافت کے دائرے میں رکھتے ہوئے کیسے گزاروں...... کبھی کبھی تو مجھے ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو بڑے آرام سے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنی مشکلات حل کر لیتے ہیں...... میرے شوہر کی دوائیوں کا روز کا خرچہ دس سے پندرہ ہزار ہے۔ میری رہنمائی کریں ورنہ کہیں میں بھی پاگل نہ ہو جاؤں...... میرا اصل نام اور شہرت لکھیے گا فرضی لکھیے گا۔

## اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

☆ بیٹی تاجور! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ آج سے تیس سال قبل جب 'مسئلہ یہ ہے' کے جوابات دینے شروع کیے تھے بس اسی دن سے مسلسل دکھ اور صدمے کی کیفیت میں ہوں بے بسی کیا ہوتی ہے ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے اندازہ ہوتا چلا گیا..... لوگ کس قدر دکھی اور پریشان ہیں کاش کہ وہ لوگ بھی جان سکیں جن پر اللہ نے اپنا کرم کر رکھا ہے۔ میری بیٹی میں تمہاری پریشانیاں حل ہوں اس کے لیے دعا کروں گا۔ اللہ تمہارے آس پاس موجود لوگوں کے دلوں میں رحم ڈال دے۔ بیٹی سورۃ طٰحٰہ آیات 26-25 بہت پڑھو اور ثابت قدم رہو اللہ تمہارے معاملات میں آسانیاں پیدا کرے گا۔

□ نازیہ خان۔ پنڈی گھیپ

o بابا جی مجھے میری پڑوسن نے آپ کے بارے میں بتایا۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ آج سے 2 سال قبل بیٹی کی پیدائش پر آپریشن ہوا تھا۔ کچھ پیچیدگیاں ہوگئی تھیں مگر الحمدللہ میں اور میری بیٹی صحیح سلامت ہیں۔ بس بابا جی آپریشن کے زخم نہیں بھر رہے، ٹانکے سوکھتے نہیں، خشک ہو جاتے ہیں پھر اچانک ان میں سے خون اور پیپ آنے لگتا ہے میں بہت پریشان ہوں اسی ٹینشن کی وجہ سے شوگر بھی ہوگئی۔ میں نے سنا ہے آپ دوا دیتے ہیں جو برسوں پرانے زخم دنوں میں ٹھیک کر دیتی ہے۔ خدارا مجھے دوا منگوانے کا طریقہ بتا دیں اور یہ بھی بتا دیں کہ اگر آپ کو کچھ رقم بھجوانا چاہوں تو کیسے بھجواؤں۔

☆ بیٹی نازیہ! میں تمہارے لیے دوا تیار کر دوں گا۔ پابندی سے ایک ماہ استعمال کرنا کیونکہ زخم پرانے ہیں انشاء اللہ مکمل شفا ہوگی۔ دوا منگوانے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرلو..... امدادی رقم بذریعہ منی آرڈر سچی کہانیاں کے نام ارسال کر سکتی ہو مجھے مل جائے گی۔

□ عزیز اللہ مروت۔ پشاور۔

o محترم بابا جان! میں عرصہ 5 سال سے دبئی میں نوکری کے سلسلے میں مقیم ہوں۔ مزدور آدمی ہوں اس لیے گھر والوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ سال بعد چھٹیوں پر گھر آتا ہوں۔ اب کچھ عرصے سے ہمارے شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ سمجھ نہیں آتا' کیا کروں؟ گھر سے دور ہوتا ہوں تو بہت فکر رہتی ہے۔ گھر سے باہر نکلنا محفوظ نہیں مگر بچوں کو اسکول جانا ہوتا ہے۔ گھر کے دس کام ہوتے ہیں جو گھر کی خواتین کو کرنے کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ ایسے میں وہ بھی پریشان رہتے ہیں اور میں بھی۔ میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ کیا میں گھر والوں کو کہیں اور منتقل کر دوں یا وہیں رہنے دوں؟ کیونکہ پریشانی کی وجہ سے میرے کام کا حرج ہوتا ہے۔ ذہن پر بوجھ سا رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ کوئی بری خبر ہی آئے گی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں جلد بیمار پڑ جاؤں گا۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں میری رہنمائی کریں۔

☆ بیٹے عزیز! تم جس کیفیت سے گزر رہے ہو' ہر حساس پاکستانی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ حالات اب کچھ بہتر ہیں مگر یہ حل نہیں کہ وہ سب ایک ایک کر کے وطن چھوڑ جائیں۔ مشکل کا مستقل مزاجی سے سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا ایمان ہے کہ جو رات قبر میں ہے' وہ باہر نہیں گزرے گی لہٰذا بیٹے! ہمت رکھو' تم خود بھی نماز کی پابندی کرو' گھر والوں سے بھی کہو کہ وہ بھی نماز پڑھیں اور ہر نماز کے بعد آیت الکرسی کو عادت میں شامل کرلیں۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات کیا کرو اور اللہ سے دعا کرو کہ اللہ ہم سب کے گناہ معاف فرمائے اور ہم پر رحم فرمائے۔ (آمین!)

□ سائرہ رضا۔ U.K

o بابا جان میں آپ سے پچھلے سال سے رابطے میں ہوں۔ میرا مسئلہ شدید نوعیت کا تھا، جہاں شادی کرنا چاہتی تھی والدین تیار نہیں تھے۔ آپ سے تعویذ لیا چھ ماہ کے اندر اندر مسئلہ حل ہوگیا آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس تعویذ کا کیا کروں اور میری ایک کزن کا بھی یہی مسئلہ ہے کیا وہ بھی آپ سے تعویذ منگوالے۔ پلیز جلدی جواب دیجیے گا۔

☆ بیٹی سائرہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنا کرم فرمایا۔ تعویذ تلف کر دو۔ شکرانے کے طور پر کچھ رقم خیرات کر دو۔ جس بچی کے مسئلے کے بارے میں لکھا ہے اس سے کہو کہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرے۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ رقیہ پروین۔ملتان

o بابا جان! اللہ آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ آپ نے میری برسوں پرانی تکلیف دور کر دی۔ میرے دانتوں سے مسلسل خون اور پیپ آتا تھا۔ ڈاکٹروں پر پیسہ خرچ کر کر کے میں پریشان ہوگئی تھی۔ آپ کی دوا منگوائی ایک ہفتہ میں خون اور پیپ آنا بند' بابا جان یہ تو معجزہ ہے میں تو دس بارہ سال سے اذیت کا شکار تھی۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔ میرا بیٹا اپنے دفتری کام سے کراچی آ رہا ہے آپ برائے مہربانی دس بوتلیں تیار کر کے بھجوا دیں میں آفس سے منگوالوں گی..... بابا جی کچھ اضافی رقم بھی بھجوا رہی ہوں کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا۔

☆ بیٹی رقیہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دوا میں تیار کردوں گا بس بچے سے کہنا آنے سے پہلے مطلع ضرور کر دے۔ تمہارے شکرانے کا انداز بہت اچھا ہے۔ اللہ تمہیں ہر پریشانی اور تکلیف سے دور رکھے۔

□ انعم۔شیخوپورہ۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میں آپ کی خدمت میں پہلی دفعہ حاضر ہورہی ہوں۔ میرے تین بھائی ہیں' تینوں ہی بہت بدتمیز ہیں' ہر کسی کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں' والدہ کی بھی عزت نہیں کرتے۔ والدہ سے چیخ کر بات کرتے ہیں۔ ہر کسی کے سامنے ان کا یہی رویہ ہے۔ سب کہتے ہیں' تمہارے بچے کتنے بدتمیز ہیں تو ہمیں سخت شرمندگی ہوتی ہے۔ والد صاحب کے سامنے تو کچھ نہیں کہتے لیکن پیچھے کہتے ہیں' ہم نہیں ڈرتے' ہمارا کیا کرلے گا؟ دو بھائی تو پڑھائی بھی نہیں کرتے' پچھلی دفعہ بھی دونوں فیل ہوگئے تھے۔ بابا جی! میرے والد کی خواہش ہے کہ تینوں پڑھ لکھ جائیں۔ آپ کوئی ایسا تعویذ دیجیے کہ ہم سب بہن بھائی' والد اور والدہ کی عزت کریں' خدمت کریں اور تمیز سے رہیں اور بھائی بھی خوب دل لگا کر پڑھائی کریں' ہر کسی کے ساتھ تمیز سے پیش آئیں۔ بابا جی! ہر وقت شور اور لڑائی سے مجھے سخت نفرت ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ والد صاحب پر قرض بہت ہے اور والدہ کے پاس بھی پیسے جیسے ہی آتے ہیں' اسی وقت خرچ ہو جاتے ہیں۔ پیسوں میں برکت نہیں ہے۔ ہمارا جوائنٹ فیملی سسٹم ہے' سب چچا اور پھوپی ایک جگہ رہتے ہیں پھر بھی کبھار لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ والد صاحب پر بہت بوجھ ہے۔ ہم چار بہنیں بڑی ہیں۔ عمریں بالترتیب 24,26,20,22 ہیں۔ بات تو طے ہے لیکن ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ آپ دُعا کریں کہ والد صاحب کے سر سے یہ بوجھ اتر جائے اور کوئی ایسا تعویذ دیجیے کہ والد صاحب کو قرض سے نجات مل جائے۔ پلیز' ان دو مسائل کا حل ضرور بتایئے گا۔ مہربانی ہوگی' ساری عمر آپ کو دُعا دوں گی۔ اللہ حافظ!

☆ بیٹی انعم.....! تم لوگ جس مسئلے سے دوچار ہو' وہ بیشتر گھروں کا مسئلہ ہے۔ اولاد آج کل کے دور میں بے انتہا نافرمان ہوگئی ہے اور شاید غلطی بڑوں کی ہی ہے کہ ان کی پرورش میں کہیں کوتاہی ہوگئی ہے۔ اپنی والدہ سے کہو کہ نمازِ فجر کے بعد 21-21 بار سورۃ الناس' سورۃ فلق اور 7 بار آیت الکرسی پڑھ کر بچوں پر دم کر دیا کریں۔ صرف ضرورت کے تحت بیٹوں سے بات کریں۔ اس کے علاوہ کثرت سے یاعزیزُ کا ورد کریں۔ تعویذ کے لیے فوری طور پر سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ زمان خان۔کراچی

☆ بیٹے زمان! تمہارا مسئلہ قابل اشاعت نہیں مجھے ذاتی طور پر خط لکھو میں براہِ راست جواب دوں گا۔

□ سرفراز علی۔کوہاٹ

☆ بیٹے سرفراز تمہاری خواہش پر تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا۔ میری نصیحت مانو تو اس بچی کا خیال دل سے نکال دو۔ ضد پر قائم رہو گے تو اپنے خون کے رشتے کھو دو گے۔ والدین اور بہن بھائیوں سے بڑھ کر اور کوئی رشتہ نہیں۔ نماز پڑھا کرو تاکہ شیطان تم سے دور رہے۔

□ ثناء ناز۔چکوال۔

o بابا جی! گزارش یہ ہے کہ کافی عرصے سے ہمارے سر' آنکھ اور پیشانی میں شدید درد رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ سر میں نزلے کا پانی بہت زیادہ خشک ہوگیا ہے۔ جس طرح ہڈی سخت ہوتی ہے' بالکل اسی طرح نزلے کا پانی ہڈی کی طرح سخت اور خشک ہوگیا ہے۔ ہر وقت درد اور خشکی کی وجہ سے سر کے بال بہت زیادہ گر گئے' آنکھ

کی روشنی بہت کمزور ہوگئی ہے۔ طبیعت بہت پریشان رہتی ہے۔ باباجی! میں نے بہت علاج کروایا' حکمت' ہومیوپیتھک اور ڈاکٹری لیکن علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سر میں خشکی کی وجہ سے رات کے وقت نیند بالکل نہیں آتی۔ باباجی! میں شادی شدہ ہوں' گھر کے کام کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے۔ آپ دُعا یا دوا ہمیں ضرور بتائیں تاکہ اس پریشانی سے نجات ملے۔ بابا جی! ہمارا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ شوہر بہت غیر ذمے دار اور سخت انسان ہیں۔ گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے' میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی ذمے داری کو سمجھیں اور ہمارے ساتھ نرم رویہ رکھیں۔ ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہوں۔ باباجی! ڈیڑھ ماہ پہلے میری شادی تین بچوں کے باپ سے ہوئی۔ شادی سے پہلے انتہائی نیک' شریف بن کے آئے لیکن شادی کے بعد بیوی کے ساتھ نوکرانی جیسا سلوک کررہے ہیں۔ گھر' بچوں اور شوہر کے تمام کام کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ باباجی! اتنا زیادہ کام مجھ سے بالکل نہیں ہوسکتا ہے۔ میری صحت بہت کمزور ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہر وقت مجھ پر غصہ کرتے ہیں اور طلاق دینا چاہتے ہیں۔ وہ میرا ضروری خرچ بھی نہیں دیتے' مجھ پر کام کے علاوہ بھی بہت زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں۔ کوئی ایسی دُعا بتائیں کہ وہ مجھ سے محبت اور نرمی سے پیش آئیں۔ میری مجبوری اور مرض کو سمجھیں۔

☆ بیٹی ثناء! میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ ہمت اور صبر سے حالات کا سامنا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک دیگچی میں پانی خوب ابالو پھر سونے سے قبل اچھی طرح بھاپ لے لیا کرو۔ رات کو ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! خاموش رہا کرو اور ہر وقت یَاقَھَّارُ کا وِرد کیا کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات لے لو۔ مجھے 3 ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ منیر احمد۔ ریاض۔

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! پیارے باباجی! میں آپ کو یہ خط ریاض سے ارسال کررہا ہوں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے حالات بہت خراب ہیں۔ ایک وقت کا کھاتے ہیں۔ ہمارا اسکول جانا بھی بند ہوگیا ہے۔ ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ ایسے حالات نہیں کہ ہم تعلیم حاصل کرسکیں۔ باباجی! میرے ابو نے ایک پارٹنر کے ساتھ بزنس کیا تھا' اس نے میرے ابو کے ساتھ دھوکا کیا۔ اب ابو اکیلے ہیں' کبھی اُن کا کام چلتا ہے تو کبھی نہیں چلتا اور جب چلتا بھی ہے تو میرے ابو اس میں نقصان اٹھاتے ہیں۔ بابا جی! ہمیں کوئی ایسا تعویذ بھجوائیں جس کی مدد سے ہمارے حالات یعنی ابو کا کام خوب چلے۔ باباجی! ایک اور تعویذ بھی چاہیے کہ جس کی مدد سے ہمیں یہاں امارات' ریاض وغیرہ کا پاسپورٹ ملے۔ میرے والد یہاں پر چالیس سال سے رہ رہے ہیں۔ اس دوران میں ہم نے یہاں کا پاسپورٹ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں نہ کوئی سفارش ہے اور نہ ہی ایسے حالات ہیں کہ ہم رشوت دے پائیں۔ برائے کرم ہمیں کوئی ایسا تعویذ دے دیں کہ ہمیں یہاں کا پاسپورٹ ملے۔ ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔ اللہ آپ کو اس کا اَجر اِس دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی۔ (آمین)

☆ بیٹا منیر! احسان کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے لہٰذا اسی سے مانگو۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ بقرہ آیت 76' 99-99 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے' دورانِ وظیفہ نماز قضا نہ ہو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نگہت یاسمین' جدہ۔

○ محرم باباصاحب! السلام علیکم! ایک دفعہ پھر اپنا مسئلہ لکھ رہی ہوں۔ آپ نے پہلے جو وظیفہ بتایا تھا' وہ میں نے کیا ہے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے خواب میں اشارہ ہوتا ہے کہ تجھے شفا نہیں ہوگی۔ جب میں خود پر دم کرتی ہوں تو میرے منہ سے بہت چیخیں نکلتی ہیں۔ کسی کے گھر جاؤں تو بھی جھٹکے لگتے ہیں۔ گھر پر رہوں بھی تو بھی جھٹکے آتے ہیں۔ خواب میں اکثر چھوٹا بچہ دیکھتی ہوں۔ بچہ جب بھی خواب میں آتا ہے تو کچھ نہ کچھ کرجاتا ہے یعنی کہ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہیں ماردوں گا' دیکھنا' تمہارا حشر کیا ہوتا ہے۔ نماز کی پابندی کرتی ہوں مگر دل نہیں کرتا نماز پڑھنے کو۔ بہت گھبرانے لگتا ہے۔ باباجی! مجھے کوئی عمل بتائیں جو میں کروں تو مجھے شفا ہوجائے۔ میں آپ کو دُعاؤں

کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتی۔

☆بیٹی نگہت......!وظیفے کی کامیابی کی ضمانت نماز کی پابندی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ یقین ہے۔تم نماز پابندی سے ادا نہیں کر رہی ہو۔میں تمھیں تعویذ کا مشورہ دوں گا۔فوری طور پر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے تعویذ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے منگوالو۔یَارحمٰنُ کا کثرت سے وِرد کیا کرو۔

□ امینہ۔رحیم یار خاں۔

o باباجی! السلامُ علیکم! آپ کے دیئے ہوئے تعویذ سے میری شادی جہاں میں چاہتی تھی، ہوگئی ہے۔ تاخیر سے شکریہ ادا کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے۔میں اپنے گھر میں خوش ہوں۔ میرے شوہر میرے ساتھ بہت اچھے ہیں مگر میرے سسرالی مجھے بہن بھائیوں سے ملنے نہیں دیتے۔میرے شوہر تو نہیں روکتے مگر دوسرے لوگ ایسا کرتے ہیں پھر بھی میں خوش ہوں۔آپ کے مشورے پر عمل کرتی رہوں گی۔شکر گزار ہوں آپ کی۔میری زندگی سنور گئی ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔

☆بیٹی امینہ!شکر اللہ تعالیٰ کا ادا کرو کہ اس نے کرم کیا۔جس قدر صدقہ وخیرات کر سکتی ہو کرو۔یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔جب ہم اپنی خوشیوں میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہت برکت عطا فرماتا ہے۔کچھ وقت سسرال والوں کی مرضی کے مطابق گزار لو، کامیاب ہو جاؤ گی۔

□ فائزہ۔کوٹ ادو۔

o باباجی!السلامُ علیکم!میں امید رکھتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور آپ کی خیریت اللہ تعالیٰ سے نیک چاہتی ہوں۔میں آج آپ کے پاس ایک مسئلہ لے کر آئی ہوں۔میں ایک لڑکے سے پیار کرتی ہوں، وہ میرے بچپن کی محبت ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن میرے گھر والے اور میرا خاندان اس کو ایک نظر دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔وہ لوگ کئی بار رشتہ لے کر آئے ہیں لیکن میرے گھر والوں نے انکار کر دیا۔میرا اپنا خاندان ہی میرا دشمن ہو گیا ہے۔میرے گھر والوں نے مجھ پر پابندی لگا دی ہے مگر میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں جی سکتی۔میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتی ہوں۔ میں نے کتابوں سے پڑھ کر بہت سے وظیفے بھی کیے ہیں لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی۔آپ کوئی ایسا تعویذ دیں، ایسی دُعا کریں کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے۔ میں آپ کو ساری زندگی دُعائیں دوں گی۔

☆بیٹی فائزہ!اللہ سے دُعا کرو کہ وہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ایک لمحے کو ضرور یہ سوچنا کہ تمہارے بڑے اس شخص کے خلاف کیوں ہیں؟ بہرحال نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد سورۃ البقرہ آیت 79، 700 بار پڑھو اور دُعا کرو۔مدت 2 ماہ ہے۔تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

□ حشمت۔بہاول پور۔

o محترم باباجی!السلامُ علیکم!باباجی!میری بیٹی جس کی عمر تقریباً 18 سال ہے، حافظِ قرآن ہے۔گزشتہ دو سالوں سے اس کے سر میں مُستقل درد رہتا ہے۔کالج جانا مشکل ہو گیا ہے۔پچھلے سال خون کی کمی کی وجہ سے دو بوتل خون بھی چڑھا۔ویسے صحت مند اور پڑھائی میں اچھی ہے مگر درد جانے کا نام نہیں لیتا، اچانک اٹھتا ہے۔ آپ کوئی دُعا اور دوا بتا دیں تو عنایت ہوگی۔میری بیٹی کی طبیعت پھر خراب ہے۔مزید یہ کہ اس کے چہرے پر مہاسے بھی ہیں۔کیا آپ کے پاس اس کی دوا ہوگی؟ پہلے اس کا رنگ سرخ وسفید تھا مگر اب دن بدن سانولا ہو رہا ہے۔اس کے علاوہ مجھے آپ سے اپنے لیے دوا لینی ہے۔میرے تقریباً 7 آپریشن ہو چکے ہیں، سب بچے آپریشن سے ہوئے اور پھر 2013ء میں میرے رسولی ہونے کی وجہ سے uterous کو نکال دیا گیا ہے۔اب 3 مہینے سے میرے جسم میں صرف کمر اور پیٹ کا حصہ پھول رہا ہے۔ اگر پانی بھی پی لوں تو ایسا لگتا ہے جیسے دو تین مہینے کی پریگنینسی ہو۔ویسے ہاتھ، پیر وغیرہ صحیح ہیں اور میں نے بہت علاج کروایا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرا سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔جسم بالکل بے ڈھب ہو رہا ہے۔آپ کوئی دوا بتا دیں تو مہربانی ہوگی۔میری عمر 42 سال ہے۔مجھے آپ جون میں جواب دے دیں تو مہربانی ہوگی کیونکہ میری بیٹی کا مسئلہ بہت پریشان کن

ہے۔اس کے امتحان بھی ہونے والے ہیں۔شکریہ۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا کرے۔

☆بیٹی حشمت! بچی کی آنکھیں ٹیسٹ کرواؤ۔اس کے علاوہ اس کی خوراک میں میٹھا زیادہ کردو جیسے صبح ایک پیالے میں دودھ اور جلیبی ضرور دو۔ رات کو ایک گلاس گرم دودھ۔اس کے علاوہ ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دَم کرو۔تم کوشش کرو کہ نہار منہ گرم پانی میں شہد گھول کر پیو۔ تیز قدموں سے ٹہلا کرو۔ یقیناً افاقہ ہوگا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ غوثیہ۔سیالکوٹ۔

o محترم باباجی! اسلامُ علیکم! باباجی! آپ کے بتائے ہوئے وظائف اور دُعاؤں سے اللہ نے پہلے بھی میری مشکلات دور کی ہیں اور اب پھر حاضر ہو رہی ہوں۔ باباجی! سال پہلے میرے اوپر بہت مشکل آزمائش آئی ہے۔ برائے کرم میری مدد کیجیے۔ مسئلہ یہ ہے باباجی! کہ عرصہ نو سال سے ایک لڑکی میرے خاوند کے پیچھے پڑی ہے اور کسی طریقے سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میری شادی کو 11 سال کا عرصہ ہوا ہے۔ شادی کے بعد شوہر کہنے لگے کہ میرا اس لڑکی سے افیئر تھا' اب نہیں ہے۔ خیر' پہلے دو سال تک میرے خاوند نے میرا بہت خیال رکھا' محبت کی مگر پھر ان کا رویہ بدلنے لگا' گھر میں آتے تو بالکل خاموش رہتے۔ایک سال تک میرے خاوند نے مجھ سے کوئی بات نہ کی مگر میں نے سوچا کہ ان دنوں ہمارے مالی حالات بھی اچھے نہیں اس لیے وہ چپ ہیں لیکن پھر میرے علم میں یہ بات آئی کہ میرے خاوند نے اس لڑکی سے اپنے دفتر میں خفیہ نکاح کیا ہے جب ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ میں بہت مجبور تھا۔ اس نے میری جھولی میں قرآنِ پاک رکھا اور خودکشی کی کوشش بھی کی تو مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ برائے کرم کوئی ایسا تعویذ دیں کہ اس لڑکی کا دل میرے خاوند سے پھر جائے۔ موجودہ صورت میں زندگی میرے لیے گزارنا مشکل ہے۔ جب تک وہ ہماری زندگی میں ہے' ہم ایک دوسرے سے محبت اور اعتماد کا رشتہ نہیں رکھ سکتے۔یہ آزمائش بہت بڑی ہے۔ دُعا کریں کہ اللہ میرے لیے آسان کردے۔

☆بیٹی غوثیہ! تمہارے شوہر کا رویہ نہایت غلط ہے۔کوئی کسی کا پیچھا نہیں اٹھا سکتا جب تک وہ شخص خود نہ چاہے۔ بہرحال تم بہت باہمت اور اچھی بچی ہو۔ صبر اور مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ جس قدر ممکن ہو' یَا اَرحمُ الراحمین کا وِرد کیا کرو۔ ہر وقت باوضو رہو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ امبر۔جہلم۔

o محترم باباجی! میں یہ خط آپ کو بڑی بہن ماریہ کے کہنے پر لکھ رہی ہوں۔ وہ آج کل شدید بیمار ہے اور ہمارے گھر آئی ہوئی ہے۔ ڈاکٹرز اس کا مرض سمجھنے سے قاصر ہیں۔ باباجی! مہینہ بھر پہلے اچھی بھلی تھی' اچانک بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی طبیعت سنبھل گئی پھر یہ بے ہوشی کے دورے ہر تیسرے' چوتھے دن پڑنے لگے۔ مہینہ بھر پہلے اپنے بیٹے کے لیے دودھ بنا رہی تھی تو بے ہوش ہو کر کچن میں گر گئی' سر فرش سے ٹکرا کر پھٹ گیا' بس اس کے بعد سے وہ نہ چل سکتی ہے نہ بیٹھ سکتی ہے' سب سن سکتی ہے' سمجھ سکتی ہے' بس معذوروں کی طرح بستر پر پڑی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس چوٹ کے بعد اس کو بے ہوشی کے دورے نہیں پڑتے لیکن باباجی! صورتِ حال بہت تکلیف دہ ہے۔ وہ اپنے بچے کو جس حسرت سے دیکھتی ہے' دل کٹ جاتا ہے۔ ابھی تو سب دیکھ رہے ہیں مگر کب تک؟ میری بھی چھ مہینے بعد شادی ہے پھر کون بہن کو سنبھالے گا؟ سارے ٹیسٹ کلیئر ہیں۔ خدارا' باباجی! کچھ کیجیے۔

☆بیٹی امبر! اللہ یہ کڑا وقت خیر و عافیت کے ساتھ گزارے اور جلد بیٹی ماریہ کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ تمہارا تفصیلی خط پڑھا' حالات کا کچھ اندازہ ہوا۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ بہن کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ والدہ سے کہو بیٹی کے سرہانے بیٹھ کر ہر نماز کے بعد 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھیں اور دُعا کریں۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کریں اور بروزِ جمعہ گوشت کا صدقہ ضرور دیں بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے چیل' کووں کو کھلا دیا کریں۔ مجھے 15 دن بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ صفیہ۔اٹک۔

o باباجی! میں بہت مشکل سے آپ کا رسالہ خریدتی

# قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کماسکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہوں کیونکہ ہمارا گھر شہر سے کافی دور گاؤں میں ہے۔ کئی بار آپ کو خط لکھا مگر سوائے ایک بار کے جواب نہیں ملا۔ بابا جی! ہمارے گھر میں رزق کی بہت تنگی ہے۔ بابا اور بھائی بہت محنت کرتے ہیں مگر پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ ہم 8 افراد ہیں میرے والدین، بہن بھائی اور ہم تین بہنیں۔ گھر والے ہم بہنوں کے رشتوں کی وجہ سے بھی بہت پریشان رہتے ہیں۔ بابا جی! جہاں کھانے کو نہ ہو، وہاں شادی کیسے ہو؟ میں بہت امید سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے روزی کے دروازے کھل جائیں اور من پسند رشتے بھی آ ئیں۔

☆ بیٹی صفیہ! اللہ پر بھروسہ رکھو وہ سب کی سنتا ہے۔ دنیا میں آئے ہیں تو مسائل کا سامنا تو کرنا ہی ہو گا مگر ان مسائل سے کبھی مت گھبرانا بلکہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا کیونکہ ایسے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو۔ مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 700 بار پڑھو اور خوب دُعا کرو۔ روزانہ بعد نمازِ فجر چڑیوں کو دانہ اور پانی ضرور ڈالو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

☐ ممتاز۔ لاڑکانہ

o بابا جی! میں آپ کی خدمت میں پہلے بھی بہت دفعہ حاضر ہوئی ہوں۔ میں "سچی کہانیاں" میں آپ کا یہ کالم 1990ء سے پڑھ رہی ہوں۔ بابا جی! میری شادی میرے خالہ زاد سے ہوئی ہے، جس دن سے میری شادی ہوئی ہے پریشانیوں نے گھر کا رستہ دیکھ لیا۔ میرے دو بچے ہیں مگر میرے شوہر کا کوئی مستقل کام نہیں ہوتا۔ محنت بہت کرتے ہیں، ہر قسم کا کام کرتے ہیں، جو بھی کوئی بتائے مگر ہوتا ہوتا کام بگڑ جاتا ہے۔ کبھی گارمنٹس کا کرتے ہیں، کبھی کوئی اور مگر جب کام مکمل ہو جاتا ہے، پیسے ملنے ہوتے ہیں تو عین وقت پر بات بگڑ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی رکاوٹ ہے۔ ان کے تین بھائی اور ہیں، سب اچھا کماتے ہیں۔ ہمارے ہی حالات بہت خراب ہیں۔ سب بھائی اور اُن کے بچے ہم سے اور ہمارے بچوں سے برا سلوک کرتے ہیں۔ بچے بھی اب تو سوالات کرتے ہیں۔ دن رات اللہ سے دُعا کرتی ہوں۔ میرے شوہر تو رو رو کر اللہ سے دُعا کرتے ہیں۔ اب تو پتا نہیں کیا ہو گیا، نماز بھی پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اللہ کے کرم سے گزشتہ دنوں میرے شوہر کی ایک جگہ نوکری لگی ہے مگر تنخواہ اتنی کم ہے کہ آدھے مہینے میں ہی ختم ہو جاتی ہے پھر بڑی مشکل سے دن نکلتے ہیں۔ پلیز، بابا جی! آپ کوئی ایسا تعویذ دیں کہ یا تو میرے شوہر باہر چلے جائیں یا یہاں رہ کر اتنا کما لیں کہ عزت کے ساتھ رہ سکیں اور قرض بھی ادا ہو جائے۔ بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ میرے شوہر نوکری سے آ کر دوسرا کام کرتے ہیں مگر وہی کہ کوئی کام ہو کر نہیں ہوتا۔ آپ پلیز، بتائیں کہ کسی نے کچھ کروایا تو نہیں ہے؟ میرے شوہر بہت چڑچڑے ہو گئے ہیں، ہر وقت میرے اور بچوں پر غصہ کرتے ہیں۔ آپ جلد از جلد شمارے میں میرے مسئلے کا حل عنایت کریں۔ اللہ آپ کو اَجر دے گا۔ ہم نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا مگر سب ہمارا دل دکھاتے ہیں۔ ہمارے لیے خصوصی دُعا کریں۔ یہ بتائیں، کسی نے کچھ کروایا تو نہیں؟ کیونکہ میری شادی بڑی مخالفت کے بعد ہوئی تھی۔ جلد از جلد جواب دیں۔ آپ کی دُعاؤں کی طالب ہوں۔

☆ نمازِ عشاء کے بعد 300 بار سورۃ الناس پڑھو اور دُعا کرو۔ بیٹی! اللہ پر مکمل بھروسہ رکھو وہ ہم سے زیادہ ہمیں چاہتا ہے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

☐ انشاء۔ لاہور۔

☆ بیٹی انشاء! براہ راست جواب کے لیے جوابی لفافہ ضرور رکھا کرو اور اس پر اپنی تحریر میں پتا لکھا کرو تاکہ غلطی کا اندیشہ نہ ہو۔ تم اپنی والدہ سے کہو کہ نمازِ عصر اور نمازِ مغرب کے بعد ایک پیالی میں چینی لیں اور اس پر ہزار ہزار بار یَاوَدُودُ پڑھ کر دَم کریں اور یہ چینی گھر میں استعمال ہونے والی چینی میں ملا دیں۔ بچوں پر سے صدقہ ضرور نکالا کریں۔ یہ عمل لگاتار 14 دن کریں۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔

☐ فیصل۔ اسلام آباد۔

☆ بیٹے! اپنے بھائی کی تصویر اخبار میں شائع کروا

دوا اور ایدھی سینٹر، کراچی سے ضرور رابطہ کرو۔ یہاں سے تمہیں مثبت معلومات حاصل ہوں گی۔ والدہ سے کہو کہ بیٹے کا نام لے کر دُعا کیا کریں اور آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہا کریں۔ مجھے حالات سے مطلع رکھنا۔

□ مہک۔ کراچی۔

☆ بیٹی مہک! ضروری نہیں ہے کہ وظیفہ مکمل ہوتے ہی حاجت قبول ہو جائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے مگر یہ اٹل حقیقت ہے کہ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر ہی انجام پاتا ہے۔ تم وظیفہ دوبارہ کر سکتی ہو۔ بیٹے کو الجھ کر جواب مت دیا کرو اور بہت زیادہ جرح بھی مت کیا کرو۔ اس کو محبت اور نرمی سے احساس دلاؤ کہ وہ اب بڑا ہے اور اس کی بات کی اہمیت بھی ہے۔ نمازِ عصر کے بعد سورۃ انعام آیت 11 پڑھ کر تصور میں بیٹے پر دَم کر دیا کرو۔ مدت 90 دن ہے۔

□ فوزیہ۔ چکلالہ۔

☆ بیٹی فوزیہ! نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ دوبارہ کرو اور اس یقین کے ساتھ کرو کہ اللہ تعالیٰ ضرور کرم فرمائے گا۔ وظیفہ اگر مجبوری کے تحت کیا جائے تو نتائج بہت دیر میں حاصل ہوتے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو نوازتا ہے جو اس کو یاد کرتا ہے۔ سچے دل سے جو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں، وہ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔

□ فریدہ۔ میاں چنوں۔

☆ بیٹی فریدہ! اللہ تعالیٰ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ بیٹی! میں بات بہت واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے بے جا طوالت میں نہیں جاتا ہوں۔ تمہاری والدہ پر کوئی سایہ نہیں ہے۔ میں وظیفہ تحریر کر رہا ہوں۔ نہایت پابندی کے ساتھ کرو۔ رفتہ رفتہ سارے مسائل حل ہوں گے مگر نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد ایک ایک بار سورۃ مریم پڑھ کر حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ دُرود شریف چلتے پھرتے پڑھتی رہا کرو۔ والدہ سے کہو کہ وہ یَامَاجِدُ کا کثرت سے وِرد کیا کریں۔ مجھے 41 روز کے بعد مطلع کرو۔ بروز پیر گھر کے تمام افراد کے اوپر سے صدقہ ضرور نکال دیا کرو۔

# ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

## فرمان الٰہی

تمہارے پاس جو کوئی بھی نعمت ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تم لوگ اسی (اللہ) سے فریاد کرتے ہو۔ مگر جب اللہ اس تکلیف کو تم سے دور کر دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ جس کا حاصل یہ کہ وہ اس کی ناشکری کرتے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے۔ اچھا' چند روزہ (زندگی کے) مزے کرلو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ (النحل: 55-53)

## حدیث نبویؐ

حضرت جودانؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے بھائی سے (کسی غلطی پر) معذرت کی اور اس نے قبول نہ کی اس پر (ناجائز) ٹیکس وصول کرنے والے جتنا گناہ ہے۔'' (ابن ماجہ)

## توحید پر یقین

حضرت سعد بن ابراہیمؒ کہتے ہیں حضرت زنیرہؓ رومی باندی تھیں۔ وہ مسلمان ہوئیں تو ان کی بینائی جاتی رہی۔ اس پر مشرکوں نے کہا۔

''لات وعزیٰ ہمارے بتوں نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔''

حضرت زنیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا۔

''نہیں انہوں نے نہیں کیا۔ میں لات اور عزیٰ کے معبود ہونے کا انکار کرتی ہوں۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی واپس کر دی۔

مرسلہ: درثمن۔ کراچی

## خواتین کو عطا کیے گئے خاص حقوق

☆ عورت شوہر سے شرعاً' اخلاقاً اور قانوناً مہر پانے کی حقدار ہے۔

☆ عورت باپ سے' شوہر سے' اولاد سے اور بعض صورتوں میں دوسرے قریبی رشتے داروں سے وراثت پانے کی حق دار ہے۔

☆ شادی نکاح سے پہلے عورت کی رضامندی ضروری قرار دی گئی۔

☆ ناکارہ' ظالم اور ناپسندیدہ شوہر سے چھٹکارا پانے کے لیے عورت کو خلع کا حق دیا گیا۔

☆ ہر عورت کے لیے علم حاصل کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح مردوں کے لیے۔

☆ عورت کی عبادت کا اجر و ثواب مردوں کی عبادت کے اجر و ثواب کے برابر قرار دیا گیا۔ (یہ حقوق رسول آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عورتوں کو عطا کیے گئے)۔

مرسلہ: نورالعین۔ اسلام آباد

## سکندر اعظم

ایک دن سکندر اعظم کہیں جا رہا تھا۔ اس کے سپہ سالار نے کہا۔

''اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑی بادشاہت

عطا کی ہے۔ لہٰذا آپ بہت سی عورتوں سے شادی کیجیے تا کہ آپ کی اولاد زیادہ ہو اور آپ کے بعد اس سے آپ کا نام قائم رہے۔''
سکندر اعظم نے جواب دیا۔
''مردوں کا نام کہیں اولاد کی عزت سے باقی رہتا ہے؟ ان کا نام تو بس سیرت اور عدل سے ہی زندہ رہتا ہے پھر جو شخص دنیا کے کاموں پر غالب آ گیا۔ اچھا نہیں لگتا کہ اس پر عورتیں غالب آ جائیں۔'' (زرِ خالص از امام غزالی)
مرسلہ: فوزیہ شاہین عرفان۔ راولپنڈی

## دردِ نارسائی

کل تک جتنے بھی گلے تھے تم سے
آج سب آنسوؤں میں بہہ گئے ہیں
تم حیران نہ ہونا ہماری خوش فہمی پر
ہم نادان تھے جو تمہاری باتوں میں آ گئے ہیں
حرج کیا ہے جو چپکے سے نکل جائیں ہم
غلطی سے تیری محفل میں آ گئے ہیں
زندگی کی ہر ساعت تیرے نام سے جڑی تھی
اب تو دامن میں سوکھے پھول آ گئے ہیں
آتے آتے بہار نے بڑی دیر لگا دی
خزاں بہت طویل تھی سب باغ اجڑ گئے ہیں
اچھے دنوں کی نوید نہ دو ہم کو صائمہ
خوشیوں کے جتنے پل تھے سب کھو گئے ہیں
شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

## لفظ لفظ خوشبو

☆ امید ایک ایسی چھاؤں ہے جو اپنے دامن میں انسان کو پناہ دے کر مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔
☆ جب آپ کو اپنی شخصیت کے سوا کچھ نظر نہ آئے تو سمجھ جایئے کہ آپ خود پسندی کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔
☆ آنسو بہاؤ، یہ سوچ کر نہیں کہ ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں بلکہ یہ خیال کر کے کہ ہم اتنے گناہ گار ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک ہماری دعائیں نہیں پہنچ پاتیں۔
☆ اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بیکار ہے اور چراغ جلانے کا اصل وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے نہ کہ پچھلے پہر۔
☆ اگر زندگی میں کچھ بننا چاہتے ہو تو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔
☆ مانگنے والوں کو دینا اچھا ہے لیکن اس سے اچھا یہ ہے کہ حاجت مند کو پہچان کر بغیر مانگے اس کی حاجت پوری کر دی جائے۔
☆ انسانیت ایک بہت بڑا خزانہ ہے، اسے لباس میں نہیں انسان میں تلاش کرو۔
حسنِ انتخاب۔ شعبان کھوسہ، کوئٹہ

## چاہت

ہونٹ آپ کے ہوں، پیاس میری ہو
آنکھیں آپ کی ہوں آنسو میرے ہوں
دل آپ کا ہو، دھڑکن میری ہو
خدا کرے تیری اور میری دوستی اتنی گہری ہو
زندگی آپ کی ہو، موت میری ہو
شاعر: خضر حیات۔ روڈہ تھل، خوشاب

## والدین توجہ فرمائیں

☆ جس بچے کا مذاق اڑایا جاتا ہے وہ بزدل بن جاتا ہے۔
☆ جس بچے کو زیادہ تر مار پیٹ کا سامنا رہتا ہو اس کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔
☆ جس بچے پر اعتبار نہیں کیا جاتا، وہ دھوکا دینا سیکھتا ہے۔
☆ جس بچے پر زیادہ تنقید کی جائے، وہ کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے۔
☆ جس بچے کی کبھی تعریف نہیں کی جاتی، وہ اچھی چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔
حسنِ خیال۔ فرح عالم، اسلام آباد

## غزل

راستوں کی خبر نہیں ہے اب
یعنی باقی سفر نہیں ہے اب
ہم کو جلدی نہیں ہے جانے کی
اپنا تو کوئی گھر نہیں ہے اب
حق کا پرچم بلند کیا جس نے
اس کے کاندھے پہ سر نہیں ہے اب
کل جو پلکوں پہ بٹھا رکھتے تھے
ہم پہ اُن کی نظر نہیں ہے اب
مان جن پر سدا رہا ہم کو
ہائے کوئی ان پر فخر نہیں اب
سانس لینا محال ہے اور گل
زندگی مختصر نہیں ہے اب

سباس گل۔رحیم یار خان

## گارنٹی

ڈاکٹر صاحب کا ٹی وی خراب ہو گیا۔ انہوں نے اسے ٹھیک کرنے کے لیے ماہر کو بلایا۔ ٹی وی ٹھیک کرنے والے ماہر نے اپنی اجرت پانچسو روپے بتائی اور کہا جو پرزہ خراب ہو گا وہ آپ اپنے پیسوں سے منگوائیں گے۔
ڈاکٹر نے اس سے کہا۔ ''بھئی تم تو ہم سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل گئے ہو۔ میں تین مریضوں کے معائنے کے تین سو روپے لیتا ہوں۔''
ٹی وی ٹھیک کرنے والے ماہر نے جواب دیا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب مگر ہم میں اور آپ میں فرق یہ ہے کہ ہم گارنٹی بھی دیتے ہیں۔''

مقصود احمد بلوچ۔میاں چنوں

## سچا پیار

عامر: ''آج میرے دل کا آپریشن ہے۔''
رانی: ''پتا ہے مگر آپ ڈر کیوں رہے ہیں؟''
عامر: ''میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔''
رانی: ''میں بھی بہت پیار کرتی ہوں تم سے۔''
دوستو! جب عامر کا آپریشن ہو گیا تو اس کو ہوش آیا تو اس کے پاس اس کے امی ابو کھڑے تھے۔ عامر اونچی آواز سے بولا۔ ''وہ کہاں ہے۔'' تو عامر کا باپ بولا۔ ''تمہیں نہیں پتا تمہیں دل کس نے دیا ہے۔''
عامر: ''کیا کہا آپ نے......'' اور زور زور سے رونے لگا آخر اس کے دل سے آواز آئی۔
''رومت یار، رانی تیرے سینے میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔''

مرسلہ: یاسر وکی نظام۔دیپال پور

## محبت

محبت خاموش نگاہوں کی زبان ہے جب انسان کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ قدرتی عمل ہے کہ اس کا دکھ اپنا محسوس ہونے لگتا ہے۔ محبت کا لفظی مطلب کشش ہے اور یہ دنیا اسی کشش کی وجہ سے قائم ہے کیونکہ اگر زمین آسمان میں کشش نہ ہوتی تو یہ کبھی کے ختم ہو جاتے اس لیے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ محبت کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے۔

مرسلہ: مس نگینہ کنول نظام دین۔دیپال پور

## اک پلیٹ فارم پر

وہ جو لوگ رستوں پر
زندگی میں بس اِک بار، پاس سے گزرتے ہیں
اُن کے اجنبی چہرے کون سوچ سکتا ہے
ریل کے سفر میں سب، ہمسفر کہاں اُترے
کون یاد رکھتا ہے جھیل کے کنارے پر، لوگ جو یہ اترے تھے
وہ کہاں سے آئے تھے، کون جان سکتا ہے
اک پلیٹ فارم پر میں نے اس کو دیکھا تھا
صندلی بدن اس کا، خوش بوؤں سے ڈوبا تھا
وہ حسین تھی اتنی
اس کو دیکھتے ہی اِک، خواب جاگ اٹھتا تھا
یاد اب نہیں آتا
اک سوال جو اس نے، رک کے مجھ سے پوچھا تھا
آج بعد مدت کے
پھر پلیٹ فارم پر
ایک مضمحل چہرہ
اک دبیز عینک کے، بوجھ سے تھکا ہارا

جب مجھے نظر آیا، میں نے اُس کو بوجھا تھا
کون مان سکتا ہے؟
شاعر: دستگیر شہزاد۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

## کینڈل لائٹ ڈنر

میں نے جب اپنے دوست سے کہا۔ ''میں گزشتہ آٹھ دن سے مسلسل رات کے ٹائم کینڈل لائٹ ڈنر کررہا ہوں۔'' تو دوست حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''علوی! تم تو ہوٹل کا کھانا زیادہ پسند نہیں کرتے۔ تم کس طرح آٹھ راتوں سے مسلسل کینڈل لائٹ ڈنر کررہے ہو؟ اب تک تو تم ہزاروں روپے خرچ کرچکے ہوگے؟''

''نہیں میرے دوست!'' میں نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ آٹھ دنوں سے بجلی تیرہ چودہ گھنٹے روز بند ہورہی ہے۔ ہمارا یو پی ایس سارا دن شدید گرمی کی وجہ سے چلتا رہتا ہے۔ پنکھے چلانے کی وجہ سے تو اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ یو پی ایس بھی رات کو نو بجے کے آس پاس بالکل بند ہو جاتا ہے۔ تو پھر میرے عزیز دوست میں محلے کی دکان سے دس روپے کی دو عدد موم بتیاں خرید لاتا ہوں جو جلا کر میں اور سب گھر والے موم بتی کی روشنی میں 'کینڈل لائٹ ڈنر' کرتے ہیں...... اور دل ہی دل میں واپڈا کا شکریہ بھی ادا کرتے چلے جاتے ہیں کہ جس کی بدولت ہم سب گھر والے ہزاروں روپے خرچ بنا ہی صرف 10 روپے میں ہر رات کینڈل لائٹ ڈنر کا لطف اٹھاتے ہیں۔

زورِ قلم: غلام مرتضیٰ علوی۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

## افسانچہ

آ گئی ہو جلانے کو...... تڑپانے کو...... بہت جلدی تھی کیا...... حد کرتی ہو ابھی چند ماہ ہی سکون کے گزرے تھے کہ تم پھر آن موجود ہوئیں۔ جان فنا ہونے لگتی ہے تمہارا خیال آتے ہی۔ ہائے پانی...... مر گئے...... اب آ ہی گئی ہو تو جلد بوریا بستر باندھ لینا، جینا دشوار نہ کردینا۔ عذاب ہو پوری قسم سے۔

مگر ایک بات ہے جب رات میں چھت پر تاروں کو گھور گھور کر سویا کرتا ہوں تو کچھ کچھ اچھی لگتی ہو مگر جیسے ہی لائٹ جاتی ہے تو تمہارا وجود زہر سے برا لگتا ہے۔

معاف کردو خدارا! جان چھوڑ دو جینے دو نہ مارو مجھے اب سکون لینے دو۔

مجھے جینا ہے مگر تڑپ تڑپ کر نہیں...... مگر برداشت ہی کرنا ہے تمہیں اے ''گرمی'' کیا کریں مجبوری ہے۔

زورِ قلم: عظمیٰ شکور۔اسلام آباد

## ہمارے دادا جان

ایک آدمی بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک دکان پر ایک تصویر اسے بہت پسند آئی جو کسی بہادر سپاہی کی تھی۔

اس نے دکاندار سے قیمت پوچھی تو اس نے 500 روپے بتائی۔ اس آدمی کے پاس 450 روپے تھے لہٰذا وہ واپس چلا گیا۔

دوسرے دن وہ روپے لے کر آیا تو وہ تصویر فروخت ہوچکی تھی۔

ایک روز وہ اپنے دوست کے گھر پہنچا، تو دیکھا کہ وہ تصویر ہال میں آویزاں ہے۔ اس نے دوست سے پوچھا۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟''

دوست نے کہا۔ ''ہمارے دادا حضور کی ہے، وہ بڑی بڑی لڑائیوں میں حصہ لے چکے ہیں۔''

''50 روپے کم پڑ گئے تھے، ورنہ یہ آج ہمارے دادا جان ہوتے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔فیصل آباد

## ابو!

ابو آپ کی بہت یاد آتی ہے
ہر محفل میں اب تنہائی ہے
ابو مجھے آپ کے بغیر بہت ڈر لگتا ہے
ابو مجھے دیوار پر آپ کا سایہ نظر آتا ہے
پر آپ نظر نہیں آتے
ابو میرے پاس آؤ نا
جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو
آپ کا چہرہ نظر آتا ہے

جب آنکھیں کھولتا ہوں تو
آپ غائب ہو جاتے ہو
ابو آپ ایسا کیوں کرتے ہو؟
ابو اب میں آپ کی تصویر کے ساتھ
باتیں کرتا ہوں
ابو میں اب بہت ڈرتا ہوں

شاعر: ثناء اللہ ساگی۔ رحیم یار خان

## ذرا مسکرائیے

☆ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی تو چھوٹی بچی نے ریسور اٹھایا۔ کسی نے پوچھا۔ ''بیٹا آپ کے ابو سے بات ہو سکتی ہے۔''

بچی نے جواب دیا۔ ''نہیں وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔''

دوبارہ پوچھا گیا۔ ''بیٹا کوئی اور ہے جس سے میں بات کر سکوں۔''

بچی نے جواب دیا۔ ''ہاں میری بہن ہے۔''

اجنبی نے کہا۔ ''اچھا بیٹا اسے ہی بلا لو۔''

بچی فوراً بولی۔ ''معاف کیجیے گا انکل میں اسے جھولے میں سے نہیں اٹھا سکتی وہ بہت موٹی ہے۔''

☆

سردار جی ڈاکٹر سے۔ ''ڈاکٹر صاحب مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔''

ڈاکٹر۔ ''آپ لیٹ کر دو ہزار تک گنتی گنا کریں نیند آ جائے گی۔''

دو دن بعد سردار جی پھر آئے۔

ڈاکٹر۔ ''عمل کیا تھا۔''

سردار جی۔ ''جی ہاں کیا تھا۔ کام تو مشکل تھا ایک ہزار تک گنا تو نیند آنے لگی پھر تیز پتی والی چائے پی اور جاگ کر دو ہزار پورے کیے۔''

حسنِ انتخاب: نظر علی برمانی۔ دادو

## کاہلی

دفتر کے جنرل منیجر کی کاہلی مثالی تھی۔ ایک روز اچانک انہوں نے یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کہ بھئی میں تو آج جم جاؤں گا۔

ایک صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب آخر آپ کو ورزش کا خیال آ ہی گیا۔''

جنرل منیجر نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''ورزش کرنے کون کم بخت جا رہا ہے۔ مجھے تو اپنی ممبر شپ کینسل کروانے جانا ہے۔''

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

## ہری مرچیں

☆ بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''تم تو کہتے تھے کہ شادی کے بعد بھی مجھ سے پیار کرتے رہو گے۔''

''مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری شادی میرے ساتھ ہی ہو جائے گی۔'' شوہر نے سادگی سے جواب دیا۔

☆

☆ کسی نے شادی شدہ آدمی سے پوچھا۔

''آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟''

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ بولا۔ ''جو میرا دل کرتا تھا۔''

حسنِ انتخاب: کوثر اسلم، راولپنڈی

## تصدیق

پولیس نے ڈاکوؤں سے مقابلے کے بعد جنگل کا محاصرہ ختم کیا تو ڈی ایس پی صاحب نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''ہماری نفری تو پوری ہے نا؟''

انسپکٹر نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈی ایس پی صاحب پھر ذرا تشویش سے بولے۔

''تم نے اچھی طرح گنتی کر لی ہے نا؟''

''جی ہاں! میں نے خوب اچھی طرح گنتی کر لی ہے۔'' انسپکٹر نے پورے وثوق سے کہا۔

''شکر ہے۔'' ڈی ایس پی صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے میں نے جس بھاگتے ہوئے سائے کو گولیاں ماری تھیں وہ ڈاکو ہی تھا۔''

مرسلہ: عائمہ اشتیاق۔ مرید کے




قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

**انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔**

ریاض حسین تبسم چوہان......فیصل آباد

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کیوں کرتی

عطاءاللہ......مستونگ

نہ تھیں اور کوئی بھی رنجشیں
صرف عادتوں میں تضاد تھا
کہ اسے پسند تھیں شوخیاں
مجھے سادگی میں کمال تھا

رضوانہ کوثر......لاہور

مدت کے بعد اُس نے جو آواز دی مجھے
قدموں کی کیا بساط تھی، سانسیں بھی رک گئیں

عمر العطاس......کراچی

تُو تو رازق ہے تجھ سے کیا پردہ
کل سے بچوں نے کچھ نہیں کھایا

محمد طارق......کراچی

تہذیب کی مثال غریبوں کے گھر پہ ہے
آنچل پھٹا ہوا ہے مگر ان کے سر پہ ہے

شاعر عتیق......کراچی

مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے
ہے عشق مگر اتنا زیادہ بھی نہیں ہے
پتھر کی طرح سرد ہے کیوں آنکھ کسی کی
امجد جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

محبت خان......ابوظہبی

میں نے بصد خلوص بڑھایا تھا اپنا ہاتھ
لیکن وہ ہاتھ، ہاتھ میں آیا تو سرد تھا

صلاح الدین انصاری......ٹنڈو آدم

میری چاہتوں کا اب تک نہ اثر ہوا کسی پر
انہیں کچھ خبر نہیں ہے، یہاں زندگی مٹادی

سلیمان شبیر......اکوال تلہ گنگ

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

سلیمان......تلہ گنگ

بنا لیتا اپنی عادت سی جاوید
ان کے جھوٹے وعدوں پر اعتبار کرنا

یاسر وکی......دیپال پور

رونے سے اگر سنور جاتے حالات کسی کے
تو ہم سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہ ہوتا

افضال احمد......حویلیاں

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

منشی محمد عزیز مے......لنڈن

عمر بھر اگر ہم ساتھ جی لیں گے تو کیا ہوگا
پر ہاتھوں کی لکیروں میں وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

خواجہ حسین جاوید......منچن آباد

کچھ تو موقوف نگاہوں کی چمک پر ہوگا
ورنہ منظر تو سبھی کے لیے منظر ہوگا
ناتواں ایسے کہ جو شخص ہمیں قتل کرے
خون آلود نہ اس شخص کا خنجر ہوگا

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُم مریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

**محمد قاسم خان بلوچ....ٹوبہ ٹیک سنگھ**

کس مقام پر لے آئی وحشتِ خواہش
سکون ملنے لگا ہے مجھے اذیت سے
بچا کے رکھ مجھے خواہش کے بوجھ سے یارب
یہ زندگی بھی زیادہ نہ ہو ضرورت سے

**اسامہ بلال اعوان....لاہور**

وقت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ہوتی
انسان کے ہاتھ میں تقدیر نہیں ہوتی
پھر کیوں تیری آرزو میں جیے جارہے ہیں ہم
جب خواب کے مقدر میں تعبیر نہیں ہوتی

**تنویر فاطمہ....کراچی**

کوئی کتنا حسین ہو صاحب
نامکمل ضرور ہوتا ہے

**قاصد احمد....لاہور**

پہلے دیکھا ہوا نہیں ہوتا
کوئی منظر نیا نہیں ہوتا
کہہ رہا ہے یہ شہر خاموشاں
کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا

**عظمیٰ شکور....اسلام آباد**

کچھ یاد نہیں بازی الفت کا نتیجہ
تم جیت گئے تھے کہ ہمیں مات ہوئی تھی؟

**اظہر حبیب....کراچی**

میرا اپنا معیار ہے صاحب
تم حسین ہو تو بھاڑ میں جاؤ

**ایم افضل آزاد....ساہیوال**

کھلونے رکھ دیے میں نے
کہ دنیا کھیل لے مجھ سے

**محمد جواد انوار....اسلام آباد**

مرے ہم سفر، تجھے کیا خبر، ترے پیار میں تری چاہ میں
وہ کمیٹیاں جو خرچ ہوئیں، وہ قسم سے تھیں کسی اور کی

**زاہد کولاچی....گھوٹکی**

لگی جو چوٹ تو پہروں خیال آتا رہا
کہاں گئے تیرا صدقہ اتارنے والے

**یاسمین عمران....وزیرآباد**

کبھی ہمت تو کبھی حوصلے سے ہار گئے
ہم بدنصیب تھے جو ہر کسی سے ہار گئے
عجیب کھیل کا میدان ہے یہ دنیا بھی
کہ جس کو جیت چکے تھے اسی سے ہار گئے

**زبیر رانا....گوجرانوالہ**

دے گئے ایسا مجھے داغ فراق
آج میں بالکل اکیلا ہو گیا

**احمد کمال....کوئٹہ**

عجیب سا رشتہ رہا کچھ اس شخص سے
نہ نفرت کی وجہ ملی نہ محبت کا سبب ملا

**شعبان کھوسہ....اسلام آباد**

آپ کے بعد ہر گھڑی ہم نے
آپ کے ساتھ ہی گزاری ہے

**خضر حیات....روڈہ تھل**

اب تری آرزو کہاں مجھ کو
میں تری بات بھی نہیں کرتا

**دستگیر شہزاد....ٹوبہ ٹیک سنگھ**

کاش وہ آئے آزمانے کو
دل تڑپتا ہے تیر کھانے کو
عمر بھر جس کا انتظار کیا
وہ بھی آتا تو گھر جلانے کو

کوپن برائے

**تیرنیم کش**

جولائی 2017ء

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام:

پتا: